اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی اَدبی ماہوار رسالہ

# ہمایوں

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹرایٹ لا

جائینٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں۔ بی۔ اے

جلد ۱ — فہرست مضامین بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء — نمبر ۱

# نور جہاں کا شکار

ہمایوں کے موجودہ نمبر میں جو تصویر شایع ہو رہی ہے اسکی ہیئت مصورہ کو اگر جوں کا توں تسلیم نہ کیا جاوے تو اس کا الزام ہندوستان کے فن مصوری، اسکی معلومات اور ذوق نقد و نظر کے ذمہ ہے کارپردازان ہمایوں کا مقصد اس تصویر کی اشاعت سے صرف اتنا ہے کہ صنف لطیف کے متعلق نوعیت مباحث کو بدلا جائے۔ انکار اس سے ممکن ہے کہ اس تصویر کے نقوش مصورہ تاریخی شہادتوں سے محروم ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نفس مضمون ہی غلط ہے!

ا

"عورت کی دنیا" پر اس وقت تک جن لطیف احساسات کی بحث ہوئی ہے اور ادب اردو میں اس صنف کے متعلق بہتات کے ساتھ جس خاص قسم کے ذخیرۂ معلومات کا اضافہ ہوا ہے اسکا اثر یہ ہے کہ "عورت" ہمارے ذہنوں میں یکسر لوچ لچک اور اک جھجک ہے وہ صرف لجا جانے، ڈر جانے، روٹھ جانے اور جلد جلد بگڑ جانے، من جانیکے مترادف ہے وہ بتمامہ رنگ۔ ریشم۔ راحت کی خواہشوں کا خلاصہ اور شعلہ کا سا ارتعاش، زود رنجی کا اشتعال اور پارہ کا اضطراب ہے محنت جسمانی سے جی چرانے والی، محبت پر جان چھڑکنے والی اور مآل اندیشیوں سے بے پروا اک ہستی قرار دی گئی ہے اور صرف خلوت کی زینتیں اس سے وابستہ ہوسکی ہیں مرد کے متمرد انصاف نے اس جنس محترم کی شخصیت پر اگر بحث کی ہے تو زیادہ سے زیادہ کہ ناز۔ انداز۔ کرشمہ۔ عشوہ۔ غمزہ اور شوخی کا اس کو بدرجہ اتم مظہر قرار دیا ہے۔

یورپ کے علمائے نفسیات نے عزت نسوانی کے ادعاء کے ساتھ چند قدم آگے بڑھائے اور بزعم خود بڑی حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جمادات جنکے ٹھوس اور بوجھل جسم احساس حرکت سے محروم و معذور ہیں وہ بھی حسن نسوانی کی دعوۃ گداز پر اعتراف قبول کے سوا چارہ نہیں رکھتے اور عورت کا جمال انکے لئے بھی مؤثر ہے۔

فرانس۔ تاثیر حسن نسوانی کے کرشمے عالم نباتات میں دریافت کرتا ہے۔ ایسے باغیچے اور صحن باغ جنکی نگہداشت اور آبیاری حسین اور جمیل ہاتھوں کے سپرد رہی ہے اُن باغوں کی شادابی اور شگفتگی ہمیشہ ایسے باغوں سے افضل رہی ہے جنکو ضعیف اور معمر عورتوں نے سینچا ہے۔

تجویز ہو رہی ہے اور تجربے کئے جارہے ہیں کہ مجنوں۔ اختلال حواس کے مریض اور رمیدہ خود دیوانے


نورجہاں گرچہ بظاہر زن است
در صف مرداں زن شیر افگن است

شفایاب ہو سکتے ہیں اور اُن کا علاج عفت مآب دوشیزگان جمال کے جلوہ ہائے سادہ سے مختلف اوقات میں اُنکو دو چار کر دینا ہے بہت قوی اُمید کیجارہی ہے کہ اضطراب اور التہاب وش امراض میں طمانیت جلوہ اور سکون جمال سے خاطر خواہ اثر و فائدہ حاصل ہو گا۔

بہت ممکن ہے تحقیق جرائم میں ایسی پیچیدگیاں جو خفیہ ارتکاب عمل میں بسا اوقات دریافت حقیقت سے بالا رہتی ہیں یا بعض ایسے مجرم جو پکڑ لئے جانے پر بھی صحیح صحیح حالات کسی دھمکی اور تقریر کے خوف سے بھی نہیں بتلاتے، اُن میں حُسن محض کی کارفرمائیاں مشکلیں آسان کر دے۔ اس لئے کہ حُسن کمل و پاک کے حضور، افترا پردازیوں اور دروغ بافیوں کی پیری نہیں چلتی۔ کسی حسین لب کا یہ کہدینا کہ "بس سچ کہدو" ہزار تعزیر سے افضل ہے اور پھر مرد کو جرأت نہیں کہ اس سے جھوٹ بولا جا سکے۔ پس محکمۂ تفتیش جرائم کے سر رشتہ کے اعلےٰ درجے جس تر افراد نسوانی کے سپرد ہونے پر یہ قضایا مٹ جائینگے۔

المختصر جنس قوی نے عورت کی دنیاء کے بظاہر بیحد دلچسپ پہلو کو ابتک لیا ہے اور اُس پر روز روز نئے نئے انکشافات نفسی پیش کرتا رہا ہے۔ مگر آپ یاد فرمائیے یہ تمام مباحث بالکل سطحی اور بہت ہی معمولی حیثیت رکھتے ہیں ہمارا دعوےٰ ہے کہ آگے ابھی اور زمانہ، آہستہ آہستہ اس احساس پر مجبور ہو گا کہ

عورت یہی نہیں جو ابتک سمجھی گئی ہے بلکہ عورت ابھی
وہ کچھ باقی ہے جو تنہا مرد بھی نہیں ہے!

آپ بہک جانے اور سہم جانے کے عنوانات سے علیحدہ بھی تو کبھی کسی پیکر نسوانی کو سمجھنے کی کوشش فرمائیے دنیا نے اُسکی بیمثل استقامت اور لاجواب شجاعت پر توجہ ہی نہیں کی ہے۔

کسی فرد نسوانی کا بجز دشیر کا شکار آج بہت کچھ مستبعد ہے مگر اُس سے زیادہ اُسکی فطری شجاعت کا وہ پہلو ہے جبکہ وہ جنس قوی کے اک جذبۂ ناپاک اسکی خوئے درندگی و بہیمیت کا مقابلہ کرتی ہے حریف ہر چند کہ جثہ کی توانائی اور غیظ کا تہور رکھتا ہے۔ تملق کی کمند اور فریب کے ہتیار اُسکے پاس ہوتے ہیں اور جملہ سامان تحریص و تشویق سے آراستہ ہوتا ہے مگر یہ نحیف و زار ہستی بے چارگی وگریہ کی مورت یہ سادگی و معصومیت کا پتلا، یہی بہک جانے جھجک جانے کا مجسمہ ہے کہ اُسکے مقابلہ میں فتحمند ہوتا ہے۔ مجروح حریف تمام بھبکیاں ختم کر دیتا ہے لیکن یہ منفعل خلقت یہی ہیئت جلوہ ریز اُس وقت بلا کی جری۔ نڈر اور کوہ آتش فشاں ثابت ہوتی ہے!!

عورت کی فطرت اور تخلیق، نزاکت اور جمال کی ہی حامل نہیں ہے بلکہ اسکو عزم اور ارادے کی بھی ایسی

بلندیٔ دیعت ہوئی ہے جس کی مثال مردوں میں کمیاب ہے آج افسوس اسکا نہیں ہے کہ ہم میں کوئی نورجہاں پیدا نہیں ہوتی بلکہ ماتم اس کا ہے کہ اب فطرتِ نسوانی اُس نوع کی تربیت سے یکسر محروم ہے +

**۲**

کون جانتا تھا کہ میرزا غیاث وطن میں اپنی دولت وحشمت گنوا کے اپنی امارت و فراغت کھو کے ایسے تباہ حال اور پریشان جو ہندوستان کی طرف چلے ہیں توکل کیا ہو گا ؟

کسے خبر تھی بے سروسامان قافلہ میں جنگل کی ویرانی میں نحوست و مُصیبت کے اندھیرے میں تقدیر پڑی جگمگا رہی ہے ، کس کو علم تھا کہ لق ودق صحرا میں یہ نوزائیدہ اختر کل ہندوستان کے آسمانِ اقبال پر قمر چہاردہم بن کر دمکنے والا ہے مہر النساء کے نصیب کے شاہباز نے اپنی پہلی ہی پرواز میں ہند کی حکومت کی سنہری چڑیا شکار کی تھی ۔

تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کی کوئی سند نہ ہو مگر امکانِ وقوع پر کس قدر پیار آتا ہے کہ قدرت نے اس جمیل کھلونے کو رعنائی و ناز کے کن جلوؤں سے برق پارہ بنا دیا تھا وہ وقت جبکہ شہزادہ سلیم نے اپنے کبوتر اسکو امانت سونپے ہونگے ۔ اُن میں سے ایک اُڑ گیا ۔ اور جب شہزادہ نے آکر پوچھا ہمارا کبوتر کیا ہُوا ؟ تو اُس نے ڈر کر کہا ۔ شہزادۂ عالم ! "وہ تو اُڑ گیا" ——— ہائیں کیونکر ؟

دوسرے ہاتھ کی مٹھی کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور دوسرا کبوتر بھی اُڑ گیا اور کہا حضور ! یوں . . . . یہ سادگی اور بھول پن کی وہ ادا تھی جس نے سلیم کے دل کو پہلے شکار کیا ہو گا ۔

سلسلہ احوال کی دوسری کڑیوں کو چھوڑ دیجئے اور علی قلی کے ساتھ اسکے پیوند کے فسانے سے گذر جائیے ۔ مگر جب بردوان میں قطب الدین کوکہ حاکم بنگال کے ہاتھوں علی قلی کے نام فرمان جہانگیری پہنچا اور علی قلی اپنی گستاخی و بدعنوانی سے قطب الدین کوکہ کے ہمراہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو مہر النساء اسکی بچی سرکاری مجرم اور تاج کے باغی لوگوں کی حیثیت سے دہلی بھیجوا گئے تو اسکا کیا حال ہُوا ہو گا ۔ چار برس تک قلعہ کی اندر مختصر سی چاردیواری میں قید رہیں اور چودہ آنہ روز مصارف کیلئے تھے اور دو خواصیں خدمت کیلئے تھیں اور بس :

آخر تنہائی کی بیکسی اور عتاب کی سزا سے تنگ آکر اس نے خود اپنے ہاتھ سے جہانگیر کے حضور میں اک عرضی گذرانی جس میں اقبال کی ہنرمندیوں نے جلوہ چھڑکا اور عبارت کے انداز اسلوب کے کرشموں طرز ادا کے جادوؤں اور اظہار حال کی سحر آفرینیوں نے بگڑی بازی بنادی ۔ سلیم جو جہانگیر ہو چکا تھا اُسکا دل احساس کے نشتر سے زخمی ہو گیا اور آخر ش یہ وہی مہر النسا تھی جو نورجہاں بیگم بنی ۔ مجرمانہ حیثیت سے بردوان سے آئی اور آقایانہ انداز سے عزت کی وارث ہوئی جو تاج

کے باغی کنبے کی طرح آئی اور تخت و تاج پر جلوہ فرما ہوئی اور اسکے کنبے نے حکومتیں کیں۔ جسکے ہاتھ دولت و مال تو کیا سیدھی اُلٹی تدبیر سے بھی عاجز تھے اُنہیں ہاتھوں میں جہانگیر نے ہندوستان کی عنانِ حکومت سونپی اور کہا "من سلطنت رابہ نورجہاں بیگم ارزاں داشتم و بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت مرا ہیچ نمی باید" ۔ (از توزک)

یہ تھا شکار جو نورجہاں نے حقیقت کیا۔

پھر یہ تمام داستان تھی اُس فردِ پیشہ رعنائی و اقبال کی خلوت کی۔ جسکے جمال صورت اور حُسن سیرت نے تاریخ میں اک بیمثل اثر چھوڑا ہے اب غالباً تصویر کے متعلق صحیح طور پر اُس حوصلہ کی بھی کچھ تفصیل چاہیئے جس سے اُسکا شیر کا شکار کرنا معلوم ہو سکے۔

متھرا میں جہانگیر اک مرتبہ کسی درویش کی زیارت کو گیا اور زیارت سے مشرف ہو کر اپنے خیمہ میں متمکن تھا کہ علم بردار ول نے خبر دی کہ قریب کے جنگل میں شیر ہے۔ جہانگیر بہت للچایا مگر شکار کا عہد کر چکا تھا خاموش ہو رہا اور نورجہاں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں شکار کر لاؤں چونکہ نورجہاں بیگم کو شیر کے شکار کا بہت اشتیاق تھا اصرار کیا اور جہانگیر نے اجازت دیدی، پہلے تجویز نورجہاں کی یہ تھی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار سے شکار کھیلے مگر جہانگیر نے تجویز کیا نہیں ہاتھی پر سوار ہو کر بندوق سے شکار کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہمراہیوں میں اک شخص میرزا رستم نامی نہایت عمدہ قدر انداز تھا اک ہاتھی پر نورجہاں اور دوسرے پر جہانگیر اور میرزا رستم سوار ہوئے جس ہاتھی پر نورجہاں تھی وہ شیر کے شکار کیلئے سدھا ہوا نہ تھا شیر کی بُو پا کر بہت پریشان اور بے چین ہو رہا تھا۔

غرض شیر جھاڑی سے جھپٹا اور نہایت خونخواری کے ساتھ گرجتا ہوا نکلا جہانگیر کے حُکم سے میرزا رستم نے بندوق ماری انکا ہاتھی بھی قرار نہ لیتا تھا نشانہ خطا ہوا۔ دوسری چلائی بیکار گئی تیسری گولی سر کی وہ بھی جھوٹی ہوئی تب نورجہاں نے آواز دی بس میرزا اب تم خاموش ہو جاؤ مجھے اپنی قسمت آزمانے دو، یہ کہکر نورجہاں نے شیر کو للکارا اور مہاوت سے کہا ہاتھی کو آگے بڑھا دو۔ مہاوت نے ہاتھی کی آنکھوں میں آنکس ڈال کر آگے بڑھایا اُدھر شیر گرجتا ہوا قریب پہنچگیا اور قریب تھا اک ہی جست میں نورجہاں پر آ پڑے کہ نورجہاں نے نہایت سچی ٹیپ کی گولی ٹھیک لگی اور شیر کئی فٹ پلٹ کے اُدھر جا پڑا اور اک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ فلک گفت احسن و ملک گفت زہ، اس نشانہ و قدر اندازی کا تذکرہ جہانگیر خود توزک میں لکھتا ہے کہ

بنورجہان بیگم فرمودم کہ بہ بندوق بیندازید بانکہ فیل از بوئے شیر قرار داد نمیگرد و پیوستہ در حرکت است و از بالائے عماری تفنگ بیخطا انداختن کاریست عظیم مشکل چنانچہ میرزا رستم کہ در فنِ بندوق اندازی بعد از من دوئی نیست مکرر چناں شدہ کہ سہ تفنگ و چہار تفنگ از بالائے فیل خطا کردہ۔ نورجہان بیگم اوّل چناں زد کہ بہ ہماں زخم تمام شد۔ (توزک)

خلیقی دہلوی

# بیداری

جان فیلڈ کاشتکار نے جبکہ وہ اپنے لڑکے مارشل کو ایک خریدار کی گفتگو میں مصروف دیکھ رہا تھا۔ ڈیوس سے سوال کیا کہ اب اس کی کیا حالت ہے، ڈیکن ڈیوس نے ایک سیب الماری سے نکال کر مارشل کے باپ کو تحفتہً پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"جان ہم تم بہت پرانے دوست ہیں، اور میں ہرگز تمہارے احساسات کو صدمہ پہنچانا نہیں چاہتا مگر کیا کروں کہ میرے نزدیک اپنے کسی فائدے کے لئے حقیقت کی پردہ داری کرنا بھی جائز نہیں، مارشل ایک نہایت عمدہ اور محنتی لڑکا ہے، لیکن اگر وہ میرے کارخانے میں ایک ہزار برس تک بھی کام کرتا رہے تو یقین کیجئے کہ وہ ہرگز ایک کامیاب سوداگر نہیں بن سکتا، اس لئے کہ قدرت نے اُسے تجارت کرنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا ہے، آپ اُسے دیہات واپس لیجائیے اور یہ سکھائیے کہ دودھ کس طرح دوہا جاتا ہے،" اگر مارشل فیلڈ، ڈیکن ڈیوس کے کارخانے میں جو "پٹس فیلڈ" ماسچوسٹس میں واقع تھا اور جہاں اس نے پہلی مرتبہ ملازمت کی تھی اگر اپنی اسی محرری کی حیثیت پر قانع ہوجاتا تو یہ کبھی بھی دنیا میں ایک کامیاب تاجر نہ بن سکتا تھا مگر جب وہ اسے چھوڑ کر شکیگو پہنچا اور وہاں اس نے غریب لڑکوں کی اُن حیرت انگیز مثالوں کو دیکھا جو شاہراہ کامیابی پر گامزن تھے تو اسکی ہمت بلند اور اسکے ارادے مشتعل ہو گئے، اور اس نے خود بھی ایک کامیاب تاجر بننے کا مصمم ارادہ کرلیا، اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ اگر دوسرے لوگ ایسے حیرت انگیز کام انجام دے سکتے ہیں تو کونسی وجہ ہے کہ میں نہیں دے سکتا،

حقیقت میں شروع ہی سے فیلڈ میں ایک کامیاب تاجر بننے کی صلاحیت موجود تھی مگر اُسکی ان خوابیدہ قوتوں اُکسانے اور پوشیدہ طاقتوں کو باکار کرنے میں گردوپیش کے حالات اور باہمت ماحول کا بھی بہت بڑا حصّہ شریک تھا، البتہ یہ ضرور مشکوک ہے کہ وہ شکیگو کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی اتنی سرعت کے ساتھ ترقی کرسکتا تھا یا نہیں۔

۱۸۵۰ء میں جب نوعمر فیلڈ شکیگو پہنچا تو شہر کی ترقی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اُس وقت اُس کی آبادی پچاس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی، جو محض امریکہ کی ایک معمولی تجارتی منڈی خیال کیجاتی تھی، لیکن اس

نے جس حیرت انگیز طریقے سے ترقی کی اور اس کا حلقہ جس تیزی کے ساتھ وسیع ہوتا چلا گیا وہ یہاں کے باشندوں کی اُمید وخیال سے کہیں زیادہ تھا، گویا ترقی وکامیابی اسکی ہوا کا جز و ہوگئی تھی اور ہر شخص اسے اپنی ترقیوں کا گھوارہ سمجھ رہا تھا،

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ الوالعزمی ایک وہبی خصوصیت ہے جو ترقی کے اثرات قبول نہیں کرتی یعنی یہ ہمارے اندر ایک ایسا لطیف جوہر ہے جو اپنی حفاظت آپ کرتا ہے مگر ساتھ ہی یہ ایک ایسا جذبہ بھی ہے جسے ہمیشہ نگہداشت کی ضرورت ہے اور جو بغیر دائمی تہذیب وتعلیم کے بہت جلد فن موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کی طرح بالکل بیکار ومعطل ہوجاتا ہے۔

اگر ہم اپنے ارادوں کی طاقتوں کا احساس چھوڑ دیں تو پھر ان میں وہ تیزی اور مفید صلاحیت باقی نہ رہیگی، اس لئے کہ اگر قوتوں سے کام نہ لیا جائے اور انکی تہذیب نہ کیجائے تو یہ زنگ آلود ہو کر بہت جلد اپنی خصوصیتوں کو ضائع کردیتی ہیں، چنانچہ ہم کبھی بیکاری وسستی میں اپنے ارادوں اور کام کی امنگوں کو تازہ وقائم نہیں رکھ سکتے اگر ہم مواقعات کو نکلجانے دیں اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں تو ہماری ترقیوں کے ولولے رفتہ رفتہ بالکل سست وکمزور ہوجائینگے۔

ایمرسن کا قول ہے کہ " مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو مجھ سے ایسے کام لے جنکے کرنے کی میں اہلیت رکھتا ہوں، میرا اصول یہ ہے کہ میں خود کیا کرسکتا ہوں یہ نہیں کہ نپولین یا لنکون نے کیا کیا اور کیا کرسکتے ہیں، اگر میں اپنی عمدہ سے عمدہ یا خراب سے خراب طاقتوں کو عمل میں لاؤں تو یقیناً اس سے میرے لئے دُنیا میں زمین وآسمان کا فرق ہوسکتا ہے "

ہر طرف ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کی زندگی کا نصف یا اس سے زیادہ حصہ بغیر کسی ترقی وبیداری کے گزرچکا ہے، اور وہ اس قیمتی وقت میں بہت ہی تھوڑی ترقی حاصل کرسکے ہیں، اُنکی اعلےٰ صفات اس طرح گہرائی میں پڑی ہوئی ہیں جیسے وہ بیداری کے لئے پیدا ہی نہیں کی گئیں۔

جب ہم ایسے لوگوں سے ملتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں پوشیدہ طاقتوں کا ایسا حصہ موجود ہے جو کبھی استعمال نہیں کیا گیا اور وہ غریب اس سے بے خبر ہیں کہ اُن کی کیسی مفید اور کامیاب طاقتیں ضائع ہورہی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ اخباروں میں ایک ایسی لڑکی کے حالات شائع ہوئے تھے جس کی عمر پندرہ سال

کی تھی مگر اُس کی دماغی ترقیاں ایک چھوٹے بچے سے کسی طرح زیادہ نہ تھیں اور نہ اُسے کوئی دلچسپ چیز اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی، دن کا اکثر حصہ اُسے خیالی پلاؤ پکانے میں گزر جاتا وہ ہمیشہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہا کرتی گویا اُسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں، مگر ایک روز سڑک پر دستی ارگن کی آواز سُن کر دفعتاً چونک پڑی اور اُس کے تمام حواس بیدار ہو گئے، اُس نے بیکاری کے اس زمانے کو بہت جلد عبور کر کے چند دنوں میں ترقی کی منزلیں طے کر لیں یعنی بچپن کے زمانے کو صرف ایک ہی دن میں چھوڑ کر نوجوان دوشیزہ لڑکیوں میں شامل ہو گئی۔

اسی طرح ہم میں سے اکثر لوگ بہت سی پوشیدہ طاقتوں کے مالک ہیں، مگر اُن پر اس لڑکی کی طرح غفلت سی چھائی ہوئی ہے، اگر اُنکی طاقتیں بیدار کر دی جائیں تو یقیناً وہ ایک کامیاب انسان کی طرح حیرت انگیز کام انجام دے سکتے ہیں۔

مغرب کے ایک آباد و خوشحال شہر کی میونسپل کچہری کا جج جو اپنے صوبے کا ایک ہردلعزیز ہے، اُسکی پوشیدہ قوتیں نصف عمر کے بعد بیدار ہوئیں اسکے قبل وہ ایک جاہل لوہار تھا، اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس کی ہے اور وہ اپنے شہر کے ایک سب سے بڑے کتب خانے کا مالک ہے، اور اس کے متعلق مشہور ہے کہ جس نے سب سے عمدہ اس کتب خانے کا مطالعہ کیا ہے وہ خود اسکی ذات ہے۔

دوسروں کی مدد کرنا یہ اپنا فرض سمجھتا ہے اُسکی زندگی میں یہ تمام انقلاب "تعلیم کے فوائد" پر ایک لکچر سننے کے بعد پیدا ہوئے، جس نے اسکی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے مشتعل کر دیا اور وہ ایک اولوالعزم انسان کی طرح شاہراہ ترقی پر چلنے لگا،

میں ایسے بہت سے لوگوں سے واقف ہوں جنھوں نے اپنی نصف عمر تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی ممکن توقعات کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور مدت کے بعد وہ کسی ہمت افزا و جرأت انگیز کتاب کو پڑھ کر کوئی وعظ یا لکچر سُننے کے بعد یا کسی اعلےٰ وارفع مقاصد رکھنے والے باہمت و راسخ الاعتقاد شخص سے مل کر بیدار ہوئے ہیں،

اگر تم ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہو جو تمہاری قابلیت کے معترف اور دل سے تمہاری تعریف کرتے ہوں تو تمہیں اس وقت اپنے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا جب تم بخلاف اسکے ایسے لوگوں میں ہو جو تمہاری تعریف و ہمت افزائی کے بجائے تمہاری ناکامی و نامرادی میں خوشی

محسوس کرتے ہوں،

نیویارک کے بچوں کی کچہری کا ایک عارضی افسر اعلیٰ اپنی رپورٹ ۱۹۰۵ء میں لکھتا ہے کہ کسی لڑکے یا لڑکی کو بری صحبت سے بچانا اسکی اصلاح کی پہلی منزل ہے۔

نیویارک کی ایک انجمن جو بچوں کو مظالم سے محفوظ رکھنے کے لئے قائم ہے اپنی تیس سال کی تحقیق تفتیش کے بعد جس میں اُس نے پانچ لاکھ سے زیادہ بچوں کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ماحول کا اثر نسل و پیدائش کے اثر سے زیادہ قوی ہے۔

ہم سے قوی سے قوی خیالات رکھنے والا شخص بھی ماحول کے اثرات سے باہر نہیں ہے ہماری فطرت خواہ کسی قدر آزاد، مستقل اور غیر متزلزل کیوں نہ ہو مگر وہ گرد و پیش کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، کیسا ہی خوش قسمت نوزائیدہ بچہ جسے تمام آسانیوں کے ساتھ ہی قدرت نے مہذب والدین بھی دئے ہوں اگر اُسکی پرورش وحشی و خونخوار ماحول میں کیجائے تو یقیناً وہ بڑا ہو کر ظالم سفاک اور غیر مہذب انسان ہوگا، جس کی مثال ذیل کے قصّے سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

ایک صغیر سن بچہ جو کسی طرح لاپتہ ہو گیا تھا یا تجربے کے لئے قصداً چھوڑ دیا گیا تھا اُسے ایک بھیڑئیے نے اپنے بچوں کے ساتھ دودھ پلا کر پرورش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اس انسانی بچے کی تمام عادات و خصوصیات جانوروں کی سی ہو گئیں یعنی اُسکا چلنا، کھانا اور غرّانا بالکل ایک بھیڑئیے کے مشابہ تھا۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنی زندگی بسر کرنیکا کوئی خاص طریقہ مقرر کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی قدرتی طور پر ہم اپنے گرد و پیش کی مثالوں پر کاربند ہوتے ہیں اور جیسا کہ قاعدہ ہے اُسکے سب سے زیادہ طاقتور سیلاب کے تحت ترقی یا تنزلی کرتے رہتے ہیں، ایک شاعر کا قول ہے کہ "مجھے جن اثرات نے متاثر کیا ہے میں اُن کا ایک جزو ہوں" اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ محض تخیّل کی ایک شاعرانہ پرداز ہی نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے ہر چیز یعنی ہر لفظ یا لکچر یا گفتگو جسے تم نے سُنا ہے اور جس نے تمہاری زندگی کو متاثر کیا ہے یا تمہاری فطرت اور طبیعت پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے اس تجربے کے بعد یقیناً تم کبھی وہ پہلے انسان نہیں رہ سکتے بلکہ تم میں ضرور ایک فرق ہو جائیگا خواہ وہ خفیف ہی کیوں نہ ہو، جس طرح بیچر اسکن پڑھنے کے بعد پہلا انسان نہ تھا، یعنی اسکے پڑھنے سے اس میں بہت

سی خوبیاں آگئی تھیں جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں،

چند سال کا عرصہ ہُوا کہ ایک روسی جہاز ساز کارخانے نے روسی کاریگروں کی ایک جماعت امریکہ اس غرض سے بھیجی تھی کہ وہ امریکن طریقہ کار سے واقف ہونے کے علاوہ امریکی اسپرٹ اپنے اندر پیدا کرلیں، چنانچہ چھ مہینے کے عرصے میں یہ روسی اُن امریکن کاریگروں کے دوش بدوش ہو گئے جن کے ساتھ مل کر وہ کام کیا کرتے تھے انہوں نے اپنے اندر خودداری، ذاتی جوش اور کام میں ایک خاص حد تک قابل لحاظ خوبی پیدا کرلی تھی، مگر اپنے وطن واپس آنے کے ایکسال بعد ہی وہاں کی سُست پژمردہ ہُوا ان میں دوبارہ سرایت کرگئی اور ترقی کے سارے دلولوں پر اوس پڑ گئی اور یہ ویسے ہی معمولی مزدور رہ گئے۔ جن کی نظر آج کے کام سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔

غرضیکہ یہ ہمت افزا آب و ہوا میں نشوونما پائی ہُوئی اولوالعزمی پھر اسی سُستی و اضمحلال کے ندر ہو گئی۔

ہمارے ہندوستانی، (امریکہ کے اصلی باشندوں) کے اسکول اکثر اخباروں میں اپنے لڑکوں کی ابتدائی اور انتہائی زمانے کی تصاویر بالمشافہ شائع کراتے ہیں، اس میں ایک تصویر اُس وقت کی ہوتی ہے جب لڑکا اسکول میں داخل ہُوا تھا، اور ایک اس موجودہ حالت کی جبکہ وہ فاضل ہوکر کالج چھوڑتا ہے اور جس کے عمدہ لباس و ذہانت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی آنکھوں میں اولوالعزمی کا شعلہ بھڑک رہا ہے، ہم انہیں اس حالت میں دیکھ کر انکے مستقبل کے متعلق بڑی بڑی امید افزا پیشنگوئیاں کرتے ہیں لیکن اُن میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے وطن واپس جا کر زندگی کا کوئی اعلےٰ معیار مقرر کرنے کی بجائے تھوڑے ہی دنوں کی جدوجہد کے بعد پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے اُسی سابقہ طریقۂ زندگی کو اختیار کرلیتے ہیں، مگر ان میں بہت سے لوگ مستثنیٰ بھی ہیں، اور وہ وہی ہیں جن کے کیرکٹر، اور طبائع اپنے گردوپیش کے تباہ کن اثرات پر فتح پانے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اگر تم کسی ناکام فوج سے ملو تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ ان میں بہت سے لوگ اس لئے ناکام رہے کہ اُنہیں کبھی ہمت افزا، اور جرأت انگیز ماحول نصیب نہیں ہُوا اور اُنکی بلند ہمتی کا وہ جوہر جو اُن میں پوشیدہ تھا کام میں نہ لانے سے ضائع ہو گیا +

آج جن کو ہم قید خانوں اور خیرات خانوں میں دیکھتے ہیں اُن میں سے اکثر اسی افسوسناک ماحول کا

آخری نتیجہ ہیں، جس نے ان میں عمدہ اخلاق و فضائل پیدا کرنے کی بجائے انہیں بری عادتوں کا خوگر بنا دیا

تمہیں زندگی میں کچھ میسر ہو یا نہ ہو مگر ایک اولوالعزمی پیدا کرنے والا ماحول یقیناً تمہیں ترقی کی طرف لے جائیگا،

تم ہمیشہ ایسے لوگوں سے ملتے رہو جو تم سے پورے طور پر واقف اور تمہاری قابلیت کے معترف ہوں کیونکہ وہ تمہاری خوابیدہ قوتوں کو بہتر سے بہتر صورت میں عمل پیرا کرنیکے لئے تمہاری ہمت افزائی کرینگے، اسکے علاوہ تم ایسے ہی لوگوں سے اپنے تعلقات قائم رکھو جو اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ ترقی کرنے کے خواہشمند ہوں اور دنیا میں اپنی زندگی کا بھی کوئی درجہ قائم کرنا چاہتے ہوں بلند حوصلہ اور اعلیٰ مقصد پیش نظر رکھنے والے، متین، سنجیدہ، اولوالعزم اور مستعد لوگوں کی صحبت کامیابی کا راز ہے، کیونکہ تم بھی اُسی اسپرٹ سے متاثر ہوگے جو تمہاری آب و ہوا میں حکمراں ہے۔

اُن لوگوں کی کامیابی جو تمہارے گرد و پیش ہیں اور جو ترقی کے زینوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمہارے جذبات کو بھی اُبھار کر تمہاری ہمت افزائی کریگی تاکہ تم اور زیادہ مستعدی کے ساتھ جدوجہد کر سکو،

ایسے لوگوں کی صحبت جن کے ارادے اور مقاصد بلند ہوتے ہیں یقیناً دوسروں کی ہمت افزائی اور حوصلوں کی بالیدگی کا عمدہ ذریعہ ہے،

اگر تم کو عملی قوت کی ضرورت ہے یا اگر تم قدرتاً کاہل اور آرام پسند واقع ہوئے ہو تو اولوالعزم لوگوں کی صحبت میں رہو اُنکی بلند ہمتی اور سخت جدوجہد تمہیں آگے بڑھنے پر مجبور کر دیگی۔

(ترجمہ) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

---

# کلامِ گرامی

موجِ پرواز پرِ کاہ بجائے نرسد
کہ بذوقِ کششِ کاہربائے نرسد

مشکل آں نیست کہ در دیست بجانم مضمر
مشکل آنست کہ دردم بدوائے نرسد

ناقۂ لیلیٰ بیدرد ز چشمِ مجنوں
آں چناں رفت کہ آواز درائے نرسد

نالہ سر کردم و کارے نکشاید چہ کنم
شاہ را گوشۂ چشمے بگدائے نرسد

بود ناگفتنی آں نکتہ کہ منصور بگفت
آنکہ در خود نرسیدست بجائے نرسد

دست من در کمر ماہ رسد - میرسدش
نرسد آہ بآں بند قبائے نرسد

رہ غلط کردم و افتاد گرہ در کارم
مرد راہے نرسد عقدہ کشائے نرسد

ہاں دہاں تیر نگاہے بجگر تا نخوری
نالہ کارے نکند آہ بجائے نرسد

اینہمہ فتنۂ برگشتگی بخت منست
کہ در آغوش اثر دست دعائے نرسد

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تغافل نہ نظر
پائے مورے نرسد بال ہمائے نرسد

آہ از دوست حدیثے بہ گرامی نرسید
آہ از گلشن امید صبائے نرسد

گرامی

# سروجنی نیڈو

مترجمہ مولانا شیرازی شادانی رامپوری بی۔اے

## بلبلِ ہند

ہندوستان بھر کے انگریزی نظم لکھنے والوں میں تورودت۔ سروجنی نائیڈو اور رابندرو ناتھ ٹیگور کے نام سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں وطن پرست شاعروں کا کلام اپنے اپنے ملک کی جداگانہ معاشرت کی وجہ سے نوعیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے ؛

تورودت کی تصانیف شیرینی اور لطافت سے پُر ہیں۔ مگر ہندوستان کے ادبی مذاق رکھنے والے اُن سے بہت کم واقف ہیں۔ تورودت ایک ممتاز ادبی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی طرح ان کا کلام بھی نہ صرف بھلادیا گیا بلکہ ناپید ہے۔ اُن کی شاعری خوش مذاقی کے ساتھ ان کی تنہا نشینئ شباب اور ذہانت پر بھی کافی روشنی ڈالتی ہے جو مصنفہ کی مختصر اور المناک زندگی کے انتہائی دردانگیز حالات کا نتیجہ ہے۔

برخلاف اس کے رابندرو ناتھ ٹیگور کی تصانیف مشرقی مہاتماؤں کے تصوف سے لبریز ہیں اور آپ ہی اپنی نظیر۔ رابندرا ناتھ کا کوئی مقابل نہیں۔ صرف وہی ہندوستان کا شاعر ہے۔ ورڈس ورتھ نے جو کچھ ملٹن کے متعلق کہا ہے وہی ہو بہو ان پر صادق آتا ہے۔ "اُنکی رُوح ایک ستارے کی مانند ہے جو سب سے علیحدہ چمکتا ہے۔ اُنکی آواز آسمان جیسے شفاف سمندر کی طرح صاف۔ آزاد اور پر شکوہ ہے وہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جو خدا شناسی کی مسرت میں زندگی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اُس کی پُرسکون سنجیدہ اور مطمئن روح جوشیلی ترنم ریزیوں اور ملہمہ کا مرکز ہے۔ ذات باری تعالیٰ سے وابستہ اور نعمات جنت سے بہرہ اندوز ہے۔

مسز نائیڈو اگرچہ تورودت کی طرح دلگداز ٹیگور کی طرح صوفی منش نہیں مگر انکی تصانیف میں کچھ ایسا جادو ہے جس نے بہت سے ناظرین خصوصاً اہل مغرب کو اس قدر مسحور کر لیا ہے کہ وہ ان کے پڑھنے پر مجبور ہیں،

سروجنی نائیڈو ۱۸۷۹ء میں ایک قدیمی برہمن خاندان میں پیدا ہوئیں جو تمام مشرقی بنگال میں سنسکرت علم ادب کی سرپرستی کے لئے مشہور چلا آرہا ہے۔ مذاقِ سخن اپنے باپ ڈاکٹر رگھوناتھ چتو پادھیا سے حاصل کیا جو ایڈنبرا یونیورسٹی کے نامور ڈاکٹر تھے۔ مسز نائیڈو ایک ایسے بڑے خاندان کی اولاد اکبر تھیں جس کے ہر فرد نے اوائل عمر ہی میں انگریزی تعلیم پائی تھی۔ اُنہیں کے بقول اُنکی طبیعت بہت ضدی واقع ہوئی تھی اور انگریزی بولنے سے گریز کرتی تھیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں" ایک روز جب میں نو برس کی تھی میرے باپ نے مجھے دن بھر بطور سزا کے ایک تنہا کمرے میں بند رکھا میرے لئے یہ پہلی سزا تھی، میں کمرہ سے کامل زباندان ہو کر نکلی"

ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات اگرچہ ایک معمولی شخص کی زندگی میں کوئی خاص اور قابلِ لحاظ اثر پیدا کئے بغیر رونما ہوتے ہیں مگر ایک شخص نادرہ کار کی (جس کی استعداد ذاتی اور صفت مخصوصہ اوائل عمر ہی میں جلوہ گر ہوتی ہے) زندگی کے آغاز دور جدید کے اگر اسباب نہیں تو کم ازکم اتفاقات میں ضرور شامل ہوا کئے ہیں۔ مسز نائیڈو کے والد نے زبردست ریاضی داں بنانیکی غرض سے انکو خاص سائنٹیفک (حکمی) تعلیم دلائی۔ لیکن اس نونہال کی شاعرانہ فطرت غالب آئی اور گیارہ سال کی عمر میں جب وہ جبر و مقابلہ کے سوالات حل کرتیں اور ٹھیک نہ آتے تو ایک پوری نظم اُن کے ذہن میں دفعتہً آجاتی اور وہ اُسے لکھ لیتیں،

غالباً اس طرح کے بچے ضرور کم و بیش ضدی ہوتے ہیں۔ مسز نائیڈو نے تیرہ سال کی عمر میں ایک مختصر ڈرامہ اپنے ڈاکٹر کی ضد پر لکھنا شروع کر دیا جس نے یہ مشورہ دیا تھا کہ" آپ کی صحت بہت خراب ہے لہذا کتاب کو ہاتھ بھی نہ لگانا چاہیئے" اس موقعہ پر ان کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو گئی۔ جب باقاعدہ مطالعہ موقوف کرا دیا گیا تو مسز نائیڈو نے بُری طرح پڑھنا شروع کر دیا اور یہ مشہور ہے کہ بیشتر حصہ مطالعہ کا اسی زمانہ میں کیا گیا۔

تمام بڑے لوگوں کی طرح اُن کی کشمکش زندگی بھی ابتدائی عمر ہی سے شروع ہو گئی۔ ابھی صرف پندرہ برس ہی کی عمر ہو گی کہ ڈاکٹر گو بندراجلو نائیڈو سے شادی قرار پائی گو ڈاکٹر صاحب موصوف ایک قدیم اور ممتاز خاندان کے فرد تھے مگر برہمن نہ تھے۔

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۸۹۴ء میں اس ذات کے اختلاف نے نہ صرف

مسز نائیڈو ہی کے بلکہ ڈاکٹر نائیڈو کے خاندان میں بھی کس قدر مخالفت پیدا کی ہوگی۔ جبکہ موجودہ معاشرتی ترقی کے دور میں بھی ذمہ دار شخصیتیں ایک جوان العمر شخص کے واسطے اس قسم کے افعال اچھی نظر سے نہیں دیکھینگی۔

وہ لوگ جن کی قسمت میں بڑا ہونا لکھا ہوتا ہے وہ اُن تعصبات پر جو ہماری کوششوں کے دائرہ کو محدود اور میدان عمل و تخیل کو تنگ بنادیں ہمیشہ غالب آتے ہیں۔

۱۸۹۵ء میں نظام حیدر آباد کے وظیفہ سے اپنی مرضی کے خلاف وہ انگلستان بھیجدی گئیں جہاں تین سال قیام رہا۔ اسی قیام انگلستان کے دوران میں تھوڑا زمانہ اٹلی میں بھی بسر کیا ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس آئیں۔ اُسی سال دسمبر کے مہینہ میں ذات پات کی قیود پر لات مارکر اور ہندوستان بھر کی رسوائی کی پروا نہ کرتے ہُوئے ڈاکٹر نائیڈو سے شادی کر لی۔

ہمیں یہاں مسز نائیڈو کی سیاسی زندگی سے صرف اسی قدر واسطہ ہے جتنا کہ انکی انتہائی جذبات وطن پرستی سے لبریز نظموں اور دیگر تصانیف کو اس سے (سیاسی زندگی) تعلق ہے۔

مسز نائیڈو نے ارتھر سمن کے نام جو خطوط لکھے ہیں انکے اقتباسات "آستانۂ زریں" (گولڈن تھریشولڈ) کے دیباچہ میں اُس نے نقل کئے ہیں۔ ان میں مسز نائیڈو نے مغرب کی حسین اور دنیادار مستورات پر جو انکے نزدیک قدرے کوتاہ فہم اور زندگی کی حقیر اور بے مایہ نمائش کی تلاش میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہیں مشرقی عورتوں کو ترجیح دی ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ "اگر مغربی مستورات حقیقتاً ایسی ہی ہیں جیسی کہ وہ بظاہر معلوم ہوتی ہیں تو اُنکی زندگی روحانی مسرتوں سے کس درجہ خالی ہوگی"۔ جذباتی اور روحانی تجربات جو اُنہیں اٹلی میں حاصل ہُوئے ان خطوط میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ ان کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اُنکی اشتہائے حسن کو اول مرتبہ اٹلی ہی میں سیری حاصل ہُوئی۔ وہیں انہوں نے لطیف فلسفۂ تعیش "کھاؤ۔ پیو اور خوش رہو" کے اصول سیکھے۔ منجملہ دیگر چیزوں کے جو زندگی انسان کے لئے مہیا کرتی ہے وہ نعمت "خندہ" کی زیادہ قدر کرنے لگیں اور وہیں انہوں نے موسیقی کی قوت جاں بخش کو محسوس کیا۔ چنانچہ کہتی ہیں "اے دل۔ ہمکو اُٹھنے دے اور پریشاں خوابوں کو مجتمع کرنے دے۔ ہم سوز نغمہ سے مصائب حیات پر فتح پائینگے"۔

اُنکے شاعرانہ نتائج افکار تین جلدوں پر مشتمل ہیں جو یکے بعد دیگرے شائع ہوئی ہیں۔ ان

کتابوں کے نام "آستانۂ زریں" (گولڈن تھریشولڈ) "طائر زمانہ" (برڈ آف ٹائم) "بازوئے شکستہ" (بروکین ونگ) ہیں۔ یہ تینوں کتابیں بلحاظ اپنی ترتیب انکی زندگی کے تین رخ ہیں۔ "آستانۂ زریں" میں جو عالم شباب کی شگفتگی اور زندہ دلی سے پر ہے وہ لڑی کے آبدار موتی کی طرح زندگی کے سمندر میں اس طرح بہہ رہی ہیں جس طرح ایک پرند دریا کی موجوں میں تیر رہا ہو لیکن اس میں بھی دبے دبے سوز کے الفاظ میں اُس رنج ویاس کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو انکی بعد کی تصانیف میں نمایاں ہے چنانچہ فرماتی ہیں "شادی کے نغموں اور جھولے کے راگوں میں رنج وغم کا زیر وبم موجود ہے۔ سورج کی امروزہ مسکراہٹ کل بادِ فنا کے جھونکوں میں تبدیل ہو جائیگی۔"

بہرکیف ان کی روح آلائش دنیوی سے بالاتر ہوتی ہے جس وقت وہ "بدہ برگل نیلوفر نشستہ" سے اس طرح خطاب کرتی ہیں "کوئی شئے ہماری روح کو آسمان پر پہنچنے سے نہیں روک سکتی نہ اُس پر فتح پا سکتی ہے۔"

"طائر زمانہ" میں بقول ایڈمنڈ گاس ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن کا عالم وجد گذر چکا ہے اور زیادہ سنجیدہ موسیقیت اُسکی جگہ لے رہی ہے۔ اس دوسرے دور میں وہ آلام سے ہم آغوش رہی ہیں اور اگر کبھی زندگی کی مسرتوں سے لذت گیر بھی ہوئی ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ یاس کے صدمات کو بھی محسوس کیا ہے۔ غالباً جذبات کا یہ مدوجزر خرابی صحت کے باعث تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے ملک کی خدمت میں قربان کرتی رہی ہیں۔ باایںہمہ ان کی نظم میں کیف تغزل موجود ہے۔ "فوک سانگ" "بنگل سیلر" (چوڑی والی) کی صدا اسرار سے صفات طباعی کو بے نقاب کر دیتے ہیں اور وہی جاذبیت رکھتے ہیں جو ان کی ابتدائی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ وہ آزار کشمکش میں مبتلا اور تقدیر سے جنگ کے لئے آمادہ نظر آتی ہیں "او تقدیر تو بیری کمزور ہتیں اور بے خوف روح پر متصرف ہونیکی بیکار کوشش کرتی ہے"۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے غم وغصہ کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر جلد ہی پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ پھر اُسی غم وغصہ میں ڈوب جاتی ہیں۔ لکھتی ہیں "اے دل۔ جب کہ خوش آیند موسم ہمارے گرد وپیش ہے۔ کلیاں کھل رہی ہیں۔ پتیاں سرسبز ہیں۔ کیا زندگی کے ایسے پر لطف وقت میں ہم اپنی تکالیف اور مصائب کو یاد کریں۔ اے دل۔ پرندوں اور چشموں سے ہمیں مسرتیں مستعار لینے دے۔ ہمکو گانے دے کیونکہ آج موسم بہار ہے۔ رونے پیٹنے کے لئے تو برسیں پڑی ہیں۔"

"بازوئے شکستہ" میں رد عمل جو پہلے ہی شروع ہو گیا تھا اب انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ رنج و غم نے ان کے قوائے دماغی کو مجروح کر دیا ہے۔ انکے بازوؤں سے خون بہہ رہا ہے۔ ایام ماضیہ کے برخلاف اب وہ موسم بہار کی آمد پر "خوش آمدید" کہنے کے لئے بھی نہیں دوڑ سکتیں بلکہ آرام کی خاطر اس پناہ دینے والی دیوار سے ٹیک لگائے سب سے پیچھے کھڑی ہیں گویا موسم بہار کی آواز جو انہیں شرکت کی غرض سے بلا رہی ہے بالکل سنائی نہیں دیتی۔ اب وہ بیکار "اس خندہ" دنداں نمائی متلاشی ہیں جس کی پہلے قدر کیا کرتی تھیں اور اُس گیت کی جویا ہیں جو وہ کبھی گایا کرتی تھیں۔ مگر اب بھی وہ پر امید معلوم ہوتی ہیں۔ ایک جگہ کہتی ہیں "دیکھو میں موعود موسم بہار سے ملنے کے لئے اٹھتی ہوں اور شکستہ بازوؤں سے ستاروں تک پہنچتی ہوں۔ ورڈس ورتھ کے الفاظ میں کثرت غم۔ گھاس پر بیٹھنے اور پھولوں سے کھیلنے کے زمانہ کے ضائع ہو جانے کی تلافی اس قوت سے ہو جاتی ہے جو ہمیں مصائب انسانی سے پیدا ہونے والے تسلی بخش خیالات حیات بعد الممات کے یقین اور پختہ کاری کی عمر سے حاصل ہوتی ہے۔

اب مصنفہ ہمیں "رج الفت" کراتی ہے۔ زائر "باب مسرت" سے داخل ہوتا ہے۔ اپنی نذر پیش کرتا اور دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ عالم وجد میں وہ بانسری کے نغمے سنتا اور محبت کے خواب دیکھتا ہے۔ لیکن اُسے فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ابھی تو "آنسوؤں کی سڑک" طے کرنا ہے۔ جہاں آلام و مصائب سنسانی اور آزار محبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ وہ سر نیاز خم کرتا ہے اور اعمال کے صلہ میں "حرم" کی جانب لیجایا جاتا ہے اور جونہی کہ وہ "قربان گاہ" پر اپنا سر جھکا دیتا ہے خوف اور فریب محبت رفتہ رفتہ دور ہو جاتا ہے اور اُس کی انتہائی محبت آخر کار پاک ہو کر رنج و غم کی وساطت سے غرور فانی سے نجات پاتی ہے۔ اس طرح نجات پاکر اور نیا جنم لیکر اپنے معشوق کی محبت میں خود کو قربان کرنیکے واسطے برضا و رغبت تیار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "اگر تو چاہے تو میرا گوشت اپنے کتوں کو کھلا دے۔ اگر تیری خوشی ہو تو میرے خون سے اپنے باغ کے درختوں کو پانی دے۔ میرے دل کو جلا کر خاک سیاہ کر دے۔ میری آرزوؤں کا خون کر دے۔ پیارے کیا میں تیرا نہیں ہوں۔ تو مختار ہے خواہ جلا یا مار۔ میری روح کو مسل کر آگ میں ڈالدے۔ میری سچی محبت میں ہرگز کوئی کمی۔ لغزش یا بیوفائی پیدا نہیں ہو سکیگی۔ میرے پیارے خواہ مجھے پھول کی طرح تیرے سینہ پر لیٹنا نصیب ہو یا خس و خاشاک کی طرح دوزخ کی آگ میں جلنا۔ بہر حال میں تیرا ہی ہوں"۔ اسی مضمون کو ایک فارسی شاعر نے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو　　در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو　　ہر چہ کنی رضائے تو

نہ ہمارا ارادہ ہے اور نہ یہ موقعہ کہ مسز نائیڈو کے کلام پر مفصل تنقید کی جائے البتہ اس بارہ میں چند الفاظ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ انگریزی نظم لکھنے والوں میں مسز نائیڈو کا کیا پایہ ہے۔ "طائر زمانہ" کے دیباچہ میں ایڈمنڈ گاس نے لکھا ہے کہ بحیثیت ایک بچےّ کے مسز نائیڈو کے خیالات مرتفع ہیں انہیں امید تھی کہ ایک دن میں ہندوستان کی کیٹس بن جائینگی۔ ایک غیر جانبدار نقاد جس نے ورڈس ورتھ اور شیلے کا مطالعہ کیا ہے فوراً اس قول کی صداقت پر پہنچ سکتا ہے۔ مسز نائیڈو کوئی بعید الفہم شخصیت نہیں ہیں۔ ان میں وہ جادو نہیں ہے جو ورڈس ورتھ کالرج۔ کیٹس اور شیلے کی نظموں میں ہمیں مسحور کرلیتا ہے۔ مسز نائیڈو کی نظمیں ہمیں کیٹس کے خیالات "درماندگی اور شور دنیا سے جہاں رہ کر انسان ایکدوسرے کو تکلیف میں پاتا ہے" سے جدا نہیں کرتیں اور حقائق کے بلند تر مراتب پر پہنچا دیتی ہیں اس حالت میں کہ بیرونی دنیا اور انفرادی دماغ ایک ہوجاتے ہیں اور ہمیں ایک غیر مرئی اور ابدی دنیا کا احساس ہوتا ہے۔ یہانتک کہ بہ اسباب ظاہر ہم اپنے وجود کو فراموش کر دیتے ہیں اور بقول ورڈس ورتھ اگرچہ ہم اپنی جسمانی حرکات میں سست ہیں لیکن ہم ایک زندہ روح بن جاتے ہیں۔ جولیس ہیر نے کیا خوب کہا ہے "ان کی شاعری فلسفہ اور فلسفہ شاعری ہے"۔ بلاشبہ مسز نائیڈو میں ایک بڑے شاعر جیسا جوش جذبہ اور ایک حد تک لطافت تخیل موجود ہے مگر بقول ڈریٹن "اُس لطیف وارفتگی" کی کمی ہے جو ایک شاعر میں ہونا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظم میں قوت مکاشفہ بہت کم ہے مگر اس سے اُن کے کلام کی خالص شیرینی اور سوز و گداز میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اُن کی نظم میں وہ بات موجود ہے جو آپ اپنا ہمدرد بنا لیتی ہے اور قارئین سے خراج تحسین وصول کرلیتی ہے کیونکہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ اُنکی شاعری حقیقی معنوں میں روزانہ انسانی زندگی کے مناظر و واقعات کا بیتابانہ اظہار ہے جنہیں مصنفہ نے خود براہ راست مشاہدہ کیا۔ صحت کے ساتھ یاد رکھا اور واضح طور پر بیان کیا ہے۔ وہ ہمیں پُرآشوب مفاد زندگی کی سیر کراتی ہیں جن سے انگریزی رومانی شعراء عام طور سے احتراز کرتے ہیں میری سی اسٹرجین کے الفاظ میں "اُنکی شاعری اگرچہ مادر وطن کی وفاداری کا مرقع ہے مگر بہ نسبت تصوف اور روحانیت کے کیفیات نفسانی اور جذبات سے کہیں زیادہ لبریز ہے۔ وہ اُس دماغ کا آئینہ ہے جس میں غور و فکر

کی بہ نسبت عملی قوت بیشتر ہے" مسز نائیڈو ایک پیغمبر۔ ایک غیب دان۔ ایک فلاسفر یا ایک عالمِ دین کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "موسمی طائر" کی حیثیت میں ہماری پیش نظر ہیں جو ابھی تک اپنی شیریں صاف اور بلند آواز میں "زندگی کی عظمت اور خوشیوں۔ رنجیدہ صدمات اور پرجوش لڑائیوں۔ خوش آیند موسم بہار کی مسرتوں۔ مستقبل کی خوشگوار امیدوں۔ شفق کی عطر بیز ہواؤں اور صوفیانہ خاموشیوں (جسے عوام موت سے تعبیر کرتے ہیں) کے گیت گا رہا ہے +

سروجنی نائیڈو ایسی نونہال ہیں جو مشرق کی جگر گوشہ ہیں۔ خوابوں اور تخیلات میں۔ جو ہر وقت شاعر کے دماغ پر محیط رہتے ہیں۔ بیخود اور سرشار وہ آزادانہ آغوش مادر میں کھیلتی ہیں اور وہیں گھٹنوں پر بیٹھے ہوئے اپنے انقلاب پذیر اندازوں کا نقادانہ مشاہدہ کرتی ہیں اور ہزار طریقوں سے اُلٹ پلٹ کر دیکھنا چاہتی ہیں کہ کس رنگ میں اُن کے گیت بھلے معلوم ہونگے۔ اسی وجہ سے مشرقی لوگوں کے واسطے ان کی نظمیں بالکل سادہ اور نیچرل ہیں۔ صرف یہی لوگ ہیں جو واقعی طور پر انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمدردی رکھ سکتے ہیں اور بجا طور پر ان کی تعریف کر سکتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اُس راستی اور دانائی کے چشمہ سے مستفید ہوتے ہیں جو بظاہر بیحس اور مجہول مشرقی طرز زندگی میں پوشیدہ ہے + (پروفیسر دیا ناتھ بھلہ ایم اے ڈی ایس کالج لاہور)

---

# کہاں ؟

شبِ مہتاب میں جبکہ میں محوِ خواب ہوتا ہوں۔ تو ماہ کامل کے نورانی ہاتھ مجھ اُٹھا اُٹھا کر جگاتے ہیں۔ میں جاگتا ہوں۔ اور تیری تلاش میں پھرتا ہوں۔ ستاروں سے اشارے کرتا ہوں اور اس منبع نور سے پوچھتا ہوں۔ لیکن وہ خاموش رہتے ہیں۔ اور تو نہیں ملتا۔

صبح صادق ہوتی ہے۔ پرندے چہکتے ہیں۔ اور مجھے جگاتے ہیں میں جاگتا ہوں۔ اور تیری جستجو میں نکلتا ہوں۔ وہ خاموش ہوجاتے ہیں۔ اور تو نہیں ملتا۔

کلیاں چٹکتی ہیں۔ اور میں بیقرار ہوجاتا ہوں۔ تیری یاد مجھے ستاتی ہے۔ اور میں تجھے گلشن میں ڈھونڈھتا ہوں۔ پھول پتیوں میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ اور تو نہیں ملتا۔

میری آنکھوں سے مینہ برستا ہے۔ اور میں ڈوب جاتا ہوں۔ میرے جسم سے شرارے نکلتے ہیں۔ اور میں جل جاتا ہوں۔ مجھے تیرا خیال نہیں آتا۔ اور تجھے پاتا ہوں۔ لیکن کہاں ؟ میں نہیں جانتا۔

ترجمہ — اختر

# رازکی باتیں

سوز ہے دل میں، تو اُس کو تارِ جاں سے ساز کر
اُس کے ہر پردے سے اہلِ بزم کو ہمراز کر

داستانِ شمع و پروانہ سے درسِ عشق لے
بزم میں خود کو نثارِ شاہدِ طنّاز کر

ایک جلوے نے تجھے جوہر سے کُندن کر دیا
اُس سراپا ناز پر جتنا ہو تجھ سے ناز کر

ہیں تجلّی بار تجھ میں سینکڑوں شمس و قمر
دیکھنا چاہے تو تُو گاہے چشمِ باطن باز کر

عالمِ فطرت میں تُو ہر ایک سے ہل مل کے رہ
گُل سے ہم آہنگ ہو، بلبل کو ہم آواز کر

جو خرابی ہے، وہ کفر و شرک کے جھگڑوں میں ہے
کعبۂ دل کو کبھی اصنام سے دمساز کر

شُکر پر دونوں جہانوں کی خوشی موقوف ہے
خم سرِ تسلیم کر اور عجز کو اعجاز کر

عرش کی لادے گی تجھ کو لحظہ لحظہ کی خبر
طبعِ عالی کو فدا آمادۂ پرواز کر

وتستہ پرشاد فدا بی۔ اے

# اخلاقیاتِ اجتماعیہ

گذشتہ سے پیوستہ

## ۵۔ معائبِ اخلاق

پچھلی بحث میں جو کچھ مذکور ہوا، ان اخلاقی خصائل اور فضائل سے متعلق تھا جنہیں اخلاق انسانوں میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسکی تمنا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد میں موجود ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ انسانی زندگی نیکی پارسائی کا مجموعہ نہیں بلکہ فطرتاً ان جذبات و امیال سے مملو ہے جو اسے معصیت و بدکاری کی طرف لیجاتے ہیں۔ اس لئے اب ذرا ان باتوں سے ہٹ کر جنکی اخلاق تمنا کرتا ہے ایسی باتوں کی طرف آؤ جن سے اخلاق کو عملاً واسطہ پڑتا ہے۔

برائی کی طرف فطری میلان۔ یہ بات تم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ قدرت نے جس طرح انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنایا ہے، اسی طرح ایک کے فوائد دوسرے سے متعلق کئے ہیں، اور انسان کی فطرت میں یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ اپنے لئے تمام فوائد و منافع کو مخصوص کرلینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام منفعتیں اسکے لئے مخصوص ہوجائیں اور وہی مادی نعمتوں کی حکمرانی کرے۔ اور چونکہ ایسی حرص کم و بیش سوسائٹی کے ہر فرد میں موجود ہوتی ہے اور اسکی پیاس بجھانے کے لئے اپنی بساط کے مطابق ہر شخص کوشش کرتا ہے، اس لئے ان میں باہم تصادم ہوتا ہے، ایک کی اغراض دوسرے کی اغراض سے ٹکراجاتی ہیں، ایک کے حقوق میں دوسرا دخل دیتا ہے۔ ایک کی بھلائی دوسرے کی برائی ہوجاتی ہے، لوگ اپنی غیر معمولی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں، اور منفعت بخش دوسرے کے لئے مضرت بخش ذرائع کا استعمال عام ہوجاتا ہے جو بُرے اعمال پر ملامت کرتا ہے وہ ایک حاسۂ اخلاقی ہے، شروع شروع میں انہیں روکتا ہے، مگر مادی منافع کے مقابلہ میں انسان کی حریص فطرت اسکی کم سنتی ہے۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد وہ مردہ ہوجاتا ہے اور انسان ملٹن کے شیطان کی طرح کہنے لگتا ہے کہ "اے برائی تو میرے لئے بھلائی ہوجا"۔ یعنی اس شرارت آمیز طرز پر زندگی بسر کرتے کرتے اس کا یہ اصول

ہوجاتا ہے کہ حصولِ مقصد کا ذریعہ صرف برائی ہے، یا وہ برائی جو حصول مقصد میں کام آتی ہو عین بھلائی ہے،

پھر چونکہ سوسائٹی کی متحدہ اغراض سے ایسے افراد کی ذاتی اغراض بالکل متضاد واقع ہوتی ہیں، اور انکی کوششیں اجتماعی مقاصد کے بالکل خلاف ہوتی ہیں، اس لئے جماعت کے فوائد قدم قدم پر ان کا راستہ روکتے ہیں، اور ان میں باہم ایک کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ لڑائی ملٹن کے شیطان کی طرح انتہائی عداوت تک نہیں پہنچتی مگر جیسا کہ شکسپیئر نے کنگ رچرڈ کی زبان سے کہلوایا ہے کہ "میں عاشق ثابت نہیں ہوسکا اس لئے اب میں نے بدمعاش ہونیکا تہیہ کرلیا ہے" سوسائٹی کے دنی الطبع افراد جب سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتا نہیں دیکھتے تو بدمعاشی پر اتر آتے ہیں اور سوسائٹی کے نقصان میں اپنے فائدہ کو تلاش کرتے ہیں +

یہ نہ سمجھو کہ ایسی حرکتیں صرف ذلیل عوام ہی کرتے ہیں۔ اونچے طبقہ کے انسانوں کا دامن اس سے پاک ہے۔ نہیں۔ خواص کے مفہوم سے اگر پیغمبروں، اور ایسے لوگوں کو جنکا ذریعۂ شہرت وعظمت علم وعمل ہے، نکال دو تو تمہیں یہ ماننا پڑیگا کہ خواص بالعموم وہی لوگ ہیں جو اسی طرح اپنی جماعت اور اپنے بنی نوع سے لڑے ہیں اور اپنی قابلیتوں سے سوسائٹی کی متحدہ اغراض کو شکست دیکر آگے بڑھ گئے ہیں، ان میں اور عوام میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری زبان میں عوام وہ ہیں جو اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوتے، اور خواص وہ جو جماعت کے مقابلہ میں فتح پا لیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ سوسائٹی میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو اپنے ذاتی فوائد اور مقاصد پر جماعت کے فوائد و مقاصد کو قربان کردینا اور جماعت کے خلاف جنگ کرکے اپنے اغراض کو حاصل کرنا اپنا مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں۔ ایسی اکثریت کی موجودگی میں اخلاق کی تمامتر توجہ رذائل و معائب کی طرف منعطف ہوجاتی ہے اور محاسن پیدا کرنے کے لئے اسے معائب کا مقابلہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ پس اب تحقیق کرنا چاہیئے کہ رذائل اخلاق کیا ہیں اور انکے مقابلہ کی کیا صورت ہے:-

اخلاقی عیوب کے چار بنیادی رکن۔ جس طرح محاسن کا استقصا کرنے کے بعد انکی اصل چار بنیادی محاسن ٹھیرتے ہیں، اسی طرح اگر تمام معائب کو تلاش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ فضائل کے عین مقابلہ میں چار بنیادیں انکی بھی ہیں۔ شجاعت کے مقابلہ میں جبن یا الم کا عدم تحمل، عفت کے مقابلہ میں حرص یا لذت کی غلامی، عدالت کے مقابلہ میں ظلم یا اجتماعی روابط کی بے عدلی، اور حکمت کے مقابلہ میں جہل یا قوت امتیاز کی

کی۔ انسان جب کبھی مصائب کے مقابلہ میں کمزوری برتے اور راستہ کی مشکلات کو دیکھ کر اپنے اخلاقی نصب العین کی طرف بڑھنے سے ہچکچائے تو اسکی ایسی تمام کمزوریاں جبن کے ماتحت آجاتی ہیں لذات و شہوات کی غلامی میں جو کچھ بھی حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں اور وساوس شیطانی کے ماتحت جو کچھ بھی وہ کرتا ہے سب حرص کی ذیل میں ہے، اجتماعی زندگی میں غیر عادلانہ طریقوں سے جتنے اخلاقی معائب کا ارتکاب اس سے ہوتا ہے ان سب پر ظلم حاوی ہے۔ اور راہ صائب اختیار کرنے میں جتنی غلطیاں اس سے سرزد ہوتی ہیں سب جہل کا نتیجہ ہیں ؛

تشریح کی یہاں ضرورت نہیں، کیونکہ پچھلی بحث میں محاسن پر جو گفتگو ہو چکی ہے اسے اُلٹ کر پڑھو تو تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ محاسن کے مقابلہ میں مذکورہ بالا معائب کا کیا مفہوم ہے۔ البتہ ایک بات یہاں صاف کر دینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ بعض بہترین فضائل جب جماعت کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں تو وہ بدترین رذائل سے بدل جاتے ہیں مثلاً شجاعت اگر جماعت کے خلاف استعمال کیجائے تو جبن سے بدتر ہے، اور حکمت اگر جماعت کو ذاتی اغراض کا غلام بنانیکے لئے کام میں لائی جائے تو جہل و نادانی کی بدترین صورت ہے۔ یہ مذکورہ بالا چار رذائل پر مستزاد ہے ؛

**معائب کی دو قسمیں**۔ ان تمام معائب کو جو اوپر مذکور ہوئے۔ انکی نوعیت کے اعتبار سے دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو سیرت، اور خصائل سے متعلق ہیں، انہیں رذائل سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور وہ باطنی عیوب ہیں، دوسرے وہ جو چال چلن اور افعال سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں جرائم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ ظاہری عیوب ہیں۔ رذائل کے لئے جرائم کا ہونا ضروری نہیں ہے مگر جرائم کے ساتھ رذالت کا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جرائم رذالت ہی کی ترقی یافتہ صورت ہیں۔ اخلاق کی نظر میں رذائل جرائم کی اصل ہیں، کیونکہ جرم اس وقت تک سرزد نہیں ہو سکتا جب تک بُرا ارادہ موجود نہ ہو اور برا ارادہ نتیجہ ہے بُرے خیالات اور بُری سیرت کا۔ اسی لئے علم الاخلاق میں جرائم کے انسداد سے زیادہ ضروری چیز رذائل کی اصلاح ہے۔ مگر چونکہ رذائل پوشیدہ رہتے ہیں اور قانون حکمت صرف ظاہری اعمال تک محدود ہے اس لئے حکومتیں رذائل کی اصلاح سے عاجز ہیں۔ البتہ یہ مذہب کا کام ہے کہ وہ اعمال سے زیادہ تزکیۂ نفس کی جانب توجہ کرتا ہے اور برائی کی جڑ کھوکھلی کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی تقدیر کا خوف دلاتا ہے جو اعمال کے بجائے نیتوں پر کیجائیگی اور انسان کے نفس پر یہ ہیبت طاری کر دیتا

ہے کہ ایک بالاتر قوت اسکے دلوں کا حال جانتی ہے اور اسے تمام انسانی ارادوں اور نیتوں کا علم ہوجاتا ہے۔ اور پھر اس قوت کے ساتھ وہ اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ "اگر تو نے کسی گناہ کا ارادہ کیا تو اپنے خیال میں گنہگار ہوچکا"

علمائے اخلاق خیال کو عمل پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس میں بعض کا اتنا پختہ عقیدہ ہے کہ "جو بات بظاہر اچھی ہے، اگر وہ کسی اچھے محرک پر مبنی نہیں ہے تو درحقیقت بری ہے" اسی طرح یہ اصول کہ "جس عمل خیر کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے وہ شر ہے" ایک زریں اصول ہے مگر افسوس ہے کہ لوگ لفظ ایمان کو اسکے اصلی معنوں میں لینے کے بجائے اپنے مزعومہ معنوں میں لیتے ہیں اور انہی کو اس اصول کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات عیسائی مصنفوں کے ہاں کثرت سے پائی جاتی ہے جو غیر عیسائی شخص کے فضائل کو "شاندار رذائل" سے تعبیر کرتے ہیں۔

**خیال اور عمل کا فرق** - اگرچہ مذہبی نقطۂ نظر سے بری سیرت ویسی ہی قابل ملامت ہے جیسے برے افعال، لیکن درحقیقت خیال کی برائی اور عمل کی برائی میں ایک بڑا فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ آگے چل کر بری سیرت ہی سے برے افعال پیدا ہوتے ہیں، مگر ان دونوں کو انکی ابتدائی یا آخری صورت میں بھی ایک نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح محض خوش نیتی خوش فعلی کے برابر قابل تحسین نہیں ہے اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے برے ارادہ سے واقف ہوجائیں تو اسکے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا چاہیئے جو برے فعل پر کیا جاتا ہے کیونکہ ہر ارادہ قوت سے فعل میں نہیں آیا کرتا۔ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے دشمن کو قتل کرنیکا ارادہ کرے، برسوں اسے اپنے دل میں پکائے اسکے لئے ضروری سامان بھی بہم پہنچا لے مگر جب قتل کرنے لگے تو اسے رحم آجائے یا خود اپنے انجام سے ڈر کر باز آجائے۔ میورہڈ نے خوب کہا ہے کہ "جو شخص صرف ارادۂ جرم کی حالت میں پکڑا جائے اس سے نیکی کا برتاؤ نہ کرنا فطرت انسانی کی کوئی خوبی نہیں" اسکے معنے یہ نہیں ہیں کہ ایسے شخص کی آفرین وتحسین سے ہمت افزائی کیجائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے سزا دینے کی بجائے موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ارادہ کی برائی کو سمجھ کر اچھائی سے بدلنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں اس عورت کا قصہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو ہنڈ نگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ وہ عورت اپنے ہمسایہ کے گھر میں آگ لگانیکا تہیہ کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ اس نے عدالت میں اقرار کیا کہ میرا ارادہ آتش زنی کا تھا، اور گرفتاری کے وقت تک میں اپنے اس ارادہ سے باز نہیں آئی تھی، مگر اس نے

قسم کھاکر کہاکہ آخر وقت تک میں یہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے یہ کام نہ ہوسکیگا۔ ایساہی واقعہ میریم ایک عورت کا ہے جس نے خودکشی کاارادہ کیاتھا۔ آرتھر فورڈ لکھتاہے کہ" بعد میں مہینوں وہ صرف اس تصور سے دہل جاتی تھی کہ اس نے خودکشی کاارادہ کیاتھا۔ اس کو خبر نہ تھی کہ سنگین جرائم کے ارادہ اور ارتکاب میں کیافرق ہے"۔ کارلائل اپنی French Revolution میں اس فرق کوایک مثال سے ظاہر کرتا ہے۔ "فرض کرو ایک شخص اپنے دشمن کوہلاک کرناچاہتاہے، پستول اسکے ہاتھ میں ہے، اور انگلی لبلبی پر ہے، تاہم اس کاارادہ اس کے عمل پر غالب نہیں ہے، اوراس کادل ہچکچارہاہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ پکڑلیا جائے تواسے ارتکاب جرم سے متہم نہیں کیاجاسکتا۔ ممکن ہے کہ عین اس تزلزل کی حالت میں اس نے اپنے ضمیر کی خاموش تنبیہ کوسن لیاہو اور قتل کاارادہ چھوڑچکاہو۔ انتظاماً اسے سزادینا ازبس ضروری ہے، مگر اخلاقاً وہ مستوجب سزا نہیں ہے"۔

اس مسئلہ پر آدم اسمتھ نے نظریہ احساسات اخلاقی میں خوب بحث کی ہے۔

نیت اور عمل۔ مگر یہ معاملہ ایک اور حیثیت بھی رکھتاہے۔ ایک شخص اگر برا ارادہ کرتاہے اوراس کے بعد اسے عمل میں نہیں لاتا توخواہ وہ ہمارے عفوودرگذر کاکتناہی مستحق کیوں نہ ہو، مگر وہ ایک کمزور انسان ہے جس میں قوت ارادی یا روح عمل موجود نہیں ہے۔ اسکی بری نیت جس طرح بے عمل رہی اسی طرح اچھی نیت بھی بے عمل رہ سکتی ہے اور وہ جس طرح برا نہیں بن سکتا۔ اس حیثیت سے بری نیت اگر صرف نیت رہے۔ تو برے عمل سے بدتر ہے۔ مثلاً وہی شخص جس کی انگلی ریوالور کی لبلبی پر رکھی ہوئی تھی اور وہ شوٹ کرنے سے ہچکچارہاتھا، اگر وہ بیدھڑک شوٹ کردیتا تو اگرچہ وہ اخلاقاً ایک سخت جرم کامرتکب ہونیکی وجہ سے قصاص کامستوجب قرار دیاجاتا، مگر ایک خاص حیثیت سے ہم اسکی وقعت کرتے۔ اب کہ وہ اپنے تذبذب کے باعث ارتکاب جرم نہ کرسکا، خواہ وہ قصاص سے بچگیاہو، لیکن اس نے ہمارے دل پر اپنی بزدلی ارادہ کی کمزوری، اورکسی اہم کام کوکرنیکے لئے اپنی نااہلی کانقش ہمارے دل پر چھوڑا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انجام بینی غلطی ہے اور ہمارے نزدیک بری نیتوں کو برے عمل کی صورت میں لانا ایک اچھا کام ہے۔ نہیں ہم ایک بیباک بدعمل کی بدعملی کو تو اتناہی قابل ملامت سمجھتے ہیں جسکی وہ مستحق ہے، مگر اسکی قوت عمل کو ایک بدنیت کی ارادی کمزوری سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جس شخص میں ارادہ کو عمل کا جامہ پہنانیکی قوت ہے وہ ایک کامیاب انسان ہوسکتا ہے

ایک عاقبت اندیش ہر کام پر غور کرتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو سوچتا ہے، اور ایک عرصہ تک کرنے یا نہ کرنے کے خیال میں مذبذب رہتا ہے، دوسرا شخص اسے فوراً کر گذرتا ہے اور کچھ پروا نہیں کرتا کہ انجام کیا ہوگا۔ اب خواہ اول الذکر کو ہم محتاط اور دور اندیش اور آخر الذکر کو غیر محتاط اور ناعاقبت اندیش ہی کیوں نہ کہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اول الذکر اپنا وقت سوچنے میں صرف کرتا ہے اور آخر الذکر کرنے میں اسکی نیت نیت ہی رہتی ہے اور اس کا ارادہ عمل کا جامہ پہن لیتا ہے۔ وہ دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا اور یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ سوسائٹی کو ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔

تاہم قوت عمل کے ساتھ ایک خاص حد تک دور اندیش و عاقبت بینی بھی ضروری ہے۔

ایک اور نظریہ۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ بُرے خیالات اگر بُری نیت تک منجر نہ ہوں تو اخلاقاً قابل الزام نہیں۔ ملٹن اپنی مشہور کتاب Paradise Lost میں لکھتا ہے کہ "خدا یا انسان دونوں کے دل میں بُرائی گذر سکتی ہے، لیکن وہ اسکو پسند نہ کرے تو اسکے قوائے ذہنی و عملی پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑیگا" مگر یہ نظریہ بالکل غلط ہے، اول تو خدا سے بُرے خیال کو نسبت دینا ایک لغویت ہے، دوسرے دن انسان کے دل میں بُرے خیال کا موجود ہونا اسکے اندر ایک دنائت کا پتہ دیتا ہے۔ اور وہ اس لئے ضرور قابل ملامت ہے کہ دل میں چھپا ہوا بُرا خیال، راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند ہے جو صرصر بدخیالی سے ہوا پاکر خرمن سوز ہو سکتی ہے۔

اصلاحی نقطۂ نظر۔ ایک دوسری حیثیت سے اگر اس معاملہ پر غور کرو تو پھر اسی نتیجہ پر پہنچوگے کہ بُرا عمل بُرے خیال سے بہتر ہے۔ بُرے کام فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں اور انکی اخلاقی یا قانونی سزا وقت کے وقت انسان کو ملجاتی ہے، مگر میرا خیال دل میں چھپا رہتا ہے اور سوسائٹی کو عرصہ تک اس اخفا سے دھوکہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ اول الذکر کے اثر سے سوسائٹی اچھی طرح بچاؤ کرسکتی ہے اور خود اسکی بھی اصلاح ممکن ہے مگر آخر الذکر سے نہ سوسائٹی حفاظت کا سامان کرسکتی ہے، اور نہ اسکی اصلاح ہو سکتی ہے۔ طامس بکل نے خوب کہا ہے کہ "ادھورے ظالم بادشاہ سے پورا ظالم بادشاہ بہتر ہے۔" بدکار اپنی بدی کو ظاہر کردیتا ہے اس لئے اس کا تدارک اور اسکی اصلاح دونوں ممکن ہیں، مگر بدنیت اپنی بدی کو چھپاتا ہے اس لئے نہ اس کا تدارک ہو سکتا ہے اور نہ اصلاح۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ صرف جرائم ہی قابل اصلاح ہیں، رذائل کی عملی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں

سوائے اسکے کہ انکے ترک کا مشورہ دیا جائے۔ پس اب ہمیں صرف جرائم اور اُنکی اصلاح سے بحث کرنی چاہیئے

معصیت اور جرم۔ اوپر ہم نے جرائم کا لفظ جس معنی میں استعمال کیا ہے وہ وسعت کے لحاظ سے تمام گناہوں پر حاوی ہے۔ مگر اصطلاح میں جرم سے مراد وہ اعمال ہوتے ہیں جو ملکی قانون کے خلاف ہوں اور ایسے اعمال جو صرف اخلاقاً گناہ ہوں معصیت کہلاتے ہیں۔ اس کا فرق یوں سمجھو کہ چوری ایک جرم ہے کیونکہ چور دوسرے کے حق ملکیت میں دخل دیتا ہے اور ملکی قانون کو اسے سزا دینے کا حق ہے مگر احسان فراموشی جرم نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کا اپنا فعل ہے قانون کو اسکی روک تھام کا اختیار نہیں ہے۔ جرائم کی تحدید و تشخیص ممکن ہے، مگر معاصی کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ انکی حدبندی کیجا سکتی ہے کیونکہ انکا انحصار سوسائٹی کے اجتماعی حاسۂ اخلاقی پر منحصر ہے۔ جس سوسائٹی کے حسیات اخلاق جتنے نازک ہونگے اس میں معاصی اور اخلاقی کمزوریوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اور جو حسیات اخلاقی کے اعتبار سے ذکی الحس نہ ہوگی اس کا حال اس سے برعکس ہوگا۔

جرائم کی سزا حکومت دیتی ہے اور معاصی کی سزا جماعت۔

معصیت کے نتائج معصیت کے بُرے نتیجے اس کے ارتکاب سے کبھی علٰحدہ نہیں ہوتے، بلکہ کسی نہ کسی طرح مرتکب پر ضرور اثرانداز ہوتے ہیں، سقراط کا مشہور قول ہے کہ "ظلم کرنا ظلم سہنے سے زیادہ خطرناک ہے،" یعنی ظلم سہنے سے نتائج بالکل خارجی ہوتے ہیں، روح کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر ظلم کرنے سے ظالم اپنے آپ کو میزان ہستی میں کم وزن کر دیتا ہے، اور اس طرح خود اپنی ذات پر اس سے زیادہ ظلم کرتا ہے جتنا دوسرے پر کیا تھا۔ گو اسکے نتائج اسے علانیہ نظر نہ آئیں اور وہ اپنے آپکو بالکل محفوظ سمجھے، لیکن حقیقت کی نگاہ میں وہ مظلوم سے زیادہ ٹوٹے میں ہے۔

ہر شخص فطرتاً یہ سمجھتا ہے کہ انسان کو اسکے اعمال کا بدلہ ملنا چاہیئے، اور ایسا سمجھنا عقلاً درست ہے۔ ایک نیک شخص جب دُنیا کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے اور ایک قومی دردمند اپنی قوم کو ذلت و پستی سے ابھارنے کے لئے سعی کرتا ہے تو ہم قدرتی طور پر توقع کرتے ہیں کہ خدا اس کا ساتھ دیگا اور اسے ضرور کامیابی ہوگی۔ مگر جب کوئی بدکار آدمی مخلوق خدا پر ظلم کرتا ہے یا دُنیا میں بُرائی کو پھیلاتا ہے تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اس پر خدا کا قہر نازل ہوگا اور وہ ضرور ناکام ہوگا۔ ہمارا یہ عقیدہ اتنا پختہ ہوتا ہے کہ اگر اول الذکر کو ناکامی و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ہم اسے کامیابی

سے قریب تر سمجھتے ہیں اور آخر الذکر کامیاب نظر آتا ہے تو ہمارے نزدیک اسکی کامیابی محض ایک بھلاوا اور فرصت ہوتی ہے جو اللہ اسے پوری سزا دینے یا راہ راست پر آجانیکے لئے دیتا ہے۔ اگر دنیا انصاف پر مبنی ہے تو نیکی کا فلاح یاب ہونا ضروری ہے اور ہر نیک آدمی یقیناً فلاح یاب ہوگا۔ خواہ دُنیا اس کے ساتھ کیسی ہی دشمنی کرے اور اسی طرح بدی کو کبھی فلاح نہیں ہو سکتی، بدکار کی کامیابی عارضی ہوتی ہے، وہ چند روز سے زیادہ گل چھرے نہیں اُڑا سکتا۔ اور بالآخر وہ اپنے کھودے ہُوئے گڑھوں میں خود گر جاتا ہے۔ انتقام و امتنان کے فطری احساسات کی عقلی بنیاد یہی ہے۔ یہ احساسات اگر فطری نہ ہوتے یا حق بجانب نہ ہوتے تو شعور انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انکا بدلنا اور اس عقیدہ کا متزلزل ہوجانا ضروری تھا۔ مگر برخلاف اسکے وہ ترقی کر رہا ہے اور پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے جو اسکے حق بجانب ہونیکی صریح دلیل ہے۔

مل نے "افادیت" میں اور آدم سمتھ نے

میں اس مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر خوب بحث کی ہے، خصوصاً آدم سمتھ نے تو وضاحت کا حق ادا کر دیا ہے۔

---

## جزا

۱۔ جب تو کوئی نیکی کرے اور کوئی دوسرا اس سے متمتع ہو تو پھر تیسرے کی کیوں فکر کیجائے بیوقوفوں کا یہ عمل ہے کہ بھلائی کے صلہ یا معاوضہ کے خواستگار ہوتے ہیں۔

مارکس اری لس

۲۔ یاد رکھو کہ اچھے لوگ دکھاوے کے لئے بھلائی نہیں کرتے بلکہ وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ایسا عمل درست ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ خطرہ گذرے کہ پھر بھلائی کرنے سے کیا فائدہ۔ اگر تم اپنا نام صحیح طور پر لکھ سکتے ہو تو اس سے کیا فائدہ ہے۔ صرف یہ کہ نام صحیح طور پر لکھا گیا۔ کیا یہ کوئی صلہ نہیں۔ ایسی صورت میں کسی بھلے آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر کسی صلہ کی کیوں تلاش کیجائے کہ اسکا فعل درست اور واجبی ہے۔

ای ٹی ٹس      افضل حسین فاروقی

---

# نمود بے بود

افسرِ قیصر و کسرے بے سود
لشکرِ خسرو و دارا بے سود

غمِ جلادِ فنا بے معنے
ذکرِ ادریسؑ و مسیحا بے سود

فکرِ صحرائے عدم لاحاصل
جستجوئے پرِ عنقا بے سود

شوکتِ تختِ سلیماں بیکار
الفت دولت دنیا بے سود

حصصِ دہر کی تقسیم فضول
قصصِ گنبدِ خضرا بے سود

عالمِ ہستیٔ انساں فانی
ماتمِ پستیٔ دنیا بے سود

جرسِ نالۂ عشاق عبث
ہوسِ اوجِ ثریا بے سود

مصحفِ دہر کی تفسیر غلط
حاصلِ حکمتِ اشیا بے سود

کرم و تھر کی تفریق عبث
حرم و دیر کا جھگڑا بے سود

محفلِ حسن کی زینت بیکار
عرصۂ عشق کا غوغا بے سود

سفرِ دشتِ جنوں امرِ محال
شوقِ نظارۂ لیلیٰ بے سود

تپشِ دل کی حکایت مہمل
کششِ عشق کا دعویٰ بے سود

شررِ سوزِ جگر موجِ سراب
نظرِ دیدۂ بینا بے سود

بزمِ ہستی ہے زوال آمادہ
تب و تابِ دلِ شیدا بے سود

گوشۂ دل میں ہو روپوش نظیر
ہے ہمہ گیریٔ دنیا بے سود

اصغر حسین خاں نظیر لودیانوی

# مجھے کوئی منائے!

محمود نے چُپ سادھ لی۔ اسے کسی سے بات کرنے کی خواہش نہ تھی۔ جب اُسے کھانے کے لئے بُلایا گیا تو اس نے روٹھے ہُوئے انداز سے انکار کیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ . . . . . . . ."

جب چائے کے لئے بلایا گیا تو اس نے بڑے وثوق سے استقلال کے ساتھ جواب دیا:۔

"آپ چائے پئیں یا جو دل چاہے کریں مجھے نہ بُلائیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے"

یہ جواب سُن کر محمود کی ہمشیرہ اصغری خلاف معمول زور سے ہنسی اور کہنے لگی "کیا تم سمجھتے ہو کہ کسی کو تمہاری فکر ہے؟ اگر چاہو تو کھانا پینا بالکل چھوڑ دو۔ کون پروا کرتا ہے"

یہ کہکر وہ ہنستی ہُوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن محمود نے اُسکی مبالغہ آمیز بے پروائی کے انداز اور ہنسی میں اپنے لئے کسی قدر ہمدردی کو محسوس کیا۔ یہ بہانہ تھا۔ صرف بہانہ۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ابّا اور اماں کو مطلق پروا نہیں ہے خواہ وہ کچھ کھائے یا نہ کھائے . . . . . . . . اصل میں سب فکر مند ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کس طرح اسکو کچھ کھلائیں . . . . . . . تو فکر کرنے دو . . . . . . . . . اُنہیں کا قصور تو تھا . . . . . . . ششماہی امتحان میں حساب کے پرچے میں فقط ایک نمبر پانا اِتنی بُری بات نہ تھی کہ اُسے سب کے سامنے بے عزت کیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ تم بھیک مانگو گے . . . . . . . بھیک تو آدمی ہی مانگتے ہیں اور خوب موٹے تازے رہتے ہیں . . . . . . . . تاہم وہ کھانا نہیں کھائیگا . . . . . .

محمود نشست کے کمرے میں بیٹھا ہُوا ظاہرا ایک اخبار دیکھ رہا تھا لیکن اصل میں کان لگا کر سُن رہا تھا کہ برابر والے کمرے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ ضرور اُسی کی باتیں کر رہے ہونگے۔ اور کہہ رہے ہونگے کہ روٹھ گیا ہے۔ کھانا نہیں کھاتا۔ لیکن لڑکا ہے بڑا ذہین . . . . . . . .

اسکی والدہ کی آواز آئی "محمود کہاں ہے؟ ـــــ کیوں نہیں آیا؟"

اصغری نے آہستہ سے جواب دیا "وہ ناراض ہے"

اسکی والدہ کی بھاری آواز یہ کہتے ہُوئے سُنائی دی "اسکے لئے کچھ اُٹھا رکھنا"

محمود اپنے آپ سے کہنے لگا "میرے لئے رکھنے کی کیا ضرورت ہے ....... میں نہیں کھاؤنگا ایک بھکاری کے لئے کون چیزیں اُٹھا رکھتا ہے"۔

اسکے والد نے آواز دی "محمود!"

محمود چُپ رہا۔ اسکے والد نے دوبارہ آواز دی۔

محمود نے سر کو اخبار کی طرف اور جُھکا لیا اور آواز میں استقلال پیدا کر کے جواب دیا "جی۔ کیا ہے؟"

"اِدھر آؤ۔ اب غصّہ جانے دو"

"میں غصّے میں نہیں ہوں۔ پڑھ رہا ہوں ....... بھیک مانگنے والے معزز لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتے"

"بیوقوف"

محمود نے آواز سے جواب دیا "میں بیوقوف ہی اچھا ہوں" اور پھر آہستہ سے کہنے لگا "دیکھنا توسہی۔ معلوم ہوجائیگا کہ میں کتنا بیوقوف ہوں"

اسکی بہن نے قدرے بلند آواز سے کہا "آج مزاج کا پارہ بہت چڑھا ہُوا ہے"

"تم سے چپ نہیں رہا جاتا؟" محمود نے اپنے ہونٹوں میں کہا۔ اور اسکے دل میں اپنی بہن کی طرف سے بیحد نفرت پیدا ہوگئی۔ بدلہ لینے کی خواہش ستانے لگی ....... اگر صرف ابا اس وقت نہ ہوتے ....... یہ کیوں دخل دیتی ہے؟ اسکی رائے کس نے دریافت کی تھی؟ اس نے غصّے میں کھانس کر گلا صاف کیا۔ اخبار کو میز پر پھینک کر جیب میں سے پنسل نکالی اور اسکے ایک کارٹون کے نیچے جس میں ایک نہایت بدصورت عورت کی تصویر بنی ہُوئی تھی لکھدیا "یہ اصغری ہے" اور اخبار کو میز پر اُسی طرح کھُلا چھوڑ کر تا کہ جو بھی کوئی کمرے میں آئے اُسے ضرور دیکھے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کُرسی پر اصغری کی دو کتابیں پڑی تھیں۔ انکو اُٹھا کر زمین پر پھینکدیا۔

"میری کُرسی پر یہ کیوں پڑی ہیں" یہ اُس نے چلا کر کہا گو وہاں سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اس وقت ہر کسی کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ گویا انکے گھر میں ایک جنگ عظیم چھڑی ہُوئی ہے جس میں اکیلا محمود ایک طرف ہے اور باقی سب ایک طرف۔ تھوڑی دیر کے بعد جب خادمہ کمرے میں آئی تو اسکے ساتھ بھی اُسی مخاصمانہ انداز میں پیش آیا۔

"محمود میاں !"

"جاؤ"

"ایک لڑکا آپ سے ملنے آیا ہے"

"میں تم سے کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے"

"آج پیٹ خالی ہے نا۔ اس لئے اس میں غصّہ بھر رہا ہے . . . . . ."

محمود اچھی طرح جانتا تھا کہ خادمہ کو اسکے پاس ارادتاً بھیجا گیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے . . . . . لیکن اب وہ بچہ نہیں تھا . . . . اُنہیں فکر کرنے دو ! . . . لیکن بھوک بھی تو واقعی لگ رہی تھی۔ کیا باورچی خانہ میں چلا جانا چاہیئے ؟ نہیں اس سے کام نہیں چلیگا۔ خادمہ ضرور اماں سے کہدیگی اور "اُن" کو تسلی ہو جائیگی۔

بہتر یہی تھا کہ بھوک کو برداشت کیا جاتا۔ اگر اماں اور ابا اُس وقت آکر کہیں کہ "محمود غصّے کو جانے دو . . . . . اگر کچھ کھاؤ گے نہیں تو بیمار ہو جاؤ گے اور اس سے ہمیں رنج ہوگا . . . . بس اب جانے دو۔ آئندہ ہم تمہیں ایسے سخت الفاظ نہ کہینگے" تو محمود ضرور مان جاتا اور فوراً کھانے کے کمرے میں چلا جاتا۔ انھوں نے ضرور کچھ نہ کچھ اس کے لئے اُٹھا رکھا ہوگا۔ آج تو کوفتے پک رہے تھے . . . . . محمود نے منہ میں جو پانی آگیا تھا اسے نگل لیا اور دروازے کے پاس جاکر والدہ کے آنے کی آہٹ سُننے لگا۔ ابا تو نہیں آئینگے۔ لیکن اماں شاید آجائیں اور منانے کی کوشش کریں . . . . . . . .

لیکن اماں نہ آئیں اور اسے بھوک لگ رہی تھی . . . . . . . دیر تک وہ ایک اُنگلی مُنہ میں لیکر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آخر کار اسے ایک خیال آیا جس سے اس تکلیف سے نجات ہو سکتی تھی۔ اسکے ایک ہم جماعت امتیاز نے اپنے بڑے بھائی کی اقلیدس کی کتاب بیچ کر اپنے لئے چاقو خرید لیا تھا . . . . . . .

محمود بھی اپنی کوئی کتاب بیچ کر بازار سے مٹھائی خرید سکتا تھا۔ سو یاں آج حلوائی تازی تیار کر رہا تھا . . . . . لیکن اسکا کیا حرج تھا۔ اُنہیں کا قصور تو تھا . . . . . . . آئندہ پھر کبھی وہ اس سے ایسا سلوک نہ کرینگے . . . . . . . .

اپنے بستے میں سے محمود نے ایک پتلی سی کتاب نکالی۔ اسکے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہوگی اور کچھ عرصے کے بعد اگر ہُوئی بھی تو خود ہی نئی خرید دینگے۔ اُس وقت تک وہ بھول چکے ہونگے کہ پہلے بھی ایک بار خریدی تھی۔ . . . . . اور اس نے اسکو بیچ ڈالنے کا ارادہ کرلیا۔

وہ سیدھے راستے سے باہر جانا نہ چاہتا تھا۔ . . . . . وہ سب خیال کرینگے کہ بھوک نے مجبور کردیا ہے اور اب من جانا چاہتا ہے۔ . . . . . اوں ہوں! اُدھر سے نہیں . . . . . .

اُس نے کتاب کو کوٹ کے نیچے چھپا لیا اور کھڑکی میں سے باغ میں کود گیا۔ شام ہونے کے قریب تھی۔ . . . . . . جلدی کرنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ دکانیں بند ہو جائیں . . . . . . . وہ ہوا کی طرح اُڑا اور بجائے سیدھے راستے سے جانے کے ایک مکان نیا بن رہا تھا جسکے احاطے میں بہت سے اینٹ پتھر بکھرے پڑے تھے۔ ان پر سے دوڑتا ہُوا گذرا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بوٹ کا تلا اُکھڑ گیا . . . . . . کوئی اور وقت ہوتا تو اسے افسوس ہوتا کیونکہ بوٹ لیکر دیتے وقت والد نے کہا تھا کہ اسے احتیاط سے استعمال کرنا . . . . . . لیکن اب اُسے پروا نہ تھی . . . . . . خود ہی نیا لیکر دینگے۔ ممکن ہے کہیں کہ بھیک مانگنے والوں کو بوٹ کی کیا ضرورت ہے . . . . . . اُس صورت میں ننگے پاؤں پھرنا ہوگا اور لوگ کیا کہینگے . . . . . . نہیں ضرور لے دینگے اُنہیں کی بدنامی تو ہے . . . . . . آخر کار بازار آگیا۔ اُفو! کس قدر شور ہے . . . . . . چلانا۔ جھگڑنا اور خدا جانے کیا کیا۔

"متھرا کے پیڑے! بھُنے ہُوئے میوے!" ایک شخص چلّا رہا تھا جس کے مُنہ پر کئی جگہ سیاہ دھبے پڑے ہُوئے تھے۔ ہاتھ میں چاقو تھا جس سے سنگھاڑے چھیل چھیل کر وہ سامنے ٹوکری میں رکھتا جا رہا تھا۔ اسکے الفاظ سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمام دنیا میں سب سے نایاب اور لذیذ شئے سنگھاڑے ہی ہیں۔ اس نے محمود کی طرف دیکھا اور پوچھا "لوگے؟ کھاؤگے اور یاد کروگے۔ متھرا کے پیڑے!"

محمود نے کہا "ابھی آکر لونگا۔ تھوڑی دیر میں"۔ اور بھیڑ میں سے گذرتا ہُوا کتب فروش کی دکان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ چلمن کے عقب سے گاہکوں کے انتظار میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی نظر محمود پر پڑی کہ جلدی سے گھبرایا ہُوا آرہا ہے تو جھٹ کرسی پر بیٹھ میز پر سے کتاب اُٹھا کر گویا پڑھنے میں منہمک ہوگیا۔

"کیا آپ کتابیں خریدتے بھی ہیں"؟

"کونسی کتاب بیچنا چاہتے ہو؟"

"ایشیا، افریقہ، اور امریکہ۔ بالکل نئی ہے،"

دوکاندار نے بے پروائی کے انداز سے کتاب کو ہاتھ میں لیکر کہا" اگر یورپ ہوتی تو میں لے لیتا، یہ تو پہلے ہی میرے پاس بہت سی پڑی ہیں"۔ کچھ ورق اِدھر اُدھر اُلٹ کر" اور ہے بھی پرانی ایڈیشن ——— اسکے چار آنے دے سکتا ہوں"

محمود نے ہلکی سی آواز سے کہا" مجھ سے تو آٹھ آنے میں بیچنے کو کہا تھا"

دوکاندار نے جمائی لی اور کتاب محمود کو واپس دیدی۔

"اچھا تو چھ آنے دیدیجئے۔ بالکل نئی ہے!"

دوکاندار نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چار آنے ہی سہی، لائیے"۔

دوکاندار نے ایک چوّنی میز پر رکھدی۔ کتاب کو لیکر بے پروائی سے میز پر ڈالدیا اور کہنے لگا"اس سے اچھے دام تمہیں کہیں نہ ملتے" اور وہ پھر اپنے مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔

محمود نے چوّنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا" شاید میں یورپ بھی لاسکوں!"

"ہاں لے آنا۔ لیکن اسی حالت میں ہونی چاہیئے۔ اس سے خراب ہوئی تو چار آنے بھی نہیں ملینگے"

"بہت اچھا!"

محمود کتب فروش کے یہاں سے نکلا اور بازار میں کھانیکی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ سنگھاڑے والے کی دوکان پر پہنچنے سے پہلے ایک حلوائی سے تین پیسے کی سِوّیاں اور ایک پھل بیچنے والے سے ایک آنے کی مونگ پھلی لے کر اس نے بڑے مزے سے کھائیں۔ پھر سنگھاڑے والے کے پاس پہنچا

"سنگھاڑے کیا بھاؤ دیتے ہو؟"

"دو پیسے کے پاؤ بھر۔ کابل کے بھُنے ہوئے میوے! کھاؤگے تو یاد کروگے!"

"اچھا لو یہ دو پیسے لیکن ذرا اچھے اچھے چھانٹ کر دینا۔

سنگھاڑے کھانے کے بعد اسے پیاس معلوم ہوئی۔ ایک دوکاندار نے پانی کے کھلے مُنہ کے مٹکے پر دو لکڑیوں کے سہارے برف کا بڑا سا ٹکڑا رکھ لیا تھا۔ تاکہ اُس پر ہر کسی کی نظر پڑے

اور پانی میں برائے نام زرد شکر ڈال کر اُسے میلا کر لیا تھا۔ اسکے گلاس بھر بھر کر لوگوں کو دے رہا تھا۔
"پیسے کے دو گلاس! پیسے کے دو گلاس! ٹھنڈے اور میٹھے۔ ایک پیسے کے دو گلاس!"
محمود نے دوسرا گلاس بڑی مشکل سے ختم کیا۔ گو بہت ٹھنڈا نہ تھا۔ اور میٹھا بھی ایسا ہی تھا۔
پھر بھی اسے چھوڑ دینا اچھا نہ معلوم ہُوا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اُسکی میز پر انگریزی مٹھائی کے چند ٹکڑے۔ دو اُبلے ہُوئے انڈے اور ایک گلاس دودھ کا رکھا تھا۔ ان میں سے مٹھائی اسے سب سے زیادہ بھاتی تھی۔ لیکن اسکی غیرت اسے کھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اُنہیں یاد نہ ہوگا کہ کتنے ٹکڑے انہوں نے میز پر رکھے تھے تو وہ ضرور ایک ٹکڑا کھا لیتا۔ . . . . . . اس نے ہر ایک ٹکڑے کی نچلی طرف سے تھوڑا تھوڑا حصّہ توڑ کر کھا لیا۔ اور ایک گھونٹ دودھ کا بھی پیا . . . . . . . بڑے مزے کا تھا. . . . .
لیکن . . . . . . نہیں۔ اور نہ کھانا چاہیئے . . . . . . . . .

اب مونگ پھلی سنگھاڑوں اور سویّوں نے اپنا اثر دکھلانا شروع کیا اور اسکے پیٹ میں کچھ گڑبڑ سی شروع ہُوئی۔ اس نے غصّے میں آکر "اُف۔ کیا بیہودہ ہے!" کہا اور بار بار کھڑکی سے باہر تھوکنے لگا۔

اصغری نے کمرے میں آکر پوچھا "تم کہاں گئے تھے؟"
"تمہیں کیا! میں لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ تمام دن کہاں رہتے ہیں؟"
اصغری کی نگاہ میز کی طرف گئی جہاں کھانے کی اشیاء رکھی تھیں۔
"اماں کہتی تھیں کہ تمہیں کچھ کھا لینا چاہیئے۔"
"مجھے کچھ ضرورت نہیں ہے . . . . . . . میں بھکاری ہوں۔ تم سب امیر آدمی ہو . . . .
تمہیں مجھ سے کیا واسطہ!"
"بہت اچھا تمہاری مرضی۔"
"بس اب جاؤ مجھے تنگ نہ کرو۔"
وہ مُسکرائی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔
محمود نے ارادہ کر لیا کہ اپنے "دشمنوں" کی تمام کوششوں کو اسی طرح سنگھاڑوں۔ اور

مونگ پھلی کی مدد سے بیکار ثابت کر دکھائیگا۔ اور خواہ اپنے حملوں کے لئے وہ کوئی طریقہ بھی اختیار کریں وہ کچھ نہیں کھائیگا۔

یہ ہی حالت خدا جانے کب تک قائم رہتی اگر ایک ناگہانی بات اس تمام سلسلے کا خاتمہ کر دینے کے لئے پیدا نہ ہوجاتی۔ محمود کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور دم بدم بڑھتا چلا گیا۔ وہ بستر پر اوندھا لیٹ گیا اور تکیئے میں مُنہ چھُپا کر کچھ عرصے تک اپنی تکلیف کو ضبط کئے رہا لیکن سنگھاڑے اور سوّیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔ آخر کار وہ کراہنے اور تکیئے کو ہاتھوں سے پیٹنے لگا۔

وہ بار بار کہہ اُٹھتا تھا "اُف کس قدر سزا مل رہی ہے" اور چار پائی پر لوٹتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ زور سے چلاّنے لگا۔ اسکے تمام "دشمن" سوائے اسکے والد کے جو ہوا خوری کے لئے گیا ہُوا تھا اس کی چار پائی کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ اسکی والدہ نے تھرما میٹر لگایا۔ بہن پاؤں کے تلوے سہلانے لگی۔ خادمہ نے کمرے میں انگیٹھی لا کر سینک کرنے کے لئے رُوئی کے ٹکڑے گرم کرنا شروع کئے اور نوکر ڈاکٹر کو لینے دوڑ گیا۔

ماں نے بہت خوف زدہ ہو کر پوچھا "محمود۔ محمود! کیا ہُوا تھا؟ تم نے کیا کیا تھا؟" اسے خیال ہُوا کہ کہیں غصے میں آکر کوئی زہریلی چیز نہ کھا گیا ہو۔

"محمود! میرے پیارے محمود! دیکھو اماں کو بتا دو۔ تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟ جلدی بتا دو"

"اماں! اوہ! اوہ! اُف! اماں میں نے ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ کو بیچ دیا......... اور سنگھاڑے خریدے.........."

"محمود کیا کہہ رہے ہو تم؟ میرے اللہ! یہ تو سرسام کی طرح بیہوشی میں باتیں کر رہا ہے۔ اصغری ابا کو بُلا بھیجو۔ کلب کو گئے ہونگے۔ میرے اللہ میں کیا کروں!"

اسکی والدہ نے اسکے اوپر جھک کر پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا اور گال پر بوسہ دیا۔ اسکی ہمشیرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ تمام کمرے میں بھاگی پھرتی تھی۔ بار بار کھڑکی میں سے جا کر دیکھتی تھی کہ ڈاکٹر آیا یا نہیں۔ آخر کار وہ آپہنچا۔

"تو بیٹا کہاں درد ہوتا ہے؟ ذرا سیدھے تو ہو جاؤ"

محمود اوندھا لیٹا ہُوا تھا۔ اب نہایت فرمانبرداری کے انداز سے سیدھا ہو گیا۔

"آج کیا کھایا تھا؟"

"اس نے آج کچھ بھی نہیں کھایا ڈاکٹر صاحب۔ جس وقت سے اسکول سے آیا ہے۔ ایک لقمہ تک نہیں کھایا" پردے کے عقب سے اسکی ماں کی آواز کہتے ہوئے سُنائی دی۔

"یہ اچھا نہیں کیا....... پھر بھی بتاؤ تو سہی۔ شاید بھولے سے کوئی چیز کھائی گئی ہو' دیکھو سچ سچ کہہ دو"

"ہاں میں نے سوّیاں کھائی تھیں اور سنگھاڑے....... میں نے ایشیا افریقہ اور امریکہ کو بیچ ڈالا......."

"کیا ہوا خیریت تو ہے؟" اسکے والد گاڑی سے اُتر کر جلدی جلدی چلتے ہوئے آئے۔ کلب میں فقط اتنی خبر پہنچی تھی کہ محمود سخت بیمار ہے۔

اسکے ایک گھنٹہ بعد تمام مکان میں چپ چاپ ہوگئی۔ محمود کو دو بار ڈاکٹر کی دوائی دی جا چکی تھی۔ اسکے پیٹ پر گرم روئی باندھ دی گئی تھی اور اسکی ماں اور ہمشیرہ پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی ہر ایک معمولی سے معمولی خواہش کی تعمیل بہت پھرتی سے ہوتی تھی۔

درد کو آرام ہو چکا تھا اور محمود کی ہر طرح تسلی ہو گئی تھی۔

عطاء الرحمٰن

---

# ناصبوری

ہر ایسا شخص جو پریشان و ناصبور ہو اس جانور کی مانند ہے جو ذبح کرنے کے لئے پکڑا جائے اور چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں پٹخے۔ یہی حالت اس شخص کی بھی سمجھنا چاہیئے جو مقید ہونے پر خلوت و جلوت میں گریہ وزاری کرے۔ یہ ذی شعور ہی کا حصہ ہے کہ جو افتاد ہو اُسکے آگے سر تسلیم خم کرے کیونکہ اسکے سوا چارہ کار کچھ نہیں +

(مارکس اری لس)

افضل حسین فاروقی
نظام کالج

# کاغذ کی ناؤ

دیکھو اماں! کیسی اچھی ہے مری کاغذ کی ناؤ
لے چلا ہے ساتھ اس کو مینہ کے پانی کا بہاؤ
بند کر دیتا نہ میں سب موریوں کے منہ اگر
کس طرح پانی سے بھر جاتا بھلا پھر سارا گھر
میری کشتی، تم ذرا دیکھو تو، اک چکر میں ہے
گو کہ دریا میں ہے لیکن پھر بھی گھر کے گھر میں ہے
مچھلیاں اس واسطے آنگن کے دریا میں نہیں
ڈر کے میری ناؤ سے ساری کی ساری چھپ گئیں

× × × × × × × × × × × × × ×

اچھی اماں! اب مجھے دریا میں جانے دو ذرا
اپنی کشتی کو مجھے خود ہی چلانے دو ذرا
جا رہا ہونگا میں جب کشتی سنبھالے دیکھنا
تم کہو گی "میرے ننھے ناؤ والے دیکھنا!"
میں کہونگا، "میری اماں! کس طرح دیکھوں اُدھر
کیا کروں گا ناؤ رستے سے بھٹک جائے اگر
دھیان بٹ جائے تو کشتی ڈوب جائیگی ضرور
بیٹھ کر کس چیز میں پھر جاؤنگا میں دور دور

× × × × × × × × × × × × × ×

اچھی اماں! اب مجھے دریا میں جانے دو ذرا
اپنی کشتی کو مجھے خود ہی چلانے دو ذرا
دیکھ لینا تم کہ اس دریا میں ڈدبوں گا نہ میں
اچھی اماں! دیر تک پانی میں کھیلوں گا نہ میں

---

## جرمنی کی تباہی

آہ سچ ہے کوہ کو بھی کاہ کر دیتا ہے تو
جرمنی کا حال جس نے بھی سُنا دِل ہِل گیا
جس بھرے گھر میں کہ تل رکھنے کی گنجایش نہ تھی
اُس بھرے گھر کی تباہی سے تجھے کیا مل گیا

کیا گٹے نیٹشے کا بھی تجھ کو نہ آیا کچھ خیال
اُف دماغ و دل جہاں کا خاک و خوں میں مل گیا
آتی ہے برلن کے ایوانوں سے اکثر یہ ندا
ہائے اِک شب ہی میں رنگِ صحبتِ محفل گیا

حامد اللہ افسر (میرٹھی)

# حیدر آباد دکن

## آرائشِ بلدہ اور تاریخی یادگاریں

دکن کی قدیم اسلامی سلطنت کا یہ دار الحکومت۔ حیدر آباد۔ اُسی موجودہ ریاست کا پایہ تخت ہے جس کی وسعت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ منماڑ کے راستہ سے تقریباً ۱۹ گھنٹہ ریل کا سفر کرنے کے بعد مسافر حیدر آباد پہنچتا ہے۔ اُدھر بمبئی کی طرف کئی گھنٹہ ریل کا سفر اسکے علاوہ ہے۔ اس وسعت کے لحاظ سے اس "ریاست" کو اگر اب بھی "سلطنت" کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ دکن کے اس عظیم الشان شہر کی مردم شماری پانچ لاکھ نفوس کے قریب ہے اس نظر سے یہ شہر ہندوستان میں کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس کے بعد چوتھے نمبر پر ہے اور اب بھی برابر ترقی کر رہا ہے اگر ترقی کی رفتار ایسی ہی رہی تو عجب نہیں کہ اگلی مردم شماری میں حیدر آباد مدراس سے سبقت لیجائے۔ موجودہ تاجدار دکن اور اُنکی "حکومت" کو اپنے دار الحکومت کی ترقی دینے کی طرف کامل توجہ ہے "آرائش بلدہ" کا مستقل محکمہ اسی واسطے قائم ہے کہ شہر کی ترقی کے ذرائع سوچتا رہے اور اُن پر عملدر آمد کرتا رہے۔ یہ محکمہ شہر میں نئی نئی کشادہ سڑکیں بنا رہا ہے، خوبصورت عالیشان بازار تیار کر رہا ہے جنکی شاندار دوکانیں بجساں ایک قرینہ سے چلی گئی ہیں اور اعلیٰ ایوان اور بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر کرا رہا ہے۔ پھر دوسری طرف غریبوں کے واسطے سستے کرایہ کے مکانات بنانے کی طرف بھی "آرائش بلدہ" مصروف نظر آتا ہے جن کی تعمیر میں حفظ صحت کے لحاظ سے ہوا اور روشنی کا کافی انتظام کیا گیا ہے اور پانی کے نل وغیرہ لگا کر رہنے والوں کی آسائش کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ یہ مکانات بارگوں کی صورت میں سڑکوں کے کنارہ خوشنما طریقہ پر تیار کئے جا رہے ہیں اور بعض جگہ مثلاً نام پلی اور چنچل گوڑہ میں ان مکانوں میں آبادی بھی شروع ہو گئی ہے۔ موسی ندی کے کنارہ ایک عالیشان خوبصورت شفاخانہ تیار کیا جا رہا ہے ہم سے کہا گیا ہے کہ اس کی تکمیل میں دس لاکھ سے زائد روپیہ صرف ہوگا۔ کفایت شعاری برتنے والوں کے واسطے سستے کرایہ کی سرائیں تیار کی گئی ہیں جو شان اور صورت کے لحاظ سے

نہایت خوشنما ہیں۔ سُنا ہے کہ انکا کرایہ چند آنہ روز سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر ایک جدید تعمیر آجکل کی فن تعمیر کی نظر سے اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی تیار کی جارہی ہے۔ تعمیر کے لحاظ سے حیدرآباد کو اعلیٰحضرت خسرو دکن کی سالگرہ سے بھی فائدہ پہنچا ہے اور باغ عامہ میں "مصنوعات ملکی کی نمائش" کے واسطے ایک عظیم الشان مستقل عمارت تیار کی جارہی ہے، جس کے واسطے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ کی بھاری رقم منظور کی گئی ہے" سالگزشتہ کے مضمون میں ہم حیدرآباد کے ہائیکورٹ باغ عامہ۔ عثمان ساگر کا عظیم الشان بند۔ حسین ساگر۔ ان تعمیروں کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ سُنا ہے کہ ایک اور بند تیار کیا جارہا ہے جو عثمان ساگر سے بھی زیادہ شاندار ہے جس کا نام حمایت ساگر رکھا گیا ہے مگر اس بند کو ہم نہیں دیکھ سکے۔ یہ تو زیادہ تر جدید تعمیریں ہیں۔ مگر قطب شاہی زمانہ کی قدیم تاریخی یادگاریں بھی حیدرآباد کی شان کو بڑھا رہی ہیں۔ مذکورہ مضمون میں قطب شاہی مقبروں۔ مکہ مسجد۔ قطب شاہی زمانہ کے بازار۔ چارکمان۔ اور چارمینار کے متعلق لکھا جا چکا ہے۔ ابکے حیدرآباد جاکر ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ حیدرآباد کے سکہ پر "چارمینار" کی تصویر ہے۔ اور اسی "چارمنار" پر آجتک قدیم اسلامی سلطنت کی رواداری کی یادگار۔ ایک مسجد اور ایک مندر موجود ہے مگر منار پر آجکل چڑھنے کی اس سبب سے ممانعت ہے کہ گردونواح کے پردہ نشین مکانوں کی بےپردگی نہ ہو۔ اس مرتبہ ہم نے "فتح میدان" دیکھا یہ ایک تاریخی "میدان" ہے جہاں عالمگیر نے ابوالحسن تاناشاہ پر فتح پاکر دکن کی فتح کا جشن منایا تھا۔ اسی میدان میں اب فوجی کرتب۔ پولو۔ ہاکی۔ فٹ بال۔ کرکٹ وغیرہ ہوتے ہیں۔ جن کے دیکھنے کو اس میدان کے کنارہ پر ایک خوشنما عمارت بنی ہُوئی ہے۔ ہمارے قیام کے زمانہ میں اس میدان میں اعلیٰحضرت نظام کی فوج نے عالمگیر اور تاناشاہ کی لڑائی کی نقل دکھائی تھی "فتح میدان" کے پاس ہی "نوبت پہاڑ" ہے جس پر فتح کی خوشی میں عالمگیر نے نوبت بجوائی تھی +

# تعلیمی چہل پہل

## ۱۔ کتب خانہ

معلوم ہوتا ہے کہ سالار جنگ اول کے زمانہ سے حیدرآباد والوں کو علمی باتوں کی طرف توجہ رہی ہے، سُنا ہے کہ اُس وقت یہاں مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا ایک بے نظیر کتب خانہ تھا۔ اُن کے بڑے

بھائی مولوی سید حسین بلگرامی کا ذاتی کتب خانہ بھی نایاب کتابوں سے لبریز تھا۔ سرکاری "کتب خانہ آصفیہ" ایک اچھے پیمانہ پر اُسی زمانہ کی یادگار موجود ہے، جس کا مستقل عملہ الگ ہے۔ نواب سرور جنگ بہادر کا کتب خانہ جو نواب صاحب نے اپنے مرحوم چھوٹے بیٹے کے یتیم بچّوں کو دیدیا ہے گو کچھ منتشر حالت میں ہے مگر اُسی میں بعض نہایت عُمدہ کتابیں اور بعض علوم کا اچھا ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانہ میں ہم نے "شیخ بو علی سینا کی کلیات" کا ایک قلمی نسخہ دیکھا جس میں اقلیدس کے پندرہ مقالے موجود ہیں۔ یہاں ایک کتاب قلمی طلائی جدول کی دیکھنے میں آئی جس میں "شیر پنجاب" مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کُل فوجی افسروں کے نام معہ شرح تنخواہ لکھے ہُوئے ہیں، یہ کتاب سکھ سلطنت کے ایک مسلمان فوجی دفتر کے اہلکار کے قلم کی لکھی ہُوئی ہے جو اُسی دفتر کے واسطے تیار کی گئی تھی۔ اس کتب خانہ میں علم حدیث کی ۲۷۹ کتابیں تفسیر کی ۱۲۹ کتابیں اسماء الرجال کی ۴۱ کتابیں اور فقہ کی تین سو سے اوپر کتابیں ہیں ان میں اکثر کتابیں قلمی ہیں۔ قدیم اسپین اور اٹلی کی معاشرت، تعمیرات اور فنون لطیفہ کی رنگین تصویروں کے بڑے بڑے البم ہیں جن میں ان تصویروں کے حالات چھپے ہُوئے موجود ہیں، انگریزی، فرنچ اور دوسری یورپین زبانوں کی کتابوں کا ایک مختصر ذخیرہ ہے۔ غرض یہ کتب خانہ کتابوں کا اچھا مجموعہ ہے۔ موجودہ اعلیحضرت خسرو دکن اور اُنکی "حکومت" کی فیاضی سے حیدرآباد میں ایک اور بینظیر کتبخانہ مرتب کیا جا رہا ہے اور یہ "جامعہ عثمانیہ" کا کتب خانہ ہے۔ جس کے واسطے ایک لاکھ روپیہ سردست منظور کیا گیا ہے۔ پچیس ہزار روپیہ سالانہ ملنا شروع ہو گیا ہے اور کتب خانہ کی ترتیب جاری ہو گئی ہے۔

## ۲۔ تعلیمگاہیں

اسی عنوان کے تحت میں سب سے اول ہم "جامعہ عثمانیہ" کا تذکرہ کرینگے جو اس لحاظ سے تمام ہندوستان میں اپنی آپ ہی نظیر ہے کہ اُس کا خاص تعلیمی وسیلہ اُردو زبان ہے۔ اور یہ "جامعہ" تمام جدید سائینس اور نئے علوم و فنون جدید، فلسفہ اور معاشیات کی تعلیم ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو میں دے رہی ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین فن تعلیم اس پر متفق ہیں کہ کسی ملک میں تعلیم کی طرف عام میلان پیدا کرنے اور ملک والوں کو عام شوق پیدا کرنے کے واسطے ضروری ہے کہ تعلیم اُسی زبان میں ہو جو ملک کی عام زبان ہو۔ ایسی تعلیم "قومی تعلیم" کہلائے جانے کی مدعی ہو سکتی ہے۔ نہ کہ

ایک بالکل غیر اور اجنبی زبان کی تعلیم جیسی کہ ہندوستان میں سرکار کی طرف سے دی جارہی ہے ملک کو ملکی زبان میں تعلیم دینا۔ یہ ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ملک بھر میں اعلےٰ علوم اور فنون کا چرچا۔ قومی خودداری کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے۔ عام طور پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہی وہ طریقہ ہے جسکے ذریعہ سے ایسے مفید علما پیدا ہو سکتے ہیں جو علوم مغربی اور جدید سائنس اور فلسفہ کے اعلےٰ ماہر ہونے کے ساتھ ہی متانت ادب، اور تہذیب مشرق کا بہترین نمونہ ہوں جن کو ملک اور قوم سے محبت ہو، اور قوم کو اُن سے سچی اُلفت ہو۔ یہ ہی وہ طریقہ ہے جس کا ابتدا میں ہندوستانی مسلمانوں کے گزشتہ صدی کے مسلمہ تعلیمی رہنما سرسید احمد خان علیہ الرحمۃ کو "اُردو یونیورسٹی" کی صورت میں خیال پیدا ہوا تھا مگر قوم کی بے توجہی اور کافی سرمایہ نہ ہونے کے سبب سے اُس بوڑھے قومی دلسوز نے اس خیال کو چھوڑ دیا اور سرکاری یونیورسٹی کے ماتحت "مدرسۃ العلوم" قائم کرنیکی طرف متوجہ ہو گیا جو اب "مسلم یونیورسٹی علیگڈھ"، کے نام سے جاری ہے۔ گو سرسید احمد خاں "اُردو یونیورسٹی" کی حسرت دل میں لیکر دُنیا سے چلے گئے۔ مگر خدا نے تاجدار دکن کے ذریعہ سے اُس بُوڑھے ماہر تعلیم کی یہ آرزو حیدرآباد میں "جامعہ عثمانیہ" کی صورت میں پُوری کر دی جسکو شاید انگریزیت کے دلدادہ "عثمانیہ یونیورسٹی" کے نام سے بہتر سمجھ سکیں۔ صرف پانچ برس کے عرصہ میں "جامعہ عثمانیہ" نے ایسے گریجوایٹ تیار کر دیئے ہیں جنہوں نے "اُردو" میں مغربی علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی ہے اور جنکی قابلیت کسی طرح ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے تعلیمیافتوں سے کم نہیں ہے۔ اسی سبب سے اس تھوڑے عرصہ میں "جامعہ عثمانیہ" نے اپنی ہمعصر یونیورسٹیوں میں بھی امتیاز حاصل کر لیا ہے اور حیدرآباد کی اس تعلیمگاہ کی سندیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی۔ اور لکھنو یونیورسٹی نے تسلیم کر لی ہیں اور ان سندوں کو گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی مان لیا ہے۔ اسکے علاوہ انگلستان میں۔ مینچسٹر یونیورسٹی۔ بھی "جامعہ عثمانیہ" کی سندوں کو مانتی ہے۔ جرمنی کی گیوٹنگن یونیورسٹی نے اسکی ڈگری کو تسلیم کر کے اپنے دارالعلوم میں جامع عثمانیہ کے ایک طالب علم کو داخل کر لیا ہے جو وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیکو گیا ہوا ہے۔ اعلیٰ حضرت نظام کی گورنمنٹ کو اپنے دارالعلوم کی تعلیم کا درجہ بلند کرنے اور اُس کی ترقی کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ اسکے بعض پروفیسر۔ انگریزی۔ طبیعیات۔ اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنیکو یورپ گئے ہوئے ہیں جنکا کل خرچ اعلیٰ حضرت کی حکومت کی طرف سے دیا جارہا ہے جو واپسی کے بعد اُنکی تنخواہ میں وضع ہو جائیگا اور دوران تکمیل تعلیم کی اُنکو نصف تنخواہ ملیگی +

اس دار العلوم کے علاوہ اعلیٰ حضرت نظام کی گورنمنٹ نے بلدۂ حیدرآباد میں اور بھی تعلیمگاہیں کھول رکھی ہیں۔ یہاں قدیم نظام کالج ہے جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق ہے جو لوگ انگریزی یونیورسٹی کی خشک تعلیم کے شوقین ہیں اُنکے واسطے اس کالج میں تعلیم کا انتظام ہے۔ پھر "جامع عثمانیہ" کے متعلق حال میں ایک انٹرمیڈیٹ کالج بلدہ میں کھولا گیا ہے۔ ہمکو معلوم ہُوا ہے کہ پائے تخت حیدرآباد کے علاوہ ممالک محروسہ اعلیٰ حضرت نظام کے دوسرے اضلاع اور مفصلات میں بھی جا بجا اسکول موجود ہیں، اسی سال اورنگ آباد میں بھی ایک کالج کھولا گیا ہے۔ سُنا ہے کہ بلدہ میں تعلقہ داروں کے بچّوں کے واسطے ایک علیحدہ کالج قائم کرنیکا خیال ہو رہا ہے۔ ادھر عملی تعلیم کی طرف بھی توجہ ہے۔ بلدہ کے میڈیکل سکول کو میڈیکل کالج بنا دیا گیا ہے انجینیرنگ سکول الگ اپنے کام میں مصروف ہے۔ اعلیٰ حضرت نظام کی گورنمنٹ کو اپنی قلمرو میں تعلیم پھیلانے کی توجہ کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس گورنمنٹ نے اپنے خاص ناظم تعلیمات کو جاپان اس غرض سے بھیجا کہ وہاں کے تعلیمی نظام کی بابت خود مشاہدہ اور تحقیقات کر کے رپورٹ کرے۔ چنانچہ ناظم موصوف نے جاپان سے واپس آکر ایک نہایت پُر از معلومات رپورٹ اپنی حکومت کے سامنے پیش کر دی ہے جو کتاب کی صورت میں انگریزی میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے جو ہم نے دیکھی ہے سُنا ہے کہ یہ رپورٹ اُردو میں بھی چھپ رہی ہے۔

# ۳۔ جامع عثمانیہ کے ملحقات

## (الف) شعبہ تالیف و ترجمہ

جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی ملحقات میں "شعبہ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی" عام علمی نظر سے عموماً اور اردو زبان کی نہایت اہم خدمت کی نظر سے نہ صرف ممالک محروسہ اعلیحضرت خسرو دکن بلکہ تمام ہندوستان کے واسطے خصوصاً بے مثل اور نہایت مفید شعبہ ہے جس کا اولین فرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے واسطے اردو زبان میں اعلیٰ تعلیمی نصاب تیار کرے یہ شعبہ پوری توجہ سے اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہے۔ ہم نے ۱۳ مارچ کو اس شعبہ کے دار الترجمہ کی سیر کی، ہم نے دیکھا کہ نہایت سلیقہ سے جا بجا میزوں پر مطبوعہ ترجموں کے مختلف حصّے چُنے ہُوئے تھے جن پر مطبوعہ چِٹیں لگی ہُوئی تھیں، چونکہ

پر کتاب مصنف اور مترجم یا مولف کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کُل مطبوعہ کتابیں ہر علم کی الگ الگ الماریوں میں قرینہ سے لگی ہوئی تھیں۔ ہمکو جو وہاں اس شعبہ کی مطبوعات کی چھپی ہوئی فہرست دی گئی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ایکسو۱۹ نو کتابیں تیار ہو چکی ہیں جن میں بعض نہایت دقیق علوم کی اور بعض بڑے بڑے چوٹی کے مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ اس شعبہ نے ابتک جو کتابیں شائع کی ہیں اُن میں تاریخ۔ ریاضی۔ منطق۔ سائنس۔ معاشیات۔ فلسفہ، اور قانون کی کتابیں ہیں۔ کتابوں کی اہمیت ظاہر کرنے کے واسطے ہم چند علوم کی کتابیں بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں مثلاً۔ طبیعیات میں، علم نور۔ علم حرارت۔ علم آواز علم مقناطیس۔ تاریخ میں گرین کی "شارٹ ہسٹری آف دی انگلش پیوپل" کا ترجمہ۔ کامل ابن رشد کا ترجمہ مقریزی کی "نفح الطیب"۔ سیاسیات میں لیکاک کی "ایلیمنٹس آف پولیٹیکل سائنس" کا ترجمہ "علم سیاسیات" وقس علیٰ ہذا ہم سے کہا گیا کہ تیار شدہ کتابوں کے علاوہ اس وقت ۳۹ کتابیں اور ترجمہ ہو رہی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں۔

اس شعبہ کے متعلق ایک کمیٹی "وضع اصطلاحات" ہے جو ایسی اصطلاحیں اُردو زبان میں بناتی رہتی ہے جن کے واسطے ہماری بولی میں ابتک الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس کمیٹی میں جامعہ عثمانیہ کے تمام پروفیسروں کے علاوہ بعض اور بھی مشہور اُردو کے ادیب اور علماء ہیں، اس کمیٹی کے مختلف حصے جُدا جُدا علمی شعبوں کی اصطلاحیں وضع کرنے پر تقسیم ہیں۔ یہ کمیٹی ابتک پانچہزار اصطلاحیں وضع کر چکی ہے۔ ہم نے خود طبیعیات کیمیا کی شاخ وضع اصطلاحات کا اجلاس ۱۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو دیکھا اُس وقت "پارلیمنٹ" کا ترجمہ زیر بحث تھا۔ اور غیور ممبران کمیٹی اسکے واسطے مناسب لفظ کے تجسس میں مصروف تھے۔ دار الترجمہ کے ایک ہند و معزز اہلکار نے جنکا نام جانکی پرشاد ہے "جدید مصطلحات عثمانیہ" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے جس میں "کمیٹی وضع اصطلاحات" کی بنائی ہوئی تمام اصطلاحیں درج کر دی ہیں اس سے اُس علمی شغف کا پتہ چلتا ہے جو "جامعہ عثمانیہ" کی بدولت پیدا ہو چلا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا اپنا مطبع موجود ہے جس کے پاس خود جامعہ کا اتنا کام ہے کہ باہر کا کام لینے کی اُسکو مطلق فرصت نہیں ہوتی۔

## (ب) رصد گاہ

"جامعہ عثمانیہ" کا دوسرا اہم ملحقہ شعبہ رصد گاہ ہے جس میں اجرام فلکی کے مشاہدہ کے واسطے عظیم الشان دو دُوربینیں نصب ہیں اور ایک آنے والی ہے۔ ایسی جتنی دُوربینیں دُنیا بھر میں ہیں وہ

سب ایک منتظم جماعت کی صورت میں ایک دوسری سے وابستہ ہیں اور سب نے آسمانی ٹکڑوں کو پیمائش کے واسطے تقسیم کر رکھا ہے اور مقررہ ٹکڑے کے اندر کے ستارے اُنکی دریافت اور اُنکے نام مقرر کرنا ہر دوربین کا کام ہے۔ حیدرآباد کی دوربین کے متعلق بھی آسمان کا اٹھارھواں حصّہ ہے اس میں سے نصف پیمائش ختم ہو چکی ہے اور قریباً چار لاکھ ستارے معلوم کر کے اُنکے نام رکھے جا چکے ہیں یہ تمام کام آٹھ برس کی کارگذاری ہے۔ یہ رصدگاہ پہلے سے قائم ہے جامعہ عثمانیہ کے ظہور میں آنے پر اس کا الحاق کے سبب سے جامعہ عثمانیہ اپنی ہمعصر ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اکثر سے سبقت لے گئی ہے۔ ۲۳ جنوری ۱۹۲۴ء کو ہم نے پروفیسر قاضی محمدؐ حسین صاحب کے ہمراہ اس رصدگاہ کو دیکھا جنھوں نے نہایت مہربانی سے اسکو دکھانے اور اسکے متعلق عالمانہ نکات بیان کرنے میں اپنے بیش قیمت وقت کا بڑا حصّہ صرف کیا جس کے واسطے ہم پروفیسر صاحب کے بہت مشکور ہیں، یہ رصدگاہ مسٹر بھاسکرن ناظم رصدگاہ کے چارج میں ہے۔ جو اپنے خاموش علمی کام اور اجرام فلکی کے مشاہدے اور اُسکے متعلق سوچ بچار میں مصروف رہتے ہیں، ناظم صاحب موصوف نے بڑی مہربانی سے اپنے شعبہ کی ہر چیز دکھانے اور اُسکی کیفیت بیان کرنے میں کئی گھنٹہ صرف کئے اُنکی یہ عالمانہ مہربانی ہمیشہ یاد رہیگی۔ اس دوربین میں ہم نے منجملہ اور اجرام سماوی کے "شعرے" ستارہ دیکھا یہ عظیم الشان ستارہ اپنے نظام فلکی کا ایک سورج ہے اور ہمارے سورج سے کئی گنا بڑا ہے ہماری زمین سے آفتاب اور شعرے کے فاصلہ اور اُسکے فرق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سورج کی روشنی زمین پر ساڑھے آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے اور شعرے کی روشنی زمین تک پہنچنے کے واسطے ساڑھے چھ برس کی مدت درکار ہوتی ہے" شعرے" کی روشنی جو ہم نے دوربین میں دیکھی اُس میں اور سورج کی روشنی میں نمایاں فرق معلوم ہوا شعرے کی روشنی میں چوندھیا دینے والی چمک نہیں تھی بلکہ چاند کی روشنی کی طرح خوشنما مگر چاند کی روشنی سے بہت زیادہ صاف شفاف روشنی تھی یہ وہی شعرے ستارہ ہے جسکو قدیم زمانہ کے عرب پوجتے تھے اور جن کے عقیدہ کی تنقیص کے واسطے اور خالق اکبر کی عظمت کے اظہار کی غرض سے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے" انہ ہو ربّ الشّعرے" "حقیقت میں وہ وہی شعرے کا (بھی) رب ہے" (قرآن مجید سورۂ نجم) ہم نے جتنی دیر اس آبزرویٹری کے ذریعہ سے اجرام فلکی کی سیر کی اتنی ہی اُس خلاق بے نظیر کی عظمت اور جلال اور مخلوق کی بے بسی کا خاکہ برابر ذہن نشین ہوتا رہا کہ کس طرح اُس عظیم الشان قدرت والے رب نے اس بڑی

سے بڑی حیرت خیز آسمانی مخلوق۔ ستاروں کو ایک خاص فطرت کے اندر جکڑ دیا ہے جو متانت اور خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں "ابر و باد و مہ و خورشید فلک در کار اند" اسی نظام سماوی میں ستاروں اور سیاروں کے انضباط کو قرآن مجید میں نہایت مختصر جملہ میں کس خوبی سے بتایا گیا ہے "کل فی فلک یسبحون" کیا دنیا میں کوئی ہیئت دان ہے جو اس مختصر آیت کے خلاف ثابت کرسکے کیا کوئی ستارہ یا سیارہ ہے جو اپنے دائرہ کے باہر ایک انچہ ہٹ سکے اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہر آسمانی مخلوق اُسی فطرت کی پابند ہے جو اُسی فاطر سماوات نے اُسکے واسطے مقدر کر رکھی ہے "سبحان الملک القدوس" ہیئت کا جدید نظریہ ہے کہ فضائے محیط میں بیشمار مختلف گیسوں کے ذخیرے اُڑتے پھرتے ہیں یہ ہی گیس ہیں جو لاکھوں برس کے خاص چکر کے بعد ٹھوس ہو کر ستارہ بن جاتی ہیں اور پھر ایسے ہی طویل مُدت کے بعد یہ ستارے گیس کی شکل میں منتقل ہو جاتے ہیں یہ قدرتی کھیل لاانتہا مُدت سے جاری ہے اور لاانتہا مُدت تک جاری رہیگا، ہماری یہ زمین بھی ایسی ہی گیس کی شکل میں تھی جو اب ٹھوس ہے اور غیر معلوم مدت کے بعد پھر ایسی ہی گیس کی صورت میں منتقل ہو کر فضائے محیط میں اُڑتی پھریگی، ان گیسوں کو "بنولا" کہتے ہیں، ہم نے اس آبزدوبڑی میں ایک بنولا بھی دیکھا جو چار ستاروں کے درمیان قریب قریب چوکور مگر بغیر کونوں کے پھیلا ہوا تھا جسکی ایک طرف باہر نکلی ہوئی تھی اس مخلوق کو دیکھنے اور اسکے حالات پر غور کرنے سے حیرت انگیز طور پر قرآن مجید کی ایک آیت کی حقیقت ظاہر ہو گئی جہاں کہا گیا ہے "یوم تبدل الارض غیر الارض" "جس روز زمین دوسری زمین سے بدلی جائیگی" (سورہ ابراہیم) کیا بنولا کا مذکورہ بالا نظریہ اس آیت میں اب سے تیرہ سو برس پہلے نہیں بیان کیا جا چکا ذرا اسکے ساتھ سورہ قارعہ کی وہ آیت ملاؤ جس میں کہا گیا ہے کہ "ہو جائینگے پہاڑ مثل دھنی ہوئی روئی کے" اب ذرا زمین کی تبدیلی والی آیت پر غور کرو۔ دھنی ہوئی روئی ہوا میں اُڑتی پھرنا گیس کی شکل کے بنولا کو صاف طور پر ظاہر کرتا ہے۔ تبدیل زمین سے کھلے طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسکی جگہ کوئی اور بنولا ٹھوس ہو کر قائم ہو جائیگا۔ یہ علمی حقائق ہیں جنکی رہنمائی بنی آدم کو تیرہ سو برس پہلے عرب کے میدان میں ایک سچے پکارنے والے کی آواز سے معلوم ہو چکے تھے جس کے پاس نہ کوئی رصدگاہ تھی نہ دوربین تھی اگر تھا تو خالق اکبر کا عرفان تھا جس سے تمام علوم روشن ہو گئے اور آج ہیئات کا مشاہدہ اُسکی تصدیق کر رہا ہے اور اُن حقائق کی ایک جھلک حیدرآباد دکن میں وہاں کی رصدگاہ میں نظر آجاتی ہے حیدرآباد کی رصدگاہ کی بعض گھڑیاں شمسی وقت بعض ہماری زمین کے وقت سے ملی ہوئی ہیں اور بعض خاص خاص اجرام فلکی کے اوقات بتاتی ہیں +
حال ہی میں اس رصدگاہ میں "زلزلہ نما آلہ" کا اضافہ کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی ترقی کی رفتار رکی نہیں ہے +

(باقی آئندہ)

محمد موسیٰ (دتاؤلی)

# ماںؔ کی محبت کا صلہ

سلیقہ شعار نوجوان مالن شوق اور سرگرمی کے لحاظ سے پیرس کے خاص حلقوں میں مشہور تھی وہ غریب تھی مگر خوشنما مختلف اللون تختہائے گل کی مالکہ تھی جن کی ترتیب اور پیداوار میں میری بسنت کی آغاز جوانی کی امنگوں اور مذاق شعری کو بڑا دخل تھا۔ وہ لوگ جنہیں کبھی میری کے باغیچہ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا اس کی نفاست پسندی اور خوش ترتیبی کے مدّاح تھے۔ یہ باغ شہر کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔

---

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک بگّی تیزی سے آئی اور مالن کے دروازہ پر ٹھیر گئی۔ اس سے ایک خوبصورت مُسن خاتون، ایک ہنس مُکھ دوشیزہ کے ساتھ برآمد ہوئی۔ یہ بیگم مارکوئس اور انکی چاہتی لڑکی تھیں۔

بیگم:۔ کنواری مالن"، "میری لڑکی کی کل شادی ہے زینتِ لباس کے لئے ایک سفید گلاب کی ضرورت ہے سُنتی ہوں کہ تمہارے .........." "ہاں بیگم" میری نے جلدی سے کہا "اسوقت دو پھُول ٹہنی پر موجود ہیں"

بیگم:۔ کیا میں دیکھ سکتی ہوں" "بخوشی" مالن نے جواباً کہا اور اپنے معزز مہمانوں کو گلاب کی خوشنما کیاریوں تک لیگئی جہاں دو ادھ کھِلے پھُول قدرے لمبی ٹہنی پر کھُلی فضا میں ہچکولے کھا رہے تھے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔

"کیا مجھے یہ دونوں مل سکتے ہیں"۔ بیگم نے دریافت کیا۔

"نہیں بیگم" "ایک کا میں حتمی وعدہ کر چکی ہوں"

"اچھا تو مجھے ایک ہی دیجئے گا مگر ضرور" بیگم نے کہا "قیمت کیا ہوگی؟"

"دو لوئس" (فرانسیسی سکّہ)

مسز مارکوئس نے قیمت ادا کرتے وقت کہا "علی الصباح میرے بنگلہ پر جو "او فرسٹ ہانور"

میں واقع ہے پہنچا دیجئے"

"بسرو چشم" جوان مالن نے خوش اخلاقی سے جھک کر کہا اور اپنے محترم گاہکوں کو دروازہ تک لیگئی اور رخصت کیا۔

---

"میں کیسی خوش نصیب ہوں" لڑکی نے خیال کیا "چالیس فرانک، زمیندار کا کرایہ شاید اس رقم کی مدد سے بیباق ہوجائیگا"........ "اور میں اپنے آپکو آبائی مسکن سے نکالے جانیکی ذلت سے بچاسکونگی" "پیاری اماں" یتیم لڑکی نے محبت آفرین لہجہ میں آہستگی سے کہا "تم جنت الماویٰ کے موتی محل میں بیٹھی میری حفاظت اور نگہبانی سے غافل نہیں ہو"

---

میری کی ماں کو مرے ایکسال ہوگیا تھا اور آج اس کی برسی کی پہلی رات تھی، جب رات کی تاریکی نے فضائے بسیط پر قبضہ کرلیا اور عالم میں سناٹا چھاگیا۔ میری اپنی ماں کے آخری وقت کا خیال کر کے رونے لگی۔

وہ ایک جاڑے کی رات تھی جب میری مرنے والی ماں کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اُس نے دبی زبان سے مگر شیریں لہجہ میں پوچھا "میری پھول زندہ ہیں؟" "ہاں اماں" لڑکی کا جواب تھا "اچھا۔ تو توڑ لاؤ میں ان کا آخری دیدار کرلوں" میری گئی اور ایک ٹہنی توڑ لائی جس میں دو پھول سفید گلاب کے لگے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر نے یہ کہہ کر کہ اس کا سونگھنا مضر ہے لڑکی کو ماں کے ہاتھ میں دینے سے منع کیا۔

"کچھ فکر نہیں" اُسکی ماں نے کہا "یہ مجھے لڑکی کی طرح پیارے ہیں۔ میری مجھے ایک دیدو اور اسے میرے ساتھ ہی دفن کیجئو۔ کچھ دیر بعد اُسکی روح پرواز کرگئی۔ پھول اُسکے ہاتھ ہی میں تھا۔ در تابوت میں رکھنے سے اُسکی پتیاں نعش پر بکھر گئی تھیں۔ جب نعش گور کے سپرد کردیگئی میری نے خاک کے تودے پر ہاتھ رکھکر صمیم قلب سے اپنی ماں سے عہد کیا کہ آئندہ فصل کے موقع پر ایک پھول تمہاری نذر کرونگی..................

میری کی وہ رات عبادت میں بسر ہوئی دوسرے روز وہ حسب معمول اپنے کاموں میں مشغول

ہوگئی کچھ دیر بعد اُسے یاد آیا کہ "میں نے مسز مارکوئس سے پھُول پہنچانیکا وعدہ کیا ہے تیز قدمی سے پھُول کے پودے کی طرف گئی ابھی قریب بھی نہ پہنچی تھی کہ ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی اسکے چہرے کا رنگ فق ہوگیا جب اس نے دیکھا کہ ایک پھول طوفانی رات کا مقابلہ نہ کرتے ہُوئے اپنی ہستی کو مٹا چکا ہے۔ میری گرے ہُوئے پھُول کی ٹھٹھری ہُوئی پتیوں کو مایوسی کے عالم میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ زمیندار بھی آ پہنچا میری نے اسکی طرف متوجہ ہو کر تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ "افسوس! میں آج کرایہ کی ادائیگی سے معذور ہوں"

"سفید جھوٹ" مالکِ زمین نے کہا اور بتلایا کہ کل تمہیں دو لوئس کی آمدنی ہُوئی ہے۔ لڑکی نے کہا "آپ سچ فرماتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے وہ آمدنی واپس کرنا ہوگی جس پھُول کی میں نے قیمت وصول کی ہے طوفانِ آب و باد کے نذر ہوگیا ہے"

"خیر اس دوسرے پھُول کو بھیجدو" مالک نے کہا۔

"نہیں یہ تو کسی قیمت پر بھی نہیں دیا جاسکتا۔ اگر دنیا کی تمام سونے کی کانیں اسکے عوض دیجائیں تو میں ہرگز قبول نہ کرونگی کیونکہ یہ پھُول "موعودہ" ہے۔

مالک مکان :- "اچھا تو تم اپنی روانگی کی تیاری کرو" "میری زمین کے ایک چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کو بھی کوئی بلا معاوضہ استعمال نہیں کرسکتا"

"جناب کے حکم کی تعمیل ہوگی" لڑکی نے دھیمی آواز سے کہا اور مالک بڑبڑاتا ہُوا چلا گیا

---

جب بیگم مارکوئس کو قیمت واپس ملی تو وہ جھلائی ہُوئی میری کے باغ میں پہنچی۔ نوکروں نے بتلایا کہ وہ ابھی اس طرف ہاتھ میں ایک پھُول لیکر گئی ہیں۔ بیگم نے رُخ پھیر کر دیکھا کہ لڑکی جلدی جلدی کہیں جارہی ہے فوراً بگی کو اس کے پیچھے پیچھے روانہ کیا۔ لڑکی گورستان میں داخل ہُوئی اور اپنی ماں کی قبر پر دوزانو ہوکر پھُول کو لگاتے ہُوئے کہا۔ "اماں جان! اپنی غریب لڑکی کی اس ناچیز یادگار کو قبول کرو یہ اس پودے کا پھُول ہے جو تمہیں آخری دم تک عزیز تھا اسے میں نے صرف تمہارے لئے پرورش کیا ہے اماں! اس سخت وقت میں مرے ناموس کی حفاظت کرو!" اس جملے پر پہنچکر میری کی زبان بھرا گئی اور قطراتِ اشک سلک دار زمین پر بکھرنے لگے

یہ دیکھ کر بیگم مارکوئس ہمدردی کے جوش سے کانپ گئیں اور باچشم پرنم واپس ہوئیں۔

دوسرے دن لڑکی زمیندار کے حکم کے موافق نقل مکان کی تیاری کرنے لگی نوکروں نے پوچھا "آپ کہاں جارہی ہیں"۔ "مجھے مجبوراً جانا پڑتا ہے" میری نے کہا "کیوں" نوکروں نے پوچھا "چونکہ میں اس زمین کا کرایہ ادا کرنے سے فی الحال معذور ہوں" میری کا جواب تھا۔

نوکر "لیکن تمہارے لئے تو دو سال کا کرایہ پیشگی ادا کردیا گیا ہے"

میری "یہ کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ میں نے ادا نہیں کیا ہے"

"خیر غیر ممکن ہی سہی مگر اس رسید کو رکھ لیجئے" وہ متحیر تھی اور غیر مطمئن کچھ وقفہ کے بعد ایک خوش پوش ملازم نے دوسو کا ایک چک اور ایک چٹھی میری کو پیشکش کی چٹھی ختم کرنیکے بعد میری کے چہرہ پر اطمینان اور خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ چٹھی کی مندرجۂ ذیل عبارت سے واقعہ روشنی میں آجاتا ہے۔

"یتیم لڑکی!

میں جانتی ہوں کہ تم اس پھول کو جسے میں نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے پسند کیا تھا اپنی ماں کی نذر کرچکی ہو۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں بلکہ میں تمہیں تمہاری محبت فرزانہ پر قابل مبارکباد سمجھتی ہوں اور بہرحال تمہاری مدد کا خیال رکھونگی انشاء اللہ لڑکی کی شادی کی تقریب پر دو سو ۲۰۰ لوئس کی حقیر رقم پیش خدمت ہے امید کہ شرف قبولیت بخشوگی"

خادمہ۔ مسز مارکوئس

ترجمہ عبد الستار فاروقی

# دفینے

**ندائے شباب**۔ ہندوستان ترقی کیوں نہیں کرتا؟ کیسے کرے جب کہ وہ گلابی گال جنکے لئے جوانی کھونا ثواب ہو، جن کا تصور عمر بھر کے لئے شغل ہو، جنکے لئے موت کو کھیل سمجھا جائے، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قید ہوں۔ قید نہیں زندہ در گور، کفن پردہ میں دفن۔

اُمنگ پیدا ہو تو کس کے لئے؟ کوئی کچھ کرکے دکھائے تو پائے کیا؟ وہ مہ جمال جنکی جنبشِ مژگاں اقلیم دل کو زیر وزبر کردے، جن کا ادنےٰ اشارہ لکھنئو کو خیبر میں بدل دے، بے خبر ہیں۔ بے بس ہیں، بے حس ہیں،

اے ہند! نگورہ کا چاند بادل سے نکل چکا مصر کی زلیخائیں روز روشن میں لب بام جلوہ افگن ہیں مگر تیری پدمنیاں ابھی تک چتور رسوم میں محصور۔ اے ہند! نکال اپنے دفینے!

پھر دیکھ کہ کیا ہوتا ہے۔

**صدائے ہند**۔ او بے صبر اُٹھ، او بے سمجھ! سوچ، آرہا ہے وہ وقت مگر ابھی آیا نہیں۔ حسن بے نقاب کو میری گلیوں کی ہوا راس نہیں۔ اپنی سیتاؤں کو کیسے نکالوں؟ میرے چپے چپے پر لنکا، قدم قدم پر راون۔ میرے چاند گرہن میں اچھے۔ میرے لعل گرد آلود بہتر۔ نہ سہی میرے گھر میں روشنی، میرے دل میں خوشی، میری بزم میں رونق کچھ نہ سہی۔ بلا سے جنہیں تو دفینے کہتا ہے وہ میری جان ہیں۔ مرنے سے نہیں ڈرتا مگر جیتے جی مرا بھی نہیں جاتا۔

**خندۂ تقدیر**۔ ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ کیا کہنے اِن دونوں کے! کوئی سمجھے نہیں کے بس کی تو بات ہے! ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا

فلک پیما

---

# رقص و سرود سے کنارہ کر

ناچ رنگ سے کنارہ کر اور آسمانی موسیقی کے دریائے پاک میں غوطہ لگا!

گانے بجانے سے دُور بھاگ اور اِن ناچتی ہُوئی راگنیوں کا احسان اپنے کانوں پر نہ لے، تنہائی کے راگ کو ہوش کے کانوں سے سُن اور قدرت کی دلکش آوازوں کو اپنے دماغ میں بس جانے دے!

بند محلوں میں بیٹھ کر ستار بانسری کا زرخرید گانا نہ سُن بلکہ وسیع فضا کو زمین و آسمان کی ظاہرہ اور چھپی ہُوئی شیرینیوں سے مست ہوتے دیکھ! دیکھ صبح ہوتی ہے تو چمن کی چڑیاں پہاڑ کی سبز گھاٹیوں میں اپنی راگنی چھیڑ دیتی ہیں۔ خاموش جنگل کان دھر کر سنتے ہیں اور پہاڑوں کی دُنیا گونج سے آباد ہو جاتی ہے!! خوفناک لٹکی ہُوئی چٹانوں کے بیچوں بیچ آبشار شور کرتا ہُوا نیچے کے پتھروں پر گرتا ہے اور ننھی آوازیں ریزہ ریزہ ہو کر ایک نہ تھمنے والے راگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں!

قدرت کے مخملی فرش پر لیٹے ہُوئے

میں نہیں جانتا کہ میں کن خیالوں میں گم ہوں؟ صرف یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسی طرح میرا نفس بھی زندگی کی پُرپیچ گھاٹیوں میں کسی دور دراز پھلواڑی میں اپنا گیت گا رہا ہے۔ گویا اسی طرح میرے جذبات دنیا کے جھگڑوں جھمیلوں میں اپنا سر ٹپک ٹپک کر اپنے وجود کو پارہ پارہ کر رہے ہیں جس سے ایک میٹھی باریک آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی میرے دل کے ساز کے لئے زندگی کا پورا راگ ہے!!

د۔ ب

# خیالاتِ ہمایوں

## مسلمان اور تعلیم

تعلیمی معاملات پیچیدہ اور مشکل ہوتے ہیں اور ہوتے جائینگے اس لئے مسلمان اگر دوسری قوموں کے مقابلہ میں ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ تو جبتک وہ زور اور نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی بہتری کی کوشش نہ کرینگے وہ دوسری قوموں سے مقابلہ نہ کر سکینگے۔

ہمارا عام طور سے یہ قاعدہ ہے اور تجربہ سے بھی یہی معلوم ہوا ہے۔ کہ ہم زبانی جمع خرچ بہت کچھ کرتے ہیں، لیکن جب نقائص دور کرنے کے لئے کچھ عملی کام کرنیکا وقت آجاتا ہے تو ہم سو جاتے ہیں۔ صاحبان! یہاں جو یہ جلسہ ہو رہا ہے یہ راجہ اندر کی سبھا نہیں ہے۔ یہ تعلیمی دنگل ہے کہ پہلوانوں کی طرح اس اکھاڑے میں اُترو۔ دوسری قوموں سے سابقت کرو۔ جبتک دیگر قوموں سے ہم دس گنی محنت کر کے اُن کے برابر آنے کی سر توڑ کوشش نہ کرینگے وہ ہم سے اس قدر دور نکل گئے ہیں۔ کہ ہم انکی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہماری تعلیم کے سارے کام سُدھر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم بڑھنے کے لئے کوشش نہ کریں تو منزلِ مقصود تک کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

ہمایوں۔

---

[illegible]

پو پھٹتی ہے انوارِ سحر میں تارے ڈوبے جاتے ہیں — اب کوئی سُنے تو کیا سمجھے وہ یاد مجھے کیوں آتے ہیں
کیا دیکھا ہے آئینے میں؟ کس بات پہ وہ اتراتے ہیں — جب عشق کا جادو چلتا ہے تو پربت بھی ہل جاتے ہیں
اے شمعِ سحر رونیگی کہانتک؟ لاش پہ مرنے والے کی — تانتا سا بندھا ہے دُنیا میں اک جاتا ہے دو آتے ہیں
کیا نام اسی کا اُلفت ہے؟ کیا عشق کی محویت ہے یہی — میں دل کو ڈھونڈھنے نکلا ہوں، وہ سامنے آ۔ آجاتے ہیں
اے یادِ وطن! آجاتی ہے مجھے کیوں چھوڑ کے دشتِ غربت میں — یہ چاند ستاتا ہے مجھکو، یہ تارے کاٹے کھاتے ہیں
خود مجھکو بھی معلوم نہیں میں کس کی یاد میں روتا ہوں — کیا جانے کیا ہیں دل میں جو یہ نشتر سے چبھ جاتے ہیں
اُلفت کی طلائی زنجیروں میں ہوں میں گرفتار اے سیفی — احباب مرے پھر طوق و سلاسل کیوں مجھکو پہناتے ہیں

# جزائرِ ملایا میں اسلام

ہمارا چمنستانِ اقبال تاراجِ خزاں ہو گیا۔ عالمِ اسلامی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لقمۂ نہنگ یورپ ہو گیا۔ لیکن آج بھی مسلمان روئے زمین پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ بیساختہ زبان سے نکل پڑتا ہے

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اور بحمد اللہ ان میں بیداری کے وہ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ بقول حضرتِ اقبال

"محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی"

بیداری کی یہ روح مشرقِ قریب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ مشرقِ بعید میں بھی اسکے آثار نمایاں ہیں مگر انکی بابت ہمارے معلومات کا فقدان انکی حالت کا صحیح اندازہ کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان اطراف میں مذہبِ اسلام کی اشاعت کب اور کیونکر ہوئی، اور آج وہاں کے مسلمانوں کا کیا حال ہے، اسی کمی کو مدِ نظر رکھ کر میں اس سے پیشتر چینی مسلمانوں کی بابت اپنے معلومات ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں اور آج جزائرِ ملایا کے مسلمانوں کا کچھ حال سپردِ قلم کرتا ہوں۔

اہلِ عرب پیغمبرِ اسلام کی پیدائش سے پیشتر ہی مشرقی جزائرِ ہند کی تجارت پر قابض تھے، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ انکا دائرۂ اثر مشرقی جانب بڑھتا گیا، قیاس کہتا ہے کہ جس طرح بعثتِ نبوی کے بعد اہلِ عرب خشکی پر تبلیغِ اسلام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے، اسی طرح ان امن پسند تاجروں نے بھی سمندر پار اپنے حلقۂ اثر میں اشاعتِ اسلام کیلئے امکانی کوششیں صرف کی ہونگی۔ لیکن ایک مدت تک کتبِ تاریخ میں ان کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔

**سماترا**۔ تاریخی شہادت کے مطابق بارھویں صدی عیسوی میں اول اول شیخ عبداللہ عارف اور انکے مریدوں نے اس طرف توجہ کی اور جزیرہ سماترا میں مقیم ہو کر دینِ اسلام کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد جہان شاہ کسی مغربی ملک سے تبلیغِ اسلام کی غرض سے یہاں تشریف لائے۔ آچین[۱] کے بہت سے باشندوں کو مسلمان کیا اور ایک آچینی عورت سے شادی کر کے وہیں آباد ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انکو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ

---

[۱] جزیرہ سماترا کے شمال میں ایک ریاست ہے۔

آچین کے مُسلمانوں نے اُنہیں اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مبلغین کا یہ جوش و خروش عرصہ تک قائم نہ رہا، کیونکہ مارکوپولو کے بیان کے مطابق جس نے ۱۲۹۲ء میں یہاں کا سفر کیا جزیرے کے صرف شمالی حصے میں مُسلمان آباد تھے۔

چودھویں صدی میں شریف مکہ نے زیرِ صدارت شیخ اسمٰعیل ایک مشن سماٹرا کے باشندوں میں تبلیغ اسلام کے لئے روانہ کیا۔ یہ مشن سماٹرا میں ہزاروں آدمیوں کو مُسلمان کرتا ہُوا شہر سمدرا میں داخل ہُوا وہاں کے راجہ مارا سیو نے شیخ اسماعیل کے ہاتھ پر بیعت کی اُسکا نام بدل کر ملک الصالح رکھا گیا اور ایک مُسلمان بادشاہ پرلاگ کی دختر سے اُسکی شادی ہوگئی۔ ۱۳۴۵ء میں جب ابن بطوطہ سماٹرا پہنچا تو ملک الصالح کا بڑا شہزادہ ملک الظاہر سمدرا میں حکمراں تھا۔ اُسکے دربار میں سلاطین اسلامیہ کی شان و شوکت پائی جاتی تھی۔ وہ فقیہوں کا بڑا دوست تھا۔ اسکے دربار میں قرأت اور مذاکرے کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور بڑے بڑے علماء اور شعراء کا مجمع رہتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں دو بڑے فقیہوں کا تذکرہ کیا ہے جو ایران سے سماٹرا آئے تھے اور محمد بن تغلق کے زمانے میں بحیثیت ایلچی ہندوستان میں مقیم تھے اس سے ظاہر ہے کہ یہ سلطنت اسلامی دُنیا کی بعض حکومتوں سے تعلق رکھتی تھی۔

پندرھویں صدی میں سردار کما لا بومی آبنائے سندا کو عبور کر کے لمپانگ (جاوا) سے سماٹرا کی سلطنت بانٹن میں داخل ہُوئے، اسلام قبول کیا اور ادائے حج کی نیت سے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپسی پر اسلام کی اشاعت میں یہانتک کوشش کی کہ گاؤں گاؤں میں مسجدیں بنگئیں۔ مسلم مبلغین کی مساعی جمیلہ سے آہستہ آہستہ سماٹرا کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔ مگر ایک مدت تک یہ لوگ اپنے مذہب سے ناواقف رہے، ۱۸۰۳ء میں تین حاجیوں نے وہابی مذہب کی تلقین شروع کی، نذر و نیاز، شراب خواری، قمار بازی اور دیگر لواہی موقوف ہوئیں، ہزاروں مُسلمانوں نے اُن کا ساتھ دیا، مگر کچھ عرصہ بعد اس تحریک نے سیاسی صورت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ انکی ساری قوت ڈچ گورنمنٹ کی کوششوں سے سلب ہوگئی۔

آجکل اس جزیرے میں کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں ہیں جن میں سب سے زیادہ طاقتور آچین ہے لیکن ڈچ گورنمنٹ سارے جزیرے پر توسیعِ حکومت کی کوشش کر رہی ہے، ریاست آچینی کے عروج کا زمانہ سلطان سکندر مودا کا عہد حکومت تھا۔ اُس نے ملاکا پر حملہ کرنے کے لئے ۱۶۱۵ء

سلہ پریچنگ آف اسلام

# جزائرِ ملایا میں اسلام

ہمارا چمنستانِ اقبال تاراجِ خزاں ہوگیا۔ عالمِ اسلامی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لقمۂ نہنگ یورپ ہوگیا۔ لیکن آج بھی مسلمان رُوئے زمین پر اس طرح چھائے ہُوئے ہیں کہ بیساختہ زبان سے نکل پڑتا ہے

"مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اور بحمداللہ ان میں بیداری کے وہ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ بقول حضرتِ اقبال

"محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی"

بیداری کی یہ رُوح مشرقِ قریب ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ مشرقِ بعید میں بھی اسکے آثار نمایاں ہیں مگر انکی بابت ہمارے معلومات کا فقدان انکی حالت کا صحیح اندازہ کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان اطراف میں مذہب اسلام کی اشاعت کب اور کیونکر ہُوئی، اور آج وہاں کے مسلمانوں کا کیا حال ہے، اسی کمی کو مدنظر رکھ کر میں اس سے پیشتر چینی مسلمانوں کی بابت اپنے معلومات ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں اور آج جزائر ملایا کے مسلمانوں کا کچھ حال سپردِ قلم کرتا ہوں۔

اہل عرب پیغمبرِ اسلام کی پیدائش سے پیشتر ہی مشرقی جزائر ہند کی تجارت پر قابض تھے، اور امتداد زمانہ کے ساتھ انکا دائرۂ اثر مشرقی جانب بڑھتا گیا، قیاس کہتا ہے کہ جس طرح بعثت نبوی کے بعد اہل عرب خشکی پر تبلیغ اسلام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے، اسی طرح ان امن پسند تاجروں نے بھی سمندر پار اپنے حلقۂ اثر میں اشاعتِ اسلام کیلئے امکانی کوششیں صرف کی ہونگی۔ لیکن ایک مُدت تک کتب تاریخ میں ان کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔

سماترا۔ تاریخی شہادت کے مطابق بارھویں صدی عیسوی میں اول اول شیخ عبداللہ عارف اور انکے مریدوں نے اس طرف توجہ کی اور جزیرہ سماترا میں مقیم ہو کر دینِ اسلام کی اشاعت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد جہان شاہ کسی مغربی ملک سے تبلیغ اسلام کی غرض سے یہاں تشریف لائے۔ آپ چین کے بہت سے باشندوں کو مسلمان کیا اور ایک آچینی عورت سے شادی کر کے وہیں آباد ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انکو اتنی مقبولیت حاصل ہُوئی کہ

---

لہ جزیرہ سماترا کے شمال میں ایک ریاست ہے۔

آچین کے مسلمانوں نے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مبلغین کا یہ جوش و خروش عرصہ تک قائم نہ رہا، کیونکہ مارکو پولو کے بیان کے مطابق جس نے ۱۲۹۲ء میں یہاں کا سفر کیا جزیرے کے صرف شمالی حصے میں مسلمان آباد تھے۔

چودھویں صدی میں شریف مکہ نے زیر صدارت شیخ اسمٰعیل ایک مشن سماترا کے باشندوں میں تبلیغ اسلام کے لئے روانہ کیا۔ یہ مشن سماترا میں ہزاروں آدمیوں کو مسلمان کرتا ہوا شہر سمدرا میں داخل ہوا وہاں کے راجہ مار اسیو نے شیخ اسمٰعیل کے ہاتھ پر بیعت کی اسکا نام بدل کر ملک الصالح رکھا گیا اور ایک مسلمان بادشاہ پر لاگ کی دختر سے اسکی شادی ہوگئی۔ ۱۳۴۵ء میں جب ابن بطوطہ سماترا پہنچا تو ملک الصالح کا بڑا شہزادہ ملک الظاہر سمدرا میں حکمران تھا۔ اسکے دربار میں سلاطین اسلامیہ کی شان و شوکت پائی جاتی تھی۔ وہ فقیہوں کا بڑا دوست تھا۔ اسکے دربار میں قرأت اور ذکر کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور بڑے بڑے علما اور شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں دو بڑے فقیہوں کا تذکرہ کیا ہے جو ایران سے سماترا آئے تھے اور محمد بن تغلق کے زمانے میں بحیثیت ایلچی ہندوستان میں مقیم تھے اس سے ظاہر ہے کہ یہ سلطنت اسلامی دنیا کی بعض حکومتوں سے تعلق رکھتی تھی

پندرھویں صدی میں سردار کمالا بومی آبنائے سند اکو عبور کر کے لپابنگ (جاوا) سے سماترا کی سلطنت بانٹن میں داخل ہوئے، اسلام قبول کیا اور ادائے حج کی نیت سے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپسی پر اسلام کی اشاعت میں یہانتک کوشش کی کہ گاؤں گاؤں میں مسجدیں بن گئیں مسلم مبلغین کی مساعی جمیلہ سے آہستہ آہستہ سماترا کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔ مگر ایک مدت تک یہ لوگ اپنے مذہب سے ناواقف رہے، ۱۸۰۳ء میں تین حاجیوں نے وہابی مذہب کی تلقین شروع کی، نذر و نیاز، شراب خواری، قمار بازی اور دیگر نواہی موقوف ہوئیں، ہزاروں مسلمانوں نے اُن کا ساتھ دیا، مگر کچھ عرصہ بعد اس تحریک نے سیاسی صورت اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ انکی ساری قوت ڈچ گورنمنٹ کی کوششوں سے سلب ہوگئی۔

آجکل اس جزیرے میں کئی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں ہیں جن میں سب سے زیادہ طاقتور آچین ہے لیکن ڈچ گورنمنٹ سارے جزیرے پر توسیع حکومت کی کوشش کر رہی ہے، ریاست آچینی کے عروج کا زمانہ سلطان سکندر مودا کا عہد حکومت تھا۔ اُس نے ملاکا پر حملہ کرنے کے لئے ۱۶۱۵ء

؎ پریچنگس آف اسلام

میں جو بیڑا تیار کیا، اس سے اسکی عظمت اور شان کا پتہ چلتا ہے۔[1] اُس میں پانچسو بادبانی کشتیاں تھیں جن میں دو سو پچاس جنگی جہاز تھے۔ ان جنگی جہازوں میں تقریباً ایک سو تو اتنے بڑے تھے کہ یورپ میں بھی اُس وقت مستعمل نہ تھے۔

**جاوا۔** جاوا میں تبلیغ اسلام کی پہلی کوشش چودھویں صدی کے آخر میں ہُوئی جبکہ مولانا ملک ابراہیم اس جزیرے کے مشرقی ساحل پر اُترے اور شہر گریسک کے پاس آباد ہو کر دینِ اسلام کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ یہیں انکا مزار ہے، اور ہر سال بہت سے مُسلمان اسکی زیارت کو آتے ہیں ۱۳۹۹ء میں چرمان کا راجہ اس نیت سے جاوا میں وارد ہُوا کہ مجاپہت کے راجہ کو مُسلمان کر کے اُس سے قرابت پیدا کرے راستے میں اُس نے بہت سے بُت پرستوں کو مُسلمان کیا اور ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، مگر مجاپہت کی سلطنت میں پہنچتے ہی اسکی فوج میں وبا پھیل گئی اور اُسے فوراً جانا پڑا۔

پندرھویں صدی کے آغاز میں ردن رحمت نامی ایک عرب مبلغ یہاں تشریف لائے۔ مجاپہت کے راجہ نے اُنہیں ایک ضلع کا حاکم مقرر کر دیا اور اشاعت اسلام کی اجازت دیدی۔ مولانا اسحاق نامی ایک واعظ انکی شہرت سُن کر مدد کو آئے۔ ردن رحمت نے انہیں ریاست پالم بنگن میں مامور کیا۔ اور ایکدوسرے مبلغ شیخ خلیفہ حسین کو جزیرہ مدورا میں تبلیغ کے لئے روانہ کیا۔ مولانا اسحاق کے صاحبزادے نے شہر گری کے گرد و نواح میں اشاعت اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا اور ردن رحمت کے دو لڑکے جزیرہ جاوا کے شمال و مشرقی گوشہ میں مصروف تبلیغ رہے۔

اسی زمانے میں ایک اہم واقعہ ظہور پذیر ہُوا۔ مجاپہت کے راجہ کی چھوٹی رانی کو راجہ کی ایک حرم سے عداوت تھی۔ اس وجہ سے راجہ نے اسے اپنے بیٹے دامر کے پاس بھیجدیا تھا جو سماترا میں پالم بنگ کا حاکم تھا۔ وہاں پہنچ کر اس رانی کے ایک بچہ پیدا ہُوا۔ دامر نے اس سوتیلے بھائی کو اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ وہاں اس کو بالکل اسلامی تعلیم و تربیت حاصل ہُوئی۔ جب وہ جوان ہُوا تو شہر بنتارا (جاوا) میں آباد ہو کر اشاعت اسلام میں مشغول ہو گیا۔ اپنی ماں کے ساتھ بدسلوکی پر غصے اور انتقام کی آگ اس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ آخر ۱۴۷۸ء میں اس نے دیگر مسلم واعظین کی مدد سے علم بغاوت بلند کر دیا سات روز کی سخت جنگ کے بعد راجہ کو شکست ہُوئی اور جزیرہ جاوا کے مشرقی حصے میں بت پرستوں

---

[1] سائیکلو پیڈیا برٹانیکا

کے راج کی جگہ ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔

جاوا کے مشرقی حصے میں تو یہ واقعات پیش آرہے تھے اور مغربی حصے میں شیخ نورالدین ابراہیم اور انکے صاحبزادے حسن الدین تبلیغ اسلام میں کوشاں تھے، انکو یہاں بہت کامیابی ہوئی مگر مغربی حصے میں اشاعت اتنی جلد نہیں ہوئی جتنی مشرقی جاوا میں ہوئی تھی۔ چنانچہ پجاجرن کی سلطنت سولھویں صدی کے آغاز تک بت پرست رہی۔ اسکے علاوہ اور بہت سی غیر مسلم سلطنتیں مدت تک سلامت رہیں۔

جزیرہ نما ملایا۔ سماترا کے شمال میں اسلامی حکومت کے قائم ہونے سے ملایا میں مسلم مبلغین کا داخلہ بہت آسان ہوگیا۔ چنانچہ ملایا میں سب سے پہلے سماترا کی سلطنت مناتگ کابو نے مبلغین روانہ کئے۔ پرتگالی مؤرخ ڈی۔ بارس لکھتا ہے کہ ۱۳۸۰ء میں عرب سے ایک قاضی یہاں آیا اور ملاکا کے راجہ کو مسلمان کر کے محمد شاہ نام رکھا۔ اس ریاست کے اکثر باشندے بھی محمد شاہ کے عہد حکومت میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے پھر سولھویں صدی کے شروع میں ریاست کیدا کے باشندے بھی مسلمان ہو گئے۔ انکے اسلام لانیکی حکایت بہت دلچسپ ہے۔

سولھویں صدی کے آغاز میں شیخ عبداللہ نامی ایک مبلغ کیدا تشریف لائے اور اسلام کی عظمت اور برتری کا وعظ دینا شروع کر دیا۔ راجہ نے انکے مواعیظ سن کر اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی۔ شیخ نے راجہ کو گلے لگا لیا اور اسکا نام بدل کر مزلفل شاہ رکھدیا۔ راجہ بیحد شراب پیتا تھا مگر شیخ عبداللہ کی تعلیم سے اس قدر متاثر ہوا کہ تمام مٹکوں کو منگوا کر اپنے ہاتھ سے زمین پر لنڈھا دیا، پھر حکم دیا کہ شاہی محل کے تمام بت لائے جائیں، تھوڑی دیر میں سونے، چاندی، مٹی، پتھر اور لکڑی کے بتوں کا ایک انبار لگ گیا اور عبداللہ نے اپنے تبر سے سب کو ریزے ریزے کر دیا۔ رفتہ رفتہ حرم شاہی، وزرا، اور امرا، سب مسلمان ہوگئے، کیدا کے اکثر باشندوں نے بھی بہت جلد اسلام قبول کر لیا۔ سلطان مزلفل نے بڑے بڑے شہروں میں مسجدیں بنوائیں اور جمعہ کے دن نمازیوں کو بلانیکے لئے نقارہ بجنے کا حکم دیا۔ اسکے بعد اشاعت اسلام میں تدریجی ترقی ہوتی رہی، حتیٰ کہ آج ملایا میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی ہے اور باوجود اسکے کہ سلطنت برطانیہ نے پورے جزیرہ نما پر قبضہ جما رکھا تھا۔ مگر اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں مسلمان فرمانرواؤں کے زیر حکومت ہیں۔

---

[1] اسلام اور مسیحیت مشرق بعید میں۔

بورنیو۔ ۱۴۷۸ء میں سلطنت بنجر ماسین کے بادشاہ نے بغاوت فرو کرنیکے لئے جاوا کی ایک مسلمان ریاست سے کمک چاہی مسلمانوں کی جو سپاہ کمک کو روانہ کی گئی تھی۔ وہ بغاوت فرو کرنیکے بعد اسلام پھیلانے میں مصروف ہوگئی۔ چنانچہ ۱۵۲۱ء میں جب اہل ہسپانیہ بردن کے شہر میں پہنچے تو معلوم ہُوا کہ وہاں کا والی ملک مسلمان ہے۔ ۱۵۵۰ء میں چند عرب مبلغین سکدانا تشریف لائے اور بادشاہ کو دعوت اسلام دی، مگر اس نے اپنا آبائی مذہب چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اسکی موت سے پیشتر اشاعت اسلام میں اتنی ترقی ہُوئی کہ اسکے جانشین نے مسلمانوں کی کثرت تعداد دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔ ۱۵۹۵ء میں حضرت شیخ شمس الدین مکہ معظمہ سے بادشاہ سکدانہ کے نام ایک خط لائے جس میں اُسے سلطان محمد صفی الدین کا خطاب دیا گیا تھا۔ ۱۶۶۰ء میں آلورنواٹ نے بورنیو کا سفر کیا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ تمام ساحلی شہروں میں اسلام پھیل چکا ہے، مگر ملک کے اندرونی حصے کی تمام وحشی قومیں بت پرست ہیں مسلم واعظین کی ان تھک کوششوں سے یہ وحشی قومیں بھی آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہوتی جاتی ہیں

جزائر مولکا۔ جزائر مولکا میں اشاعت اسلام کی ابتدا پندرھویں صدی عیسوی میں ہُوئی۔ اس زمانے میں تیدور کا بت پرست راجہ ایک عرب شیخ منصور کی ہدایت سے مع اپنے رفقا کے مشرف بہ اسلام ہُوا۔ اور اسکا نام سلطان جلال الدین رکھا گیا۔ ۱۴۹۵ء میں جزیرہ ٹرنائی کا راجہ اسلام قبول کرنیکی نیت سے جاوا کے شہر گریسک کو روانہ ہُوا اور وہاں سے واپس آکر اپنی حکومت میں تبلیغ اسلام کی کوشش کرتا رہا۔

پرتگالیوں کی فتوحات ایک حد تک اشاعت اسلام کیلئے سدِ راہ ہوگئیں۔ انھوں نے چند مسلم مبلغین کو ملک بدر بھی کر دیا، اور رعایا میں مذہب عیسوی کی اشاعت شروع کر دی۔ مگر عیسائیوں کے طرز حکومت سے بہت جلد تنگ آکر وہاں کے باشندوں نے غدر برپا کر دیا جس میں بہت سے عیسائی قتل کئے گئے برخلاف اسکے مشرقی جزائر سے جو لوگ اشاعت اسلام کیلئے تشریف لائے انکی اور بھی زیادہ خاطر ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۵۲۱ء میں گیلالا کا راجہ بھی مسلمان ہوگیا۔

سلیبیز۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی تعلیم سے متاثر ہوکر، مکاسہ کے باشندوں کو یہ خیال آیا کہ ان کا مذہب بالکل مہمل ہے لہذا انہوں نے ملاکا اور آچین کو قاصد روانہ کئے کہ وہاں سے پادریوں اور مولویوں کو بلوا آئیں۔ ملاکا کے پرتگالی گورنر نے پادریوں کی روانگی میں بہت دیر لگادی۔ برخلاف اسکے ملکہ آچین نے جس وقت اہل مکاسہ کا یہ قصد سُنا فوراً واعظوں کا ایک جہاز روانہ کیا۔ واعظوں نے پہنچتے ہی نہایت

انہماک کے ساتھ تبلیغ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد پادریوں کا بھی ایک گروہ وارد ہوا اور پیغمبر اسلام کے احکام کی سختی سے مخالفت کی، مگر مسلم مبلغین کے سامنے کچھ بھی پیش نہ گئی۔ اہل مکاسر جب مسلمان ہو گئے تو اُنہوں نے اپنی ہمسایہ قوم بوگی کو بھی مسلمان کر لیا۔ اسی زمانہ میں ریاست ٹانو کا راجہ بھی مسلمان ہو کر اسلام کا بڑا حامی بن گیا۔ گواؔ کے مشہور خطیب تنگل کا مزار یہیں ہے،

سارے جزائر ملایا میں سلیبیز کے باشندے سب سے زیادہ پُرجوش مبلغ ہیں چنانچہ پچھلی صدی آخر میں اُنہوں نے ریاست بولانگ ماگندو کے اُن باشندوں کو بھی مسلمان کر لیا، جنہوں نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں وہاں سوائے چند نو آباد مسلمانوں کے اکثر باشندے عیسائی تھے۔ لیکن مذہب سے بالکل نابلد اور ضعیف الایمان عیسائی مسلم واعظین کا مقابلہ نہ کر سکے۔ علاوہ بریں ڈچ گورنمنٹ انکو بہت ذلیل سمجھتی تھی اسلئے وہ دلشکستہ ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے حتیٰ کہ راجہ امینول نے بھی اپنے مسلمان ہونیکا اعلان کر دیا۔ بوگی کی بہادر قوم نے بھی اشاعت اسلام میں بڑا حصہ لیا۔ اسکے افراد گو عموماً تاجر ہیں مگر اشاعت اسلام کو اپنا فرض جانتے ہیں، مختلف جزائر میں اُنکی آبادیاں ہیں، جسکے اثر سے کئی جزائر میں اسلام کی اشاعت ہوئی، انکی ایک کثیر تعداد جزیرہ فلوریز کے جنوبی ساحل پر آباد ہے اور اس نے فلوریز کے بہت سے باشندوں کو مسلمان کر لیا ہے +

**فلپائن اور دیگر جزائر۔** ۱۵۲۱ء میں جب مشہور ہسپانوی سیاح میگلن یہاں پہنچا تو جزیرہ زولو میں مسلمانوں کی آبادی موجود تھی، جزیرہ منڈانو میں اس سے تین صدی پیشتر اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی تھی، مگر اس زمانے کے کسی مبلغ کا نام محفوظ نہیں ہے۔ سولھویں صدی میں سید علی نامی ایک تاجر ملک عرب سے یہاں تشریف لائے اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گئے، تقریباً نصف آبادی نے اُنکے ہاتھ پر بیعت کی اور باشندگان زولو نے اُنہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ سات برس تک انہوں نے سلطنت کی اور اس قدر نیکنام ہوئے کہ آجتک بہت سے مسلمان ہر سال اُنکی مزار کی زیارت کو جاتے ہیں +

مکاسر کے چند واعظ عرصے تک جزیرہ سمباوا میں بھی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے کچھ دنوں بعد مبلغ حاجی علی نے یہاں ایک مذہبی تحریک پھیلائی جس سے یہاں کے مسلمان دیگر جزائر کے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پابند شرع ہو گئے۔ مولکاؔ کے سلطان بانجان کی کوششوں سے سترھویں صدی

---

ؔ مکاسر کا دارالسلطنت ہے

میں نیوگنی کے بہت سے باشندے بھی اسلام لائے۔ جزیرہ سیرام کے مسلمانوں نے جزائر کائی کے کچھ لوگوں کو بھی مسلمان کرلیا۔

**جزائر ملایا کے مسلمانوں کی موجودہ حالت** ۔ مشرقی جزائر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں بھی اسلام پر امن ذرایع سے شایع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اشاعت اسلام کی کامیابی کا راز دم شمشیر میں نہیں بلکہ طریق تبلیغ میں مضمر ہے، جسکو دیکھکر بکل نے کہا اور بہت سچ کہا کہ "داعیان اسلام بڑے مدبر ہوتے ہیں"[۲]

مسلمان اور عیسائی مبلغین کے طریق اشاعت کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا کیا راز تھا۔ مسلمانوں نے اہل ملک کی زبان سیکھی اور انکے رسم ورواج اختیار کئے، انکی عورتوں سے شادی کر کے اصلی باشندوں سے ایسا اتحاد پیدا کیا کہ دونوں میں کچھ فرق باقی نہ رہا۔ مسلمانوں نے ہسپانوی عیسائیوں کی طرح اپنے آپ کو کسی سربر آوردہ قوم کا فرد ظاہر کر کے بڑے بڑے حقوق کا دعوےٰ نہیں کیا، اور نہ اہل ملک کو بڑے بڑے حقوق کا دعوےٰ نہیں کیا، اور نہ اہل ملک کو ادنےٰ قوم سمجھ کر ذلیل و خوار کیا۔ ہسپانوی عیسائی جزیرے والوں کی زبان، عادت، اور رسم ورواج سے بالکل ناآشنا تھے۔ اور انکی شراب خوری، لالچ، اور ظلم نے مذہب عیسوی کو بدنام کر رکھا تھا۔ یہ لوگ صرف اپنی ملکی قوت بڑھانے کے لئے عیسائی مذہب کی اشاعت کرتے تھے اور اکثر عیسائی محض سزا کے خوف سے مذہب کی پابندی کرتے تھے"[۳] اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ بت پرستوں کی نظر میں مسلمانوں کو بہت عزت و وقار حاصل تھا، ڈل رمپل جو تین سال تک جزیرہ زولو میں مقیم رہا قوم ابدان کے متعلق لکھتا ہے کہ "یہ لوگ اپنی نادانی پر متاسف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے پروردگار کا علم حاصل ہے اور جس خدا کو وہ خود نہیں جانتے اُسکی الوہیت کے اقرار میں وہ خدا کا علم رکھنے والوں کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں"۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کی روز افزوں تعداد مقام حیرت نہیں ہے۔

آجکل ان جزائر کے مسلمانوں میں بھی بیداری اور ترقی کے آثار پیدا ہیں۔ بیداری کی اسی جدوجہد میں یہاں کے حاجیوں نے بہت حصہ لیا۔ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کل تک جن مسلمانوں

---

[۱] طامس فارسٹ ۱۷۷۵ء میں لکھتا ہے کہ ان جزائر میں عرب مبلغین تین صدی بیشتر آئے تھے۔

[۲] سرطامس بکل مصنف ہسٹری آف سولزیشن، [۳] پریچنگس آف اسلام۔

میں بت پرستی کے رسوم اور عقائد رائج تھے، آج وہ سچے مُسلمان نظر آتے ہیں۔ جزائر میں آباد ہونیکی وجہ سے ہر سال اُنکی بہت بڑی تعداد حج کو جاتی ہے۔ حاجیوں کی تعداد میں روزافزوں ترقی دیکھ کر ڈچ گورنمنٹ نے قانون پاس کر دیا تھا کہ کوئی شخص بغیر ۱۱۰ فلورن (تقریباً ۱۶۵ روپیہ) دئے حج کو نہیں جا سکتا لیکن کیا کوئی قانون ایک بیدار قوم کی ترقی میں حائل ہو سکتا ہے؟ ۱۸۵۴ء میں یہ قانون منسوخ ہُوا اور اس وقت سے حاجیوں کی تعداد میں نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں صرف جزیرہ جاوا سے تقریباً ۵۰ ہزار مسلمان حج کو روانہ ہُوئے۔" ڈچ گورنمنٹ اور عیسائی مشنری اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ یہ حاجی جب اپنے وطن کو واپس آتے ہیں تو مصلح قوم و ملّت بنکر مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی اشاعت میں بہت کوشش کرتے ہیں[۱]"

مسٹر وجک اپنے ایک مضمون میں جاوی مسلمانوں کی مذہبی حالت بیان کرتے ہُوئے فرماتے ہیں۔ کہ" جوگ جکرتا اور سوراکرتا اسلامی تحریکوں کے مرکز ہیں۔ صرف شہر لولوسے دو اخبار مدن مسلمن اور اسلام برگیرک شایع ہوتے ہیں جنکا مقصد صرف اشاعت اسلام اور مسیحی تبلیغ کا مقابلہ ہے۔ جوگ جکرتا میں آجکل شیخ محمد عبدہٗ مصری کی مذہبی تحریک زور پکڑ رہی ہے، جو باوجود شدید مخالفتوں کے سیاست سے علیحدہ ہوکر صرف اسلامی تہذیب و تعلیم کی ترقی میں مصروف رہتی ہے۔ اسکا اثر روز افزوں ترقی پر ہے اور دو سال پیشتر اسکا اعلان ہوچکا ہے کہ اسکا دائرۂ عمل سارا مجمع الجزائر ہے[۲]"

یہاں کے مُسلمانوں میں تعلیم کا چرچا روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے ۱۸۸۵ء میں ۱۶۷۶۰ مدرسے تھے جن میں ۲۵۵۱۲۸ طلباء تعلیم پاتے تھے علاوہ بریں تحصیل علم کے شوق میں یہ لوگ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی منتشر ہیں، چنانچہ ۱۹۰۰ء میں جامع ازہر میں یہاں کے طلباء کی تعداد سات تھی درآنحالیکہ ہندوستان ایسے وسیع ملک کے (جہاں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ) صرف تین طلبا تھے، بہت سے حاجی تکمیل علم کی غرض سے مکہ شریف میں بھی ٹھیر جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ سوائے جاوا کے بقیہ تمام ڈچ مقبوضات اور جزائر فلپائن میں سرکاری زبان مُسلمانوں کی زبان ہے۔ اس وجہ سے جو شخص سرکاری عہدے چاہتا ہے اُسے مُسلمانوں کی زبان سیکھنا لازمی ہے اس طرح بہت سے تعلیمیافتہ حضرات کو اسلامی اصول و عقائد سے متاثر ہونیکا موقع ملتا ہے، جو

---

[۱] پریچنگس آف اسلام [۲] مسلم ورلڈ۔

ایک حد تک اسلام کی اشاعت میں معاون ہے۔

تازہ ترین شمار کے مطابق ان جزائر میں مسلمانوں کی مجموعی چار کروڑ[1] ہے۔ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی، جبکہ اسلامی دنیا میں ایک عام بیداری کی لہر جوش مار رہی ہے اور اتحاد اسلامی کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے، ہم اتنے مسلمانوں سے بے تعلق اور ناواقف ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے وسائل اختیار کئے جائیں جن سے ہمارے باہمی تعلقات میں قرابت اور معلومات میں اضافہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے کہ مسیحی مبلغین اپنی انتہائی کوششوں میں مصروف ہیں ضرورت ہے کہ ہندوستان سے بھی ایک مشن[2] روانہ کیا جائے، جو آغوش ہلال کے پروردہ نوجوانوں کو نذر صلیب ہونے سے بچالے۔ اے کاش مسلمانوں میں اتنی بھی خود داری ہوتی!

سید حسن

---

# عورت

## مغربی نقطۂ خیال سے

۱۔ عورت ایک گلاب کا غنچہ ہے مگر قدرت نے خود آرائی کا ایک کانٹا بھی ودیعت کیا ہے!!!

۲۔ انسان کو بیوی جیسا چاہتی ہے بنا دیتی ہے۔ وہ بے تکلف ویسا ہی بن جاتا ہے!!!

۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جسکی بیوی باعصمت نیک طینت و مطیع ہو۔ اور جس کے ساتھ شوہر ایک محبت کی زندگی بسر کر سکے ـــــــــ !!!

۴۔ عورت اپنے شوہر۔ اعتقاد و دیگر اسرار دنیوی کی واحد فرماں روا ہے جسکے روبرو دنیا۔ زمانہ تاج اور عصائے شاہی یکساں سر تسلیم خم کرتے ہیں ـــــــــ !!!

---

[1] مقبول احمد صاحب الہ آبادی:۔ سماترا ۳۰ لاکھ جاوا ۳ کروڑ بورنیو ۱۰ لاکھ سیلبیز ۵۰ لاکھ نیوگنی، فلپائن وغیرہ ۱۰ لاکھ

[2] سر آغا خاں نے ان جزائر میں ایک مشن روانہ کرنیکے لئے ایک کثیر رقم عطا فرمائی ہے۔

# جہاںؔ نما

دس سال کے بعد پھر سرزمینِ مغرب کو دیکھنے کا موقع ملا ہے اور اگرچہ وہ پہلا موقع تھا یہ دوسرا ہے اُس میں جدت تھی شائید اس میں اعادہ ہو لیکن مغرب مغرب نہ ہو اگر یہ جوں کی توں رہے۔ جب سے تہذیب کا سورج مشرق میں غروب ہو کر مغرب سے طلوع ہوا ہے اُس کی رونق کا بازار یہاں گرم رہتا ہے اور چمک دمک کے جویا یہیں آتے ہیں کہ تمدن کی نت نئی روشنی کو دیکھیں ۔

ہم فرانس میں ہیں جنوبی فرانس میں۔ یہ حصۂ ملک پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اسے "ساحلِ نیلگوں" کہتے ہیں یہاں انگلستان کے برعکس سورج کی آب و تاب ہمارے دیس کی سی ہے کہئیے کہ اک موسم بہار ہمیشہ شگفتہ رہتا ہے ملک کیا ہے باغ ہے چمن ہے۔ مارسیلز سے لیکر مشرق کی طرف ساحل کے ساتھ ساتھ آئیے تو بلا مبالغہ ایک اِنچ زمین نہیں جہاں سبزہ نہ ہو اور ایک فٹ زمین نہیں جہاں محنتی کاشتکار کی صنعت نے اُسے گلشن کا نمونہ نہ بنا دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر کے ساتھ اگر بیس پچیس مربع گز زمین ہے تو اُسی میں پھل پھلاڑی ہے اور بھی۔ استعمال بھی سجاوٹ بھی، یہ لوگ حُسن کو استعمال کرتے ہیں اور استعمال حسین طریقے میں کرتے ہیں۔ اگرچہ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم بھی انکے استعمال کے تمام ترطریق اختیار کریں ۔

مشرقی لوگوں سے فرانسیسی بہت ملتے جلتے ہیں۔ ہماری طرح کھاتے پیتے ہماری طرح بولتے چالتے ہیں ہماری طرح چیزوں اور لوگوں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہیں۔ جوشیلے ہم سے زیادہ ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں بس آپس میں لڑ پڑے دراصل بات چیت ہی کرتے ہیں۔ دُنیا کی خاموشی میں رنگیں رونق بکھیرتے ہیں۔ رنگیلے لوگ ہیں ۔

اِس حصۂ ملک کو یورپ کی صحت گاہ اور مقامِ مسرت سمجھنا چاہیئے۔ یُوں تو یورپ کے اکثر حصوں کو صحت کے لئے مفید اور نت نئی خوشیوں کی تماشا گاہ سمجھا جا سکتا ہے کچھ اس لئے کہ یہاں کی آب و ہوا زیادہ معتدل اور کم تھکانے والی ہے کچھ اس لئے کہ یہاں سب تمول اور عیش و عشرت کے جھولوں میں جھولتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے کہ یہ قومیں آزاد ہیں زندہ ہیں زندگی کا خون ان کی رگوں میں دوڑتا ہے آپس کے مقابلے سے ان کی بات بات میں چستی اور سود مندی کا پہلو نظر آتا ہے اور یہ لوگ جہاں لامذہب نہ بھی ہوں وہاں بھی محض قضا و قدر کے سہارے اپنے دن نہیں گذارتے بلکہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں

یہ حصۂ فرانس خاص طور پر یورپ کی صحت گاہ اور عشرت گاہ ہے سو یہاں بہت بیمار بہت تنومند دونوں طرح کے لوگ نظر آتے ہیں، انکے بیمار ہمارے تندرستوں سے زیادہ بشاش ہیں اور انکے تندرست ہمارے راجاؤں نوابوں سے زیادہ دُنیا میں مطمئن اور خود مختار ہیں +

اس صحت جوئی اور عشرت طلبی سے فرانسیسی لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پہلے ہی اُن کا مُلک نمونۂ باغ عدن ہے قدرت کا نام پہلے ہی حُسن ہے فطرت نے یہاں اس حُسن کو اپنی آراستگی سے اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اِنسان کی محنت کا ثمرہ قدرت اپنی نعمتوں سے ادا کرتی ہے سینکڑوں نہیں ہزاروں مکان سمندر کے کنارے ایسے ہونگے کہ انسان وہاں رہے تو بھُول جائے کہ میں دُنیائے "دارالمحن" میں ہوں، دومنزلہ سہ منزلہ چہارمنزلہ چھوٹے چھوٹے اور پانچ چھ سات آٹھ منزلوں کے بڑے بڑے بہت مکان ہیں کہ سامنے باغ ہے روشیں پھُول بیلیں فرنین چنار اور چیلوں کے درخت! کہیں پھُولوں کی محرابیں ہیں جن میں سے سمندر کا لہراتا ہُوا منظر دکھائی دیتا ہے کہیں اور ایسے ہی نمونے جن کے بیان کرنیکو آزاد کا قلم درکار ہے + نیس کے ساحلی مقام میں سمندر کے کنارے پیدل چلنے والوں کے لئے چھ سات میل لمبی پتھر کی بے گرد سڑک ہے جس کے ایک طرف دُنیا کے بہترین ہوٹل کھڑے ہیں اور دوسری طرف بحرِ روم کا نیلا نیلا پانی اُچھلتا کودتا ہے۔ اربابِ حکومت نے اسے اور اور شہروں کے اکثر حصّوں کو ایسا سجایا ہے کہ لوگ دُنیا کے چار اطراف سے اُنکے دیکھنے کو چلے آتے ہیں +

کہتے ہیں آج کل روپے کے بازار میں فرانک ارزاں ہے ارزاں تو ضرور ہے لیکن فرانس میں آئیے اور ان لوگوں کی آسایشوں کو دیکھ کر جی للچائے کہ ہم بھی اوروں کی طرح "اعلیٰ زندگی" کا نمونہ دیکھیں تو روپیہ پانی کی طرح بہنے لگتا ہے کام کرنے والوں کی چاپلوسی بھُلا دیتی ہے کہ آپکی جیب خالی ہو رہی ہے پھر روپیہ ختم ہُوا اور آپکو اپنا وطن یاد آیا +

روپے کے بغیر یُوں تو ہر جگہ ہی دُنیا میں گذارہ مشکل ہے لیکن یہاں تو روپے کے ساتھ سب کچھ ہے (ہمارے ہاں یہ حال نہیں) اور اُس کے بغیر کچھ بھی نہیں (اور ہمارے ہاں خدا کا سہارا ہے)!

ب

# فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۴ء

# جہاں نما

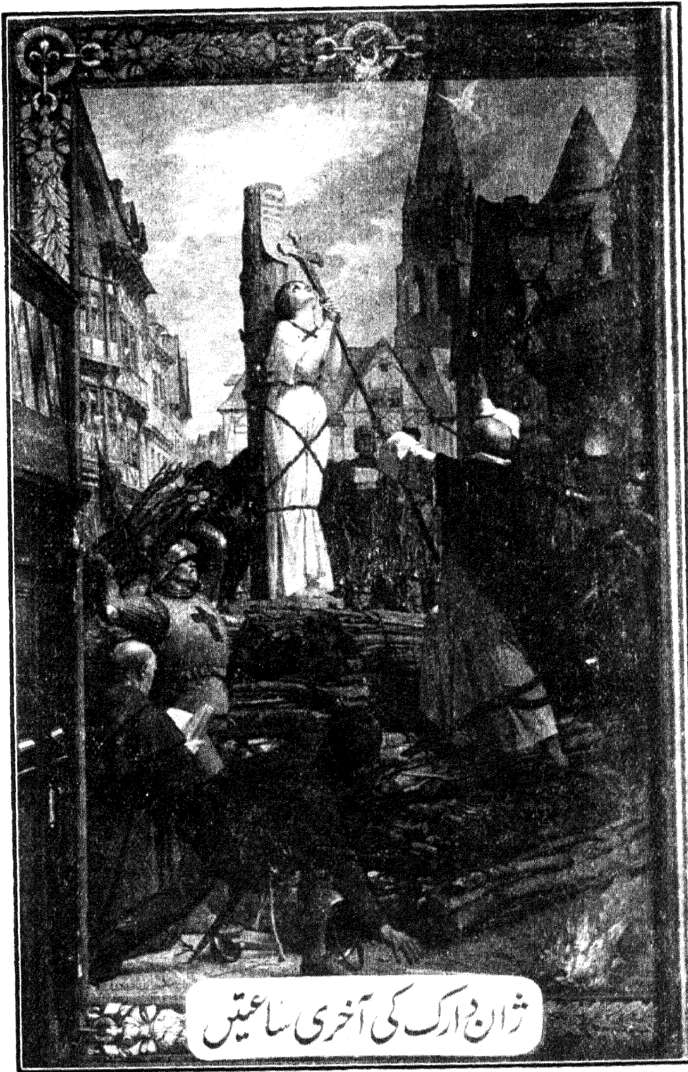
## پری سے ملاقات

گیارہ برس کے بعد پھر پری سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس عرصے میں ہم دونوں پر کیا کیا واقعات گذر گئے۔ ہم نوجوانی کے زمانے سے آگے بڑھ گئے لیکن یہ (اسے کوئی پارسا عجوزہ مکّارہ کہیگا) ایکدن بھی تو عمر میں زیادہ نہیں ہوئی ہم زندگی کی ٹھوکریں کھاکر ابھی سنبھلے نہیں اور یہ سب کو ٹھوکریں کھلانے والی پھر ہمیں ٹھکرانے کو مسکرا رہی ہے کہتی ہے" ابھی تو تم جوان ہو میرے ہاں ستر ستر برس کے بوڑھے جوانی کا جوش بنے بیٹھے ہیں ہوش میں آؤ اور میرے حضور اپنی توانائی کو پیش کرو" ہم ہندوستانی کہ یا ہمہ تن غرقِ عشرت یا سراپا عبرت و ایثار اسکے نام سے کانپتے ہیں دُور ہی سے اسکے ناز و ادا دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں ہموطنوں کو بتائینگے یہ کس بلا کی ہستی ہے!

ان گیارہ برسوں میں اس پری پر کیا کیا گذرا اب اس سے پُوچھئے تو اسے جواب دینے کی بھی فرصت نہیں لیکن اسکے پرستان میں سیر کیجئے اور نظرِ غور سے دیکھئے تو سب ماجرا مناظر میں منعکس ہو جاتا ہے۔ کس طرح المانیا کا دیو اس پر جھپٹا اسکے پرستان کو حسینوں کے خون سے رنگین کر دیا اسکے بیل بوٹے اسکے پھُول پودے سب مٹا دئیے توڑ لئے اُکھاڑ ڈالے اور چاہتا تھا کہ خود پری کو بھی اُڑا کر لیجائے لیکن یہ عیش و آرام کی دیوی اپنی غفلت کے تخت سے اُٹھی اور تلوار برہنہ کرکے دشمن سے گھتم گتھا ہوگئی۔ چار برس یہ لڑی اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا اسکے فدائی دُور دور کے مُلکوں سے اسکی مدد کو دوڑے اور وقت پر آپہنچے۔ یہ جو عشرت کے پانی میں تیرتی تھی اب غم و غصہ کے شعلوں میں کود پڑی خودداری اسکے سینے میں موجزن تھی اور دلیری اسکے ہاتھوں میں متحرک۔ اسکے مخالف سمجھے ہُوئے تھے کہ یہ جذبات میں مٹ چکی ہے لیکن نہیں اب یہ مصائب میں جاگ اُٹھی۔ گویا عشرت ہی نے اپنے آپکو بُھلا کر بیداری کا سبق پڑھا دیا۔

لیکن اب پھر عشرت کی راتیں ہیں اور یہ ہے ملک ملک کے حسن پسند یہاں آتے ہیں اور اپنے دنوں کو اسکی راتوں پر قربان کرتے ہیں۔ پیرس کا بُت جہاں دیکھئے عُریاں یا نیم عُریاں ہے درحقیقت یہ دُنیا کا عُریاں خانہ ہے۔ فن موسیقی نقاشی ہر شئے اپنی عُریانی میں جلوہ پاش ہے جسکے بیان کو "ایک رقاصہ" کے لکھنے والے کا قلم درکار ہے!

د ب



ژان دارک کی آخری ساعتیں

# وطن کی راہ میں

جبتک دنیا میں وطنیت کا جذبہ زندہ ہے ژان دارک غازیۂ فرانس ژان دارک شہیدۂ وطن کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ وہ مرگئی تاکہ وطن زندہ رہے، وہ جل گئی لیکن اک مُردہ قوم کو جلاگئی ژان دارک کے بعد فرانس متحد ہوگیا پھر اُسکی قومیت کو بیرونی اندرونی کوئی خطرہ نہ رہا وہ قربان ہوگئی اور اُسکی قربانگاہ پر فرانس نے اپنے اتحاد کا بُت نصب کردیا۔ حق یہ ہے کہ ژان دارک نے حُبّ وطن کو ایک مذہبی بلکہ روحانی درجہ بخشا +

جب وہ اپنی بالی عمر میں اپنے دیہاتی گھر میں اور اپنے باپ کے کھلے کھیتوں میں کام کیا کرتی تھی تو اُسے وہ آسمانی پیغام آیا اور بار بار آیا جس کا چھپائے رکھنا اُسکے لئے ناممکن ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک فرشتہ غیب کے ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار ہے جو وہ اُسکی طرف بڑھا رہا ہے کہ لے اور جا اپنے غلام مُلک کو آزاد کر۔ پہلے وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ہے وہ ایک دیہاتی لڑکی ہے اُسے اِن کاموں سے کیا سروکار مگر پیغام بار بار آیا اور اُس کا نہ سُننا محال ہوگیا۔ آخرکار وہ اپنے لوگوں کے طعنوں کے باوجود اپنا گاؤں چھوڑکر شہزادے کے لشکر کو گئی شہزادے سے ملی اُسے بتایا کہ تو حقیقی بادشاہ فرانس کا ہے اور مجھے تجھ کو تخت آرا کرنا ہے اُٹھ اور میدان میں اپنی فوج کو ڈالدے + خود سپہ سالار بنی اور دشمن پر جو اورلیاں کے شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھا جا پڑی۔ فرانسیسی فطرت جوش میں آگئی اور فتح پر فتح ہونے لگی جہاں پہلے شکست ہی شکست تھی + جب بہت سے شہر سر کرلئے تو شہزادے کو ریمز میں لیجاکر تاج پہنایا اور پھر اپنے جنگی کام پر چل نکلی جس کام کیلئے مامور ہوئی تھی اُس سے بڑھ کر قدم مارا پکڑی گئی اور قیدخانے میں بند کردیگئی +

انگریزوں کو یقین تھا کہ یہ جادوگرنی ہے جس نے اپنے جادو کے زور سے اُنکی سپاہ کو ہر جگہ سے بھگادیا۔ جادوگرنی ہونیکی سزا اُس زمانے میں آگ میں جلادینا تھا لیکن ثبوت لازم تھا + مہینوں اس دوشیزہ پر جرح کیگئی اُس پر طرح طرح کے ظلم کئے گئے یہانتک کہ اُس سے اُسکے جھوٹا ہونیکا اعتراف کرالیا۔ لیکن سانچ کو آنچ نہیں چندہی دنوں کے بعد پھر اُس نے اپنے پیغام کے آسمانی ہونیکا دعوے کیا۔ دوبارہ اُس پر جرح کیگئی اور ملزم قرار دیکر شہر کے چوک میں اُسے جلادیا گیا جب شعلے چاروں طرف سے بلند ہوئے تو اُس نے چلاّ کر کہا "میں سچی تھی میری آسمانی آوازیں اب بھی مجھے پکارتی ہیں" + جو درحقیقت سچے ہیں وہ ہمیشہ خدا کی آواز اپنے دل میں سنتے ہیں وہ دُنیا کے دُکھ درد سے بےنیاز ہیں!

ب۔ل

# اخلاقیاتِ اجتماعیہ

## ۲- شیرازۂ اجتماعی کی اخلاقی ترکیب

اس بحث میں ہم چاہتے ہیں کہ شیرازۂ اجتماعی کے اجزا اور اسکی ترکیب پر ایک نظر ڈالیں اور اس سلسلہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اخلاقی روشنی میں دکھانیکی کوشش کریں:-

حیات اجتماعی دراصل ایک شیرازہ ہے اور اس شیرازہ بندی سے جو علایق پیدا ہوتے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے مختلف حصے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان حصوں میں خصوصیت کے ساتھ جو قابل ذکر ہیں وہ خاندان، سوسائٹی، مذہب، حکومت، اور کاروبار ہیں۔ یہاں ایک ایک کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے:-

خاندان | اس شیرازہ بندی میں پہلی چیز خاندان ہے۔ اور اسکی بنیاد فطری الفت و محبت پر ہے اس زندگی پر ارسطو نے سیاسیات میں ڈیواس نے Studies of family life میں رکای نے Moral Philosophy اور ہیگل نے فلسفہ صواب میں خوب بحث کی ہے۔

خاندان کی ابتدا طفلی کی بیچارگی سے ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان جب آنکھ کھولتا ہے تو اسے اپنے ماں باپ کی صورت نظر آتی ہے، ان سے زیادہ اسکے ساتھ کوئی پیار محبت کرنے والا نہیں ہوتا اور وہی اسکو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں۔ خاندانی زندگی میں سب سے زیادہ اس کا تعلق انہی دونوں سے ہوتا ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے ماں باپ سے ادب محبت اور اطاعت کے ساتھ پیش آئے۔ انکی عزت دنیا میں سب سے زیادہ کرے، انکی خوشنودی کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھے، انکی خدمت اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے اور انکی اطاعت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کرے۔ والدین کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اولاد کی خبرگیری میں کوئی کوتاہی نہ کریں، اپنی ذاتی محبت یا منفعت کی خاطر انکی زندگی کو برباد نہ کریں، انکے اندر فضائل حسنہ پیدا کرنیکی کوشش کریں، انکی صحت اور قوائے عقلی و فعلی کے نشوونما کا خیال رکھیں، انکو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کریں اور اس تعلیم میں اپنی مرضی کو دخل دینے

کے بجائے انکی ذہنی قابلیت اور رجحان طبع کو مدنظر رکھیں، والدین کے بعد دوسرے خاندانی رشتہ دار بھائی۔ بہن، چچا ماموں، اور نزدیک دور کے اعزا ہیں۔ انسان اگر انکے ساتھ موانست و الفت کے تعلقات رکھے تو ان میں اپنے بہترین دوست پائیگا اور اسکی خاندانی زندگی بلکہ بیرونی زندگی بھی ایک حد تک خوشگوار گذریگی اور اگر ان تعلقات کو کشیدہ رکھے تو اپنے بدترین دوست بھی اسے انہی میں ملینگے اور اسے خاندانی مناقشات کی نہایت تلخ زندگی بسر کرنی پڑیگی۔ پس ہر شخص کا اخلاقی غرض ہے کہ اپنے خاندانی اعزا و اقربا سے خلوص، محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آئے۔ تیسرا درجہ خاندانی زندگی کا عملی پہلو ہے، یہ دو آدمیوں کے عمر بھر کا ساتھ ہے جس میں ایک دوسرے کے دُکھ درد، بھلائی برائی اور مصیبت و راحت کا شریک ہوتا ہے۔ اس کو ایسے اسلوب پر قائم ہونا چاہیئے کہ آپس میں محبت و موانست اور اعتماد ہو۔ اگر یہ تعلق باہمی محبت پر قائم نہ ہو تو دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور دنیا کا کوئی قانون اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی چیز جس کا ان تعلقات کو قائم کرتے وقت لحاظ رکھنا ضروری ہے انتخاب، توافق مزاج، نکاح کے مقصد، اور حیات منزلی کی نزاکتوں کو سمجھ لینا ہے۔ عام طور پر ان باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا، اسی لئے اکثر شادیاں ناکام اور حسرت انجام ہوتی ہیں۔ سوشل ریفارم کا بہترین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان خرابیوں کو دُور کرنے کے لئے عوام کی اخلاقی تربیت کرے اور انہیں شادی کے صحیح اصولوں سے آگاہ کرے۔

**دوستی** خاندانی زندگی کے بعد دوسرا درجہ دوستانہ زندگی کا ہے۔ انسان جب ذرا ہوش سنبھالتا ہے، اور اپنے گھر سے نکلکر باہر کی دُنیا کو دیکھتا ہے تو اسے اپنے میلان طبع یا اپنے اثرات ماحول کے مطابق ایک سوسائٹی ملتی ہے اور اس میں وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ تعلقات قائم کرتا ہے۔ یہ اسکی دوستانہ زندگی ہے جسکو حیات اخلاقی میں بڑا دخل ہے۔ صحبت جس قسم کی بھی ہو اکثر انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے اور عام طور پر وہ نہ صرف عادات، خصائل اور خیالات میں اس سے اثر لیتا ہے، بلکہ اپنی عملی زندگی میں کوئی ایک لائن اختیار کرتے وقت بھی اسکی صحبت اور سوسائٹی اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ دوست کے اندر اپنی ہی ذات ایک دوسرے قالب میں مل جاتی ہے، اور اس طرح اپنی شخصیت کا دائرہ بعنوان حسین نسبتہً وسیع ہو جاتا ہے۔" اس زندگی کے لئے کوئی قانون اور آئین نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ ہر دوستانہ صحبت نئے حالات اور نئے خیالات میں ایک جدا نہج و اسلوب

پر واقع ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ایک اخلاقی اصول ہے کہ انسان اپنے لئے ایک اچھی صحبت کو تلاش کرے دوستانہ تعلقات کو خلوص پر قائم کرے، اور دوستوں کے ساتھ اس ڈھنگ سے علائق و روابط قائم کرے کہ وہ اغراض پر تو مبنی نہ ہوں، مگر زندگی کے اعلےٰ نصب العین کو حاصل کرنے میں پوری پوری مدد دیں۔

مذہب | سب سے زیادہ زبردست چیز جو حیات انسانی پر اثر ڈالتی ہے وہ مذہب ہے۔ اسکی بنیاد روحانیت پر ہے، اس لئے وہ تمام مادی اثرات پر تفوق رکھتا ہے، اور روحانیت بھی ایسی کہ اسکے عقائد اور اصول انسان کی ذہنی دنیا پر حاکم ہوتے ہیں، ماں باپ اور آل اولاد کی محبت، میاں بیوی کی الفت، دوستوں کی دوستی، حتیٰ کہ خود اپنی جان کی فکر سب کچھ اسکے سامنے ہیچ ہے اسکے ہاتھوں میں انسان کی باگیں ہیں، وہ جدہر چاہے اسکو موڑ دے اور جس طرف چاہے اسے مائل کر دے۔ جماعتوں کے ذہنی ارتقا اور انکے اخلاقی نظام کی تخلیق کا دار و مدار بڑی حد تک اسی پر ہے، مثلاً جس قوم کا مذہب ترک دنیا اور رہبانیت کے اصول پر قائم ہوگا وہ تمدن و عمرانیت سے ناآشنا رہیگی، جس قوم کے مذہب میں احترام حیات اور اہما کے اصول غالب ہونگے وہ فطرتاً فوجیت اور جنگی روح سے محروم ہوگی، جس قوم کا مذہب فضائل اخلاق اور فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم ہو گا وہ لازماً بلند اخلاق اور عالی حوصلہ ہوگی۔ وقس علی ہذا۔ پس یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو اپنے مطمح نظر کی تکمیل میں سب سے زیادہ جو چیز مدد دیتی ہے وہ اس کا مذہب ہے یہاں موقع نہیں کہ تفصیل کے ساتھ ایک سچے فطری مذہب کے اصولوں پر بحث کیجائے اور یہ بتلایا جائے کہ جماعت انسانی کے لئے کونسا مذہب ایسا ہے جس پر عمل کرکے وہ اپنے اخلاقی نصب العین کو حاصل کرسکتی ہے، کیونکہ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، البتہ اخلاقی حیثیت سے صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ خواہ کوئی مذہب ہو، بہر حال لا مذہبیت سے بہتر ہے، اور اگر اسکے بنیادی اصولوں پر غور کیا جائے تو ضرور وہ کسی نہ کسی بلند اخلاقی مقصد کو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ پس دنیا سے مذہبی تعصب اور عناد کو مٹانا ہر اس شخص کا فرض ہے جو دنیا کو بلند اخلاق اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور اسکے ذریعہ اپنے اخلاقی نصب العین کو تلاش کرنے میں پوری طرح آزاد ہو، دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہ ہو، اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اور کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے صرف اس بنا پر عناد و مخالفت نہ رکھے کہ اس کا تعلق دوسرے مذہب سے ہے۔ اسکے

ساتھ ہی ہر شخص کو پورا حق حاصل ہو کہ اپنے نزدیک جس مذہب کو حق پر سمجھتا ہے، اسکی طرف بغیر کسی دوسرے مذہب پر حملہ کئے، اپنے ابنائے نوع کو دعوت دے، اور مقصد صرف یہ پیش نظر رکھے کہ اس کا فرض اپنے خیال کے مطابق دوسروں کو راہ حق دکھانا ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چونکہ دنیا اختلافات مذہبی کے جھگڑے میں پڑی ہوئی ہے، خصوصاً ہمارا ملک اس بلائے عظیم کے باعث سخت اخلاقی انحطاط میں پڑا ہوا ہے، اس لئے عام مذہبی آزادی و رواداری کی تحریک فلاح انسانی کیلئے بہت ضروری ہے۔

حکومت | اجتماعی تعلقات کی سب سے زیادہ بالادست قوت حکومت ہے۔ درحقیقت اس کا منشا یہ ہے کہ اجتماعی قویٰ کو ایک مرکز پر قائم کرے، اجتماعی نظام کو عادلانہ تنظیم کے اصول پر آئین و قوانین کے ذریعہ منتظم کرے، جماعت کو شر و فساد کے مادوں سے محفوظ رکھکر امن و امان کے ساتھ ترقی کرنیکا موقع دے، جماعت کے لئے وہ تمام ضروری سامان بہم پہنچائے جو اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں، اور دوسری قوموں کی دراز دستی سے جماعت کی پرامن زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے دفاع کا انتظام کرے۔ ان فرائض کو ادا کرنے کے لئے اس کا حق ہے کہ جماعت سے اپنے جائز احکام و قوانین کی اطاعت کا مطالبہ کرے، ان انتظامات کے لئے جتنا روپیہ ضروری ہے وہ تضریب محاصل کے ذریعہ وصول کرے، اور جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے جن قوانین کی ضرورت ہے وہ وضع کرے۔ یہ حکومت کوئی خارج از جماعت شئے نہ ہونی چاہیئے اور نہ کسی خاص فرد یا چند افراد کی ذاتی ملک ہونی چاہیئے بلکہ وہ جماعت کے لئے اور جماعت ہی کی ہونی چاہیئے۔ جماعت ہی اپنی آزاد رائے عامہ سے، اسکے منتظمین کو مقرر کرے، جماعت ہی کی مرضی کے مطابق وہ حکومت کا انتظام کریں، جماعت ہی سے انکو قوت حاصل ہو، اور جماعت ہی کی بہتری کے لئے وہ اس قوت کو صرف کریں۔ اور جماعت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ جب راعیین حکومت اسکی مرضی کے مطابق کام نہ کرسکیں یا اپنی ذاتی رائے کا جماعت کو غلام بنانے کی کوشش کریں تو وہ انکو الگ کرکے دوسرے آدمیوں کو مقرر کرے۔

حکومت کا صحیح اخلاقی معیار دراصل یہی ہے، مگر چونکہ حکومت کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں اپنے جیسے انسانوں کی باگیں ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھوں میں آتی ہیں، اور ایک انسان کے لئے اس میں بڑی لذت ہے کہ اسی جیسے ہزاروں انسان اسکے آگے جھکیں اور اسکی غلامی کریں، اس لئے قوی الارادہ اور غیر معمولی قابلیتوں کے انسانوں نے حکومت کو اپنی ذاتی ملک بنا کر دنیا میں شخصی واستبداری

حکومتوں کی بنیاد ڈالدی ہے جو درحقیقت ایک غیر طبعی اور غیر اعتدالی حالت ہے، اسکے ماتحت جماعت کے قوائے ذہنی وعملی ترقی کرنیکے بجائے انحطاط کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ اپنے صحیح نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسانی جماعتوں کو اس بلا سے نجات دلائے اور دنیا سے غاصبانہ نظام حکومت کو مٹا کر سچے اصول عدل پر حکومت کی بنیادوں کو قائم کرے۔ چونکہ حکومت کے ہاتھوں میں جماعت کی تمام مادی قوتیں ہیں جنکے صحیح یا غلط استعمال پر جماعت کے تمام مادی و اخلاقی قویٰ کے ارتقا و انحطاط کا پورا پورا انحصار ہے، اسلئے ایک صحیح نظام حکومت کا قیام جماعت کے لئے ہر حیثیت سے نہایت ضروری ہے ✦

**کاروباری زندگی** | کاروباری زندگی انسان کی خالص عملی زندگی ہے جس کی بنیاد صرف معاملات و معاہدات پر ہے۔ وہ انسان کے لئے میدان عمل ہے جس میں اگر وہ کامیاب اُترے تو اسکی زندگی کامیاب، اور ناکام ہو تو اسکی زندگی ناکام ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ خالص مادی زندگی ہے، مگر اس کو اخلاقی زندگی میں بھی بڑا دخل ہے کیونکہ انسان کی صحیح اخلاقی تکمیل اسکے معاملات ہی میں ہوتی ہے۔ اس لئے اخلاق کو جماعت کے کاروباری نظام کی اصولی تنظیم میں ایک حد تک دخل ہونا چاہیئے۔ معاملات کا یہ پہلو کہ ان میں کن چیزوں کو بڑھانا اور کن کو گھٹانا چاہیئے، اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور یہ سوال کہ کن طریقوں پر معاملات کامیاب ہوسکتے ہیں اور ان پر کس طرح عمل کرنا چاہیئے، اس کا جواب سیاسیات اقتصادیہ کے ذمہ ہے ✦

کاروباری زندگی میں مساویانہ تعلقات کم تر اور بالادستی و زیردستی کے تعلقات بیشتر ہوتے ہیں ان میں ایک دوسرے کے انسانی حقوق کا احترام واجب ہے، جو شخص کسی کے حقوق میں دست اندازی کرے یا اسکو زیردست سمجھ کر ذلیل کرے، یا اپنے جیسا انسان نہ سمجھے تو اسکی بالادستی کے زور کو توڑنا سوسائٹی کا فرض ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کاروباری تعلقات میں ماتحتی و زیردستی کی حد بندی کردی جائے، اور اسکو غلامی کے درجہ تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اسی طرح چونکہ معاملات کی بنیاد معاہدات پر ہے اس لئے معاہدات میں دیانت و صداقت کو ہر بات پر مقدم رکھا جائے اور سوسائٹی کی متحدہ قوت ہر کاروباری شخص کو راستبازانہ اصول پر کام کرنے کے لئے مجبور کرے ✦✦

(باقی آئندہ)

# فیثاغورث

**نام اور ولادت** | فیثاغورث نام، باپ کا نام مینارسوس۔ ۵۸۰ء ق م میں صور نامی گاؤں میں پیدا ہوا، یہ شام کے نواح میں ایک خوش منظر مقام تھا۔ نجابت اور شرافت میں ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اس کا خاندان بہت ممتاز تھا۔

**وطن کی تحقیق** | بعض مورخوں کو صور کے وطن ہونے سے اختلاف ہے، وہ ساموس کو وطن لکھتے ہیں لیکن یہ غلط ہے، ساموس وطن نہیں بلکہ دار الامن ہے۔

**جلاوطنی** | اس زمانہ میں بابل پر افشورس کی حکومت تھی، جو نہایت جابر و ظالم اور بد انتظام تھا۔ ملک میں چاروں طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی، کہیں کوئی قاعدہ قانون نہ تھا، رعایا کا جان و مال ہر وقت خطرہ میں تھا، زور آوروں نے کمزوروں کو، اور رذیلوں نے شریفوں کو جینا مشکل کر دیا تھا۔ شام کے مشہور غارت گر جنگجو قبیلے (سقوروں، لیموں اور میقروں) قتل و غارت پر تلے ہوئے تھے، جس طرف نکلجاتے قتل و غارت کا طوفان اُٹھا دیتے تھے، شہر ویران اور آبادیاں بن ہوگئی تھیں، صور پر جب ان غارت گروں نے دھاوا کیا تو ساری آبادی کو اپنے گھروں سے بیک بینی و دوگوش نکلنا پڑا، اور مدتوں کے رہنے سہنے والے آوارہ و بے خانماں ہو گئے۔ اسی ہنگامۂ رستخیز میں مینارسوس اپنے اہل و عیال کو لیکر صور سے نکلا، اور کئی برس امن و معاش کی تلاش میں سرگرداں رہا، جہاں سنتا کہ امن و معاش کی فراوانی ہے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کو لیکر جاتا، مگر صور سے نکلنے کے بعد امن آسمانوں میں چلا گیا تھا، اور بدنصیبی و نامرادی ہر جگہ سایہ کی طرح ساتھ رہتی تھی۔ اُن دنوں انطاکیہ کی بڑی شہرت تھی، مُصیبت کا مارا وہاں گیا قسمت نے سوتے سے کروٹ لی، کچھ آس بندھی، لیکن ابھی صحرا نوردی کی تکان بھی نہ اُتری تھی کہ پھر بُرے دنوں نے آگھیرا، سفوروں نے چڑھائی کی اور سارے شہر کو ویران کر دیا۔

**ساموس کا قیام** | اب مینارسوس نے ساموس کا رُخ کیا۔ یہ مُلکِ یونان کا ایک نہایت سرسبز و شاداب جزیرہ تھا، اور اس کی حکومت ایک ایسے شخص (اندرو ماڈس) کے ہاتھ میں تھی، جو نہایت رحمدل، خلیق اور متواضع تھا۔ وہ ایسے لوگوں سے بہت ہمدردی کرتا تھا، اور تا بہ مقدور اس نے تمام

مصیبت زدوں کی بہت دستگیری کی۔ لیکن مینارسوس کے لئے یہاں ایک اور آسانی تھی کہ یہ اسکی بیوی کا میکا تھا۔ اس لئے یہاں بہت خاطر تواضع ہوئی، اور خدا نے امن کے ساتھ روزی کے دروازے بھی کھولدیئے

تعلیم و تربیت | اندرو ماؤس حاکم ہونے کے ساتھ بڑا علم دوست اور ادب و موسیقی کا ماہر تھا۔ مینارسوس کے علم و اخلاق نے دونوں کو یک جان دو قالب کر دیا، اور یہ باہم اس طرح رہنے لگے جیسے ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ فیثاغورث اپنے باپ کی اولاد میں سب سے چھوٹا اور بالکل نوعمر تھا، مگر اس نوعمری میں اس میں وہ دلنواز ادائیں تھیں کہ جو دیکھتا فریفتہ ہوجاتا، ذہانت، ذکاوت، جودت و متانت اور ادب و تہذیب کے جوہر نے اسکو اور چمکا دیا تھا۔ مینارسوس اسکو اپنے خاندان کا چشم و چراغ سمجھتا تھا۔ اندرو ماؤس نے جب اسکو دیکھا تو کہا کہ اس بچہ کو مجھے دیدو، میں اسے تعلیم دلاؤنگا، اس سے تمہارا میرا دونوں کا نام روشن ہوگا۔ مینارسوس نے یہ بات منظور کر لی۔ اس نے ادب و موسیقی کی انتہائی تعلیم دی، کریو فیلوس سے مختلف علوم کے مبادی پڑھوائے، اور پھر اپنے بھائی الیماندروس کے پاس منطون بھیجدیا، جو نجوم، فلکیات اور ہندسہ میں بڑا فاضل مانا جاتا تھا۔ چند سال میں اس نے یہ علوم بھی حاصل کر لئے، اور یہاں سے رخصت ہو کر اسکیروس کے حکیم فریسیدس کے پاس پہنچا، وہ علوم طبیعی کا بڑا عالم تھا، اور روح کے بارے میں بھی ایک خاص عقیدہ رکھتا تھا۔ یہاں سے پڑھ لکھ کر طالیس کے مدرسہ میں داخل ہوا، اور ریاضیات کی تکمیل کی۔ اس کے بعد بابل کے مشہور حکیم اریان سے الٰہیات اور ایلیون کے نامور حکیم فاراقودیس سے حکمیات کا درس لیا۔ ان علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد جب سا موس کو واپس آیا، تو یہاں مودر قیطس اور دراماتیس نامی دو بڑے فلسفیوں سے ملاقات ہوئی، جو مختلف علوم کے یگانہ و یکتا اُستاد تھے۔ کئی برس ان کے فیض صحبت میں رہ کر اخلاق و طریقت کے معارف سیکھے۔

ذوق علمی کی بے پایانی | لیکن علم کا دریا بے تھاہ ہے، جتنا بڑھتے جاؤ گہراؤ زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ فیثاغورث اس پیمایش علمی میں تیس برس سے زیادہ زمانہ بسر کر چکا تھا، مگر اب بھی جب اس نے دیکھا تو دریا کا پاٹ بڑا تھا، اور وہ پایاب پانی میں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پوری زندگی اسی کام میں گذاریگا، اور اس کے عشق میں دنیا و مافیہا سب کو فراموش کر دیگا۔ چنانچہ وہ آخر لمحۂ حیات تک اسی میں مصروف رہا، ساری عمر میں ایک دن بھی چین و آرام سے نہ بیٹھا، لذت و آسائش اسکے لئے ایسے لفظ تھے جن کا کوئی مفہوم نہیں، اسکے دل میں ایک ہمیشہ سرگرم رہنے والا ولولۂ طلب، اور پاؤں میں مدام سرگرداں رکھنے والا چکر تھا

مصر، کلدان، فینیقیہ، بابل، سیریا، ایران اور ہندوستان کا کوئی گوشہ علم و فضل ایسا نہ تھا جس کی خاک اس نے نہ چھانی ہو، اور زر خالص کے ذروں سے اپنا دامن نہ بھر لیا ہو۔ وہ اس زمانہ میں اپنی جامعیت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا عالم تھا۔

مصر، شام وغیرہ کا سفر | مصر علوم و فنون کا مرکز تھا، یہاں آیا اور سب سے پہلے یہاں کی زبان سیکھی، یہاں اس زمانہ میں کئی قسم کے خط رائج تھے، ایک بادشاہوں کا، دوسرے تاجروں کا تیسرے کاہنوں کا۔ اس نے ان سب میں پوری مہارت حاصل کی اور مصریوں کے علوم و فنون میں بھی اچھی خاصی دستگاہ پیدا کر لی۔ لیکن وہ جس خاص علم کا طالب تھا مصریوں نے اسکی ہوا بھی نہ لگنے دی، اور باوجود اسکی کوشش و التجا کے اسکے سکھانے سے صاف انکار کر دیا، یہ علم آلہیات تھا۔ آخر وہ مایوس ہو کر مصر سے نکلا۔ کچھ دنوں شام کے علماء سے استفادہ کیا، سریانی زبان سیکھی، پھر فینیقیوں کا مطالعہ کیا، اور ارض بابل کے فلکی مذہب کے معارف حاصل کئے۔ اسکے بعد ایران گیا، یہاں زردشت کی مذہبی حکومت قائم ہو رہی تھی، اور وہ خدا کی کھوئی ہوئی مخلوق کو اس تک پہنچنے کا راستہ دکھلا رہا تھا، یہ اسکی خدمت میں پہنچا، اور چونکہ بڑا عالم تھا، اس لئے اسکی نظروں میں بہت معزز ہو گیا، اور اسکے تمام اسرار و حکم سے واقفیت حاصل کر لی، یہاں سے نکل کر وادی گنگا کا رُخ کیا، اور اُس مقدس گیانی کے حلقہ میں داخل ہوا، جو اپنے اہل وطن کو مکتی کی راہ دکھلا رہا تھا، دنیا کی نیستی، زندگی کی بے اعتباری، رُوح کی صفائی، تناسخ، عمل، ترک حیوانات اور پاکدامنی کے بلند خیالات وہ ان ہی دونوں نیک انسانوں سے لیکر گیا تھا۔ یہ دونوں سفر اسکی آئندہ زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ خیالات و معتقدات کے ساتھ اسکی معاشرت بھی بدل گئی وہ "ایک مذہب" کے جھگڑے سے نکل گیا، حق پرستی اور خداشناسی اسکے دل میں راسخ ہو گئی اور دنیا کی طرف سے اس نے اپنا منہ موڑ لیا۔ وہ کہتا تھا کہ دُنیا کی ہستی وہم آفریدہ ہے، اس پر اعتبار کرنا دیوانگی اور اسکی باتوں پر جان دینا اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

وطن کو واپسی | اس کسب و اکتساب کے بعد جب یہ خرد علم وطن واپس آیا، تو سارے میں اسکی آمد کا شہرہ ہو گیا، چھوٹے سے بڑے تک سب نے نیازمندانہ دست بوسی کی۔ اسکی گذشتہ اور ابتدائی زندگی انکے سامنے تھی، اور وہ بچپن سے اسکو نیک اور صالح بچے کی حیثیت سے جانتے تھے، اس لئے اب جو زاہد و مرتاض رنگ میں دیکھا، اور عارفانہ خیالات سنے تو خیال کرنے لگے کہ یہ ضرور دیوتاؤں کا

پیارا ہے، یہ خیالات صرف عوام ہی کے نہ تھے بلکہ امراء علماء، اور مذہبی پیشواؤں کے بھی تھے۔ چنانچہ ساموس کا مذہبی سردار فولوقراطیس اسکا بہت احترام کرتا تھا، اس سے اسکو بہت فائدہ ہُوا، اور اسے موقعہ ملا کہ وہ اپنی دیرینہ آرزو پوری کرے۔

**مصر کا دوسرا سفر**

فولوقراطیس کے امی سس فرعونِ مصر سے بہت گہرے تعلقات تھے، فیثاغورث نے اس سے خواہش کی کہ فرعونِ مصر کو ایک خط لکھ دے تاکہ وہ اسکے اثر سے کاہنانِ مصر سے انکا آلہیات حاصل کر سکے۔ اس نے فرعون کے نام خط لکھ دیا، اور بہت کچھ تعریف کی۔ فرعون بہت عزت و حرمت سے پیش آیا، اور کاہنوں کو حکم دیا کہ اپنے تمام علوم تعلیم کریں۔

**کاہنوں کا بخل**

اب وہ شاہی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے، پڑھانا شروع کیا، اور اپنے تمام علوم کے مبادی خوشی خوشی پڑھا دئے، لیکن گُر کی باتیں اب بھی نہ بتائیں، فیثاغورث نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کچھ کہیں، مگر وہ بہرے گونگوں کی طرح چُپ ہو گئے۔ آخر مجبور ہو کر امی سس سے شکائیت کی اس نے ان لوگوں کو بلا کر بہت ڈانٹا۔ اور سزا کی بھی دھمکی دی۔ اس پر انہوں نے کچھ اور پڑھایا، لیکن دل کی گرہ اب بھی نہ کھُلی، اور اِدھر اُدھر کی بے سر و پا باتوں پر ٹالنے لگے۔ فیثاغورث شاہی حمایت کے بل پر تھا، اس نے کہا کہ اگر وہ سیدھی طرح نہ پڑھائینگے، اور اسی طرح ٹالتے رہینگے تو اسے پھر شکایت کرنی پڑیگی اس سے انکے دلوں میں کچھ کچھ خوف پیدا ہُوا، اور وہ لوگ ذرا نرم پڑے، مگر بخل کے شیطان نے لبوں پر پھر مُہر لگا دی، اور انہوں نے علم کے اس شیدائی کو امتحان و آزمائش کی مصیبتوں میں ڈالدیا، اور کہا کہ ان آزمائیشوں میں پورا اُترنے پر علوم حقہ تعلیم کئے جائینگے۔

**مصائب و تکالیف**

فیثاغورث نے خوشی خوشی ان کی تمام باتیں مان لیں، اور جتنے زمانہ تک انہوں نے جو جو امتحان لئے، سب میں پورے نمبروں کامیاب رہا۔ مگر خدا جانے وہ کیسے سنگدل تھے کہ اس پر بھی نہ پسیجے۔ امتحانوں کی منزل سے گذرنے کے بعد اور کوئی بات باقی نہ رہی تو جسمانی تکلیفیں دینے لگے، برہنہ کرکے معائنوں کی شرطیں لگائیں، کئی کئی مہینہ بے آب و دانہ رہنے کی تلقین کی، اور مدتوں مصر سے مدینتہ الشمس، مدینتہ الشمس سے ینتق، ینتق سے دیوسیونس کے چکر لگوائے، اور ہر جگہ کی خانقاہوں میں مہینوں سخت سخت ریاضتیں کرائیں۔ لیکن یہ شوق طلب کا پتلا مردِ ہر میدان تھا، کہیں اور کسی بات میں ہیٹا نہ رہا، اور اپنی ہمت، ثابت قدمی، جوش طلب، اور مستقل مزاجی سے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ

اسے اپنے علم سینہ کا راز دار بنالیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آلہیات اور سلوک کی متوسط تعلیم دیدی لیکن جو پتہ کی باتیں تھیں انکو پھر چھپا گئے۔ فیثاغورث نے انکے معلوم کرنے پر جب بہت زیادہ اصرار کیا، توانہوں نے کہا کہ آگے جو باتیں ہیں، وہ غیر مذہب والوں کو نہیں بتائی جاسکتیں، اگر تم انہیں معلوم کرنا چاہتے ہو تو ہمارا مذہب اختیار کرلو، اور کم ازکم ایک سال تک باقاعدہ مجاہدہ کرو، اس کے بعد تم اس قابل ہوسکوگے کہ تمہارا دل عالم حقائق کی تجلیوں کا کاشانہ بن سکے، اور علوم حقہ کے رموز و اسرار تمہاری سمجھ میں آسکیں ؞

ترک مذہب | فیثاغورث کے لئے یہ بہت اہم سوال تھا، وہ اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا، اور اسکی اشاعت کرنا اپنا پہلا انسانی فرض سمجھتا تھا۔ لیکن علم حقیقت کی سچی طلب مذہب کی ظاہری پابندیوں پر غالب آگئی اور وہ اپنا مذہب چھوڑ کر مصریوں کا مذہب قبول کرنے پر طیار ہوگیا۔ اس نے کہا :۔ میں نجات کا آرزو مند ہوں، اپنی حقیقت کو پانا میرا نصب العین ہے، خواہ کوئی راہ دمنزل ہو مگر میرا مقصود وہی ذات پاک و بے نیاز ہے، یہ بات جس سے اور جہاں سے حاصل ہوسکیگی میرا سر نیاز اسی آستانہ پر جھک جائیگا۔ تم کہتے ہو کہ یہ مقصد ہمارے مذہب کو اختیار کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے، تو لو میں اپنے مذہب کو چھوڑتا ہوں؛ اسکے بعد اس نے ان کی مذہبی رسمیں ادا کیں اور ایک سال کے مجاہدے کی نیت سے ایزیس سیریز کی خانقاہ میں معتکف ہوگیا۔ جب یہ مدت پوری ہوچکی تو کاہنوں نے اپنے سلوک و آلہیات کے اسرار و حقائق تعلیم کئے، اور فرداً فرداً وہ لوگ جو کچھ جانتے تھے وہ سب اس ایک نے جان لیا، اور اپنے وسیع علم و فضل سے اسکو اتنی ترقی دی اور اس میں ایسے ایسے لطیف و نازک معانی پیدا کئے کہ اس کے استادوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے ؞

فضیلت علمی | جب یہ مشک نافہ سے نکلا تو وادی نیل اسکے تبحر علمی وخدارسی کے شہروں سے گونج اُٹھی۔ بچہ بچہ کی زبان پر اس کا نام جاری ہوگیا، اور بڑے بڑوں کے سر عقیدتمندانہ اس کے آگے جھکنے لگے۔ خود اسکے استادوں نے بھی اسکے فضل و کمال کا لوہا مان لیا، اور جن خانقاہوں میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہُوا تھا اب استاذ الاساتذہ کی شان سے درس دینے لگا۔ فرعون (امی سس) بھی اس سے ملنے آیا، اور ہاتھوں کو بوسہ دیکر سارے ملک کی دینی سیادت کا عہدہ تفویض کیا۔ سرزمین اہرام اسے زندہ دیوتا سمجھتی تھی کیونکہ صدق و دیانت تقوےٰ و طہارت، نیکی و پارسائی، محنت و جفاکشی، ایثار و قربانی اور بے نیازی

میں وہ اپنی نظیر آپ تھا۔

ترک اعزاز | یہ دیکھ کر مصری کاہن اس سے جلنے لگے۔ مگر وہ دنیا کی مردار ہڈی پر جان دینے والوں میں نہ تھا اسکی فطرت بلند اور اسکی نظر وسیع تھی، وہ ظاہری دولت و امارت کو بہت ہی حقارت سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ اسکے اُستاد اور رہنما اس کی اس عزت و سربلندی سے حسد کی آگ میں جل رہے ہیں، تو وہ ان کا عہدہ انکے لئے چھوڑ کر مصر سے نکل کھڑا ہؤا، پہلے صور آیا، یہاں اس زمانہ میں قراطیس نامی ایک بادشاہ برسر حکومت تھا، اسکو فیثاغورث کا رہنا خطرناک معلوم ہؤا، خصوصاً جب اس نے دیکھا کہ ساری آبادی اسکی عقیدتمند ہے اور اسکے خیالات بہت آزادانہ ہیں، صور سے نکل کر کچھ دن انطاکیہ میں رہا اور پھر ساموس چلا آیا۔ ساموس کی عنان حکومت اس وقت تک اس کے محسن دوست فولوقراطیس کے ہاتھ میں تھی، اس نے اپنے فرشتہ صفت فاضل دوست کا بڑی تعظیم و تکریم سے استقبال کیا اور ملکی کاروبار بالکل اسی پر چھوڑ دئیے۔

تعلیم و تدریس | فیثاغورث نے یہاں رہ کر تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، تمام اہل ساموس اور اسکے قرب و جوار کے طالب علم اسکے گرد جمع ہو گئے۔ فولوقراطیس نے اسکی فرمائش سے شہر کے اندر ایک مدرسہ اور باہر ایک بیت الحکمت بنوا دیا، جہاں وہ علوم دینی کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن بیت الحکمت کے داخلہ کی شرائط بہت سخت اور اس کی تعلیم کا معیار بہت بلند تھا، سب سے پہلے ہر طالب علم کا امتحان لیا جاتا تھا اور جن علوم کی کمی ہوتی تھی ان کی تعلیم دی جاتی تھی، پھر پانچ برس تک بالکل چپ رہ کر ریاضت و مجاہدہ کرنا ہوتا تھا، اور اپنا تمام مال و متاع مدرسہ کے خزانہ میں داخل کر کے قوتِ لایموت کی ضرورت کے موافق لینے کی اجازت دی جاتی تھی، جو طالب علم ان شرائط کی پابندی کرتے تھے ان کو حکمت و معرفت کی باتیں سکھائی جاتی تھیں، اور جو پابندی نہیں کر سکتے تھے، یا دوران امتحان میں غلطی کر جاتے تھے ان کا مال ان کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ اس طریق تعلیم کا ملک کی عام علمی اور اخلاقی حالت پر بہت اچھا اثر پڑا، عوام و خواص سب میں اعلیٰ ذوق علمی پیدا ہو گیا، نیکی و پارسائی کے خیالات ترقی پا گئے، اور دنیا داری کا انہماک کم ہو کر بنی نوع سے محبت، خدا سے ملنے اور نجات حاصل کرنے کے جذبات عام ہو گئے۔

ساموس کی حکومت | فولوقراطیس کے بعد جمہور کی مرضی اور انتخاب سے فیثاغورث حاکم ہؤا۔ وہ اگرچہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا، اور ان کو پاپ سمجھ کر بھاگتا تھا، لیکن جمہور کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے اس نے

ان کی بات مان لی، اور بعد کو ایک اور شخص کو منتخب کرا کے خود اطالیہ چلا گیا۔

کروتونہ کی بود و باش | اس زمانہ میں اطالیہ کی حالت بہت خراب تھی، علمی، تمدنی، اخلاقی، مذہبی، ہر حیثیت سے پستی و زبونی چھائی ہوئی تھی، مگر جنوبی اطالیہ کچھ بہتر تھا۔ فیثاغورث نے اپنی بود و باش کے لئے اسی کے ایک شہر (کروتونہ) کو پسند کیا،

غربا کی اصلاح | رومی شہروں میں غربا کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ امرا و عمال ان سے جانوروں کی طرح کام لیتے اور ظلم و ستم کرتے تھے۔ فیثاغورث سے یہ حالت نہ دیکھی گئی، اسکو ظلم و ستم اور ناجائز امتیاز سے سخت نفرت تھی، یہاں رہ کر اس نے اپنی تمام توجہ غربا کی اصلاح پر صرف کردی، انکو تعلیم و تربیت دیکر معزز و باعزت زندگی کے طریقے سکھائے، محاسن و فضائل اخلاق کی پاکی سے سر بلند کیا، مساوات اور عزت نفس کے جذبات پیدا کئے، خداشناسی کی تعلیم دی، اور امرا کو آمادہ کیا کہ وہ انکے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آئیں، اور اس طرح اپنی قومی و ملکی حالت کی اصلاح کریں، ورنہ اگر یہ نفاق و شتقاق کی خلیج اسی طرح حائل رہی تو اسکا نتیجہ دونوں کے حق میں برا ہوگا۔ ایک مدت تک وہ اسی کوشش میں لگا رہا، اپنی بیوی اور بیٹی کو عورتوں اور لڑکیوں میں بھیجکر انکو تعلیم و تلقین کی، اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

پہلا اشتراکی | فیثاغورث نے ان دونوں کے درمیان جو صلحنامہ مرتب کیا تھا، اسکے دفعات اس زمانہ کے اشتراکی مقاصد سے بہت ملتے جلتے ہیں، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دنیا کا پہلا اشتراکی فیثاغورث ہے۔

نظام اخلاق | حکماء یونان میں اس کا نظام اخلاق سب سے علیحدہ اور بہت مکمل ہے، ظلم، تشدد، بدخواہی، بغض و عناد، اور دل آزاری اسکے عقیدہ میں کفر سے زیادہ بڑے گناہ ہیں۔ آزادی اسکے خیال میں انسان کا فطری حق ہے، اور حکومت جمہور کی ملک ہے، جو حکومت ایسی نہ ہو اسے مٹا دینا چاہیئے، اور جو بادشاہ اپنی حدود سے تجاوز کر جائیں وہ اسکی زبان میں ڈاکو ہیں۔ وہ سرمایہ داری کا مخالف ہے، اور دولت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا، کیونکہ یہ جہاں جاتی ہے فخر و غرور پیدا کر دیتی ہے، اور حریت و مساوات کی دشمنی پر تلی رہتی ہے، وہ انسان ہونے کے لئے خوش اخلاق ہونا ضروری سمجھتا ہے، اور کہتا ہے کہ ظالم اور بداخلاق لوگ انسان نہیں ہیں۔ اس کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جس کے قول و فعل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ ایسا علم جسکے حاصل کرنے کی غرض قدرشناسی نہ ہو اسکو وہ ناپاک کہتا ہے۔ اسکے نظام اخلاق کا سنگ بنیاد اعتقاد توحید ہے، اس سے انسانی زندگی کو ترقی، سربلندی اور آزادی کا فیضان ہوتا ہے، اور خدا کی بزرگی اور یکتائی

مخلوق کے دل سے انسانوں کا خوف نکال دیتی ہے، اسی وجہ سے وہ نہ ستاروں اور سیاروں کی خدائی کو مانتا ہے، نہ بتوں کو پوجتا ہے، اسکے عقیدہ میں بت پرستی بہت ہی ذلیل فعل ہے، دیوتاؤں کی پرستش کو اس نے اس صورت میں رواج دیا تھا کہ ان سے مراد کوئی ذی شعور ہستی نہ لی جائے، اور صرف یہ سمجھا جائے کہ یہ خدائے پاک کی مختلف قوتیں ہیں، جنکے آگے ہم اپنا سر نیاز جھکاتے ہیں۔ سقراط کے موحدانہ خیالات اسی کی دعوت توحید کا اثر ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو خلوص و محبت کی خدا پرستانہ زندگی بسر کرنی چاہیئے اور اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ایک ہی جنم میں نروان حاصل ہو جائے۔ جو انسان ایک ہی زندگی میں اس درجہ کو پہنچ جائے وہ انسان کامل ہے۔

جادو اثری | اسکی آواز ایسی شیریں، لہجہ ایسا نرم، باتیں ایسی دلکش اور اصول ایسے سیدھے سادے ہوتے تھے کہ جاہلوں اور پڑھے لکھوں، بچوں اور بڈھوں کو سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوتی تھی۔ صداقت، راستبازی اور بنی نوع انسان کی ہمدردی یہ ایسی باتیں تھیں جن کا وہ داعی تھا، اور جو اسکی ہر ہر ادا سے ٹپکتی تھیں، بڑے بڑے ظالم اور سرکش اسکے سامنے آتے تھے اور وہ دو باتوں میں ان کا دل موم کر دیتا تھا۔ کروتونہ کا ایک رئیس (سمافس) بہت ظالم و جابر تھا، دولت و امارت نے اس کے دل پر گمراہی کی مہریں لگا دی تھیں، اور وہ دن رات شیطانی کاموں میں ڈوبا رہتا تھا۔ فیثاغورث اس کے پاس گیا، اور کچھ ایسے انداز میں ہدایت کی کہ اس کا دل بھر آیا اور وہ اسی وقت سارا مال و متاع لٹا کر اسکے ساتھ ہو گیا، فقیرانہ پہناوا پہن لیا، اور غلاموں کی طرح اس کے حکموں پر چلنے لگا۔

ہر دلعزیزی | یہ معمولی بات نہ تھی، شہر میں جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو ہر شخص تصویر حیرت بن گیا، ان لوگوں کا یہ عام خیال تھا کہ فیثاغورث یقیناً "آسمانی انسان" ہے۔ اب کیا تھا ہر جگہ اسکی خدائی تھی، جہاں دیکھو اور جس سے سنو اسی کا مذکور تھا۔ ہیلاس اپنے اس ہونہار فرزند پر ناز کرتا تھا۔ روم و یونان کے علاقوں سے گذر کر اسکی شہرت و عظمت کے ترانے افریقہ کے ملک بربر تک پہنچ گئے تھے، وہاں کے امیر و حاکم اسکے پیروں کو چومتے، اور اپنی دولت و حکومت کو چھوڑ کر ہر وقت اسکی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ متوسط درجے کے لوگوں کی تو اس کے حلقۂ درس و ارشاد میں کوئی گنتی ہی نہ تھی، لیکن علماء و فضلا، وزراء و عمال بھی بہت تھے۔ صرف اطالیہ کے امیر، بربر کے حاکم، اور یونانی جزیروں کے عامل ہی اتنے تھے کہ انگلیوں پر نہیں گنے جاسکتے تھے باوجودیکہ یہ سب بڑے بڑے لوگ تھے جنہوں نے دولت و امارت کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں،

اور جنکے دماغوں میں حکومت و فرمان فرمائی کے نقشے جمے ہوئے تھے، مگر فیثا غورث کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا، وہ علم و فن کی تعلیم کے معاملہ میں بہت ہی سخت تھا، ان سب کو ایک نظر سے دیکھتا، ایک ہی طریقہ سے مخاطب کرتا، اور ایک ہی صف میں بٹھاتا تھا۔ اس نے فضیلت و بزرگی کا معیار صرف تقویٰ کو قرار دیا تھا، جسکے اخلاق بہتر ہوتے، جو علم و فضل میں زیادہ ہوتا، جس کے دل میں بنی نوع کی محبت ہوتی، جو اپنے خالق کا سچا عاشق ہوتا وہ اسی کی قدر و عزت کرتا، اور اسی کو اپنی تعلیمات کا حامل بناتا۔

**جمعیتہ الدعوت کی تاسیس** فیثا غورث نے اپنے گرد و پیش طالبان علم و حقیقت کا یہ ہجوم دیکھ کر ایک جمعیتہ الدعوت قائم کی، اسکے اغراض مذہبی و سیاسی اصلاحات، تعلیم دین، تکمیل سلوک، اور ارشاد و ہدایت تھے۔ ارکان کے تین طبقے تھے، ایک اہل دنیا کا، دوسرا اہل عقبیٰ کا، تیسرا اہل محبت و ہدایت کا۔ اہل دنیا کو تہذیب اخلاق و علوم دینی کی تعلیم دی جاتی تھی، اہل عقبیٰ کو تمام علوم کی متوسط تعلیم دیکر خاموشی، ترک و انقطاع اور زہد و ریاضت سے منزل مقصود تک پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن اہل محبت و ہدایت کو بڑے بڑے امتحان دینے پڑتے تھے، اور ان میں کامیابی کے بعد دین و دنیا کے خاص خاص علوم کی منتہی تعلیم دی جاتی تھی، اور پھر انقطاع و انزدا، خموشی و بیگانگی، نفس کشی و پرہیزگاری، عجز و راستبازی، محنت و مشقت اور ریاضت و مجاہدے کے ذریعے اس قابل بنایا جاتا تھا کہ دوسروں کو پوری طرح ہدایت دے سکیں، اور جس کا ہاتھ پکڑلیں اسکو اپنے درجہ تک پہنچادیں، ان لوگوں کے لئے ضروری تھا کہ اندیشۂ امروز و فردا سے فارغ، دین و دنیا کی تمناؤں سے آزاد اور عشق خالق و ہدایت مخلوق کے جذبات سے لبریز ہوں، انکی کوئی غرض کسی سے وابستہ نہ ہو، جو کام کریں خالصتہً للہ کریں، اور کسی مزد و اجر، تعریف و تحسین کے طالب نہ ہوں، انکی زبان سے ایسی کوئی بات نہ نکلے جس پر وہ خود عامل نہ ہوں، عادتیں بیحد سادہ ہوں، اپنے کسی کام کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں، اور اپنے اخلاق، درد محبت اور خلوص و حقانیت سے اپنے عادات و اطوار، بات چیت میں ایسی دلکشی رکھتے ہوں کہ ہر شخص کو اپنے اندر جذب کرلیں۔ جب کسی طالب میں یہ باتیں پیدا ہوجاتی تھیں اس وقت وہ فارغ التحصیل سمجھا جاتا تھا، اور اسے اجازت ہوتی تھی کہ جہاں چاہے جائے، جس طرح چاہے رہے مگر کسی وقت انجمن کے کاموں سے غافل نہ ہو، اس کے مقاصد کی اشاعت کرے اور مخلوق کو گمراہی سے نکال کر مکتی اور نروان کی راہ پر لگادے۔

**سیاسی تعلیمات** لیکن یہ "نروان آشرم" سیاسی کانگریس بھی تھی، اور اس زمانہ میں جبکہ حریت و مساوات اور اشتراکیت کا خیال کرنا بھی ایک اچنبھا معلوم ہوتا ہے، یہ اطالی ممالک میں انکی تخم ریزی کر رہی تھی۔ اس کی

سیاسی تعلیمات یہ تھیں کہ تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اس لئے انکو آزاد ہی رہنا چاہیئے، حکومتیں قوم کی ملک ہیں ان کا کام یہ ہے کہ امن و نظام قائم رکھیں، اور قوم کی خدمت کریں۔ جو حکومت ایسا نہیں کرتی، اور اپنے فرائض سے تجاوز کرتی ہے، اس کا وجود اک معصیت ہے، اسے مٹا دینا چاہیئے۔ غربت و امارت کوئی چیز نہیں، اسکے امتیازات ظلم و نا انصافی پر مبنی ہیں۔ ان کا باقی رہنا اعلیٰ اخلاق، قومی ترقی اور معرفت خدا وندی کی راہ میں بدترین روک ہے۔ حقیقت انسانیت میں سب برابر ہیں، لہذا کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زر و جواہر کی ایک مقدار کا مالک ہو کر دوسروں کو ذلیل سمجھنے لگے۔ عزت و ذلت کا معیار صرف علم و ہنر اور تقوٰے ہے۔ جو لوگ عیش و راحت کی بے محنت زندگی بسر کرتے ہیں اور بنی نوع انسان پر ظلم و ستم کر کے روپیہ وصول کرتے اور اپنی رنگ رلیوں میں اُڑاتے ہیں، وہ گنہگار ہیں، انکے خلاف جد و جہد کرنا اور انکی دولت کو عام انسانی فوائد میں لگانا انجمن کے ہر رکن کا فرض ہے۔

طریق زندگی | جمعیتہ کی خانقاہ شہر کے بیرونی حصہ میں ایک وسیع میدان میں بنائی گئی تھی، اور طالبوں کی تقسیم کے لحاظ سے مختلف حصے رکھے گئے تھے، لیکن مکانات ایک ہی وضع کے تھے، اور امیر و غریب سب ایک ہی ساتھ رہتے تھے، کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہ تھی، خود فیثا غورث بھی ان ہی کے ساتھ اور بالکل ان ہی کی طرح رہتا تھا، خانقاہ کی عمارت سے متصل کھیت تھے جہاں یہ لوگ اپنی ضرورت کے موافق زراعت کرتے تھے، کپڑے دھونا اور بننا، آٹا پیسنا اور کھانا پکانا یہ سب ان ہی کو کرنا ہوتا تھا۔ ایک خاص مقام تک پہنچ جانیکے بعد نکاح کی اجازت بھی مل جاتی تھی، مگر اسکے ساتھ یہ شرط تھی کہ بیوی بھی یہی زندگی اختیار کرے یا کم از کم اس زندگی کے کاموں میں ہارج نہ ہو۔ سب کے لباس ایک ہوتے تھے اور غذا بھی سب کی ایک ہی مقرر تھی، یعنی روٹی شہد اور پانی۔ ان کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاک روحوں نے قالب اختیار کرلئے ہیں۔ وہ انسان، زندگی اور دُنیا کی حقیقت پوری طرح جانتے تھے۔ انکی روش بالکل سادہ تھی، رہنے سہنے کا طریقہ بندشوں سے بالکل آزاد تھا، کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر بیتاب ہو جانا انکی فطرت ہو گیا تھا، نکوکاری و پاک نفسی انکے خاص جوہر تھے، اور خلوص و محبت، صلح پسندی و راست روی ان کا شیوہ تھا۔ ہر روز صبح کو دن بھر کے تمام کاموں کا نقشہ بنا لیتے، اور رات کو سوتے وقت اپنے تمام اقوال و افعال کا محاسبہ کرتے تھے۔ سب ایک ہی جگہ جمع ہو کر روزانہ گجردم نہایت سکون، خاموشی اور وقار کے ساتھ نماز پڑھتے، اور دیر تک اپنے خالق کے حضور سر بسجود رہتے تھے۔ ہومر وغیرہ کے اشعار، ترانے اور نغمے چنگ و رباب پر گانا انکے ہاں عبادت

کا ایک جزو تھا۔ انکا خیال تھا کہ اس سے عقل کو جلا ہوتی، روح کو تقویت ملتی اور جسم میں زندگی کی حرارت تازہ ہوتی ہے اسکے بعد اور کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔ کھانا صرف ایک ہی وقت کھاتے، اور زیادہ کھانا صحت اور روحانیت کے لئے مضر سمجھتے تھے +

اس کا اثر | ملک کی عام حالت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ پر تصنع اور تکلیف دہ تمدن و اجتماعیت کی جگہ صالح تمدن نے لے لی، علم و عمل کا چرچا پھیل گیا، خیالات روحانیت کی طرف مائل ہو گئے آزادی اور عدل و انصاف جو ظالموں کی تلواروں سے ڈر کر سسکیاں لے رہے تھے، بے خوف ہو کر زندہ ہو گئے عقلیں انوار الہی سے روشن ہو گئیں عوام و خواص سب میں راست روی اور ضبط نفس کا مادہ پیدا ہو گیا، اور پاکی و نکو کاری ان کی زندگی کا مقصد ہو گئی، لہو و لعب، وحشت و بہیمیت اور فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو گیا، فرحت و انبساط، جوش و زندہ دلی، علم و مروت عزم و استقلال اور علم و فضیلت کے ترانوں سے سارا اطالیہ گونج اٹھا، رومی و یونانی قومیں انکے فوائد سعادت و فلاح سے یکساں متمتع ہوئیں +

شیطانی حملہ | لیکن دنیا حق و باطل کی رزمگاہ ہے، یہاں ہر نیکی کے فرشتہ کو بدی کے شیطان سے دست و گریباں ہونا پڑتا ہے، اور وہ جو نیکی سے ازلی دشمنی باندھ چکا ہے، یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کا دشمن کامیاب ہو اور وہ ناکام رہ جائے، اس نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ حق کی آواز بند کر دے، سچائی کا گلا گھونٹ دے اور زمین پر خدا کا ایک بھی نام لیوا زندہ نہ رہنے دے۔ فیثاغورث کی یہ دعوت اسکے لئے اعلانِ جنگ تھی، وہ اپنے پر پرزے جھاڑ کر اٹھا، اور اس نے فیثاغورث کے معتقدوں، مریدوں، شاگردوں اور حامیوں کو ورغلانے کی کوشش کی، لیکن جب یہ لوگ اسکے پھندے میں نہ آئے، تو پھر اس نے اغیار کے دلوں میں دشمنی کا منتر پھونکا، اور ایک بڑے جتھے کو فیثاغورث کی ہلاکت، اور اسکی دعوت کی پامالی پر آمادہ کر لیا +

کروتونہ کے قریب کسی شہر میں قولون نامی ایک رئیس تھا جس کی جہالت، بدکرداری، خبث نفس، غرور و تکبر اور ظلم و ستم شہرۂ آفاق تھا۔ ایک روز وہ فیثاغورث کے وعظ میں شریک ہونیکے لئے آیا، اور برسر جلسہ واہی تباہی بکنے اور غرور و تکبر کی بیہودگیاں کرنے لگا۔ جلسہ اسکی ان حرکتوں سے پریشان ہو گیا۔ فیثاغورث نے اس سے کہا کہ :- تم جلسہ میں آ کر اس کے آداب کی پابندی پر مجبور ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ تم کون ہو، اور یہ جو اپنی بڑائی میں طول فضول بک رہے ہو، اسکی کیا اصلیت ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ یہ فخر کی باتیں اور بد دماغیاں یہاں نہیں چل سکتیں، یہاں تم اور ایک چمار دونوں برابر ہیں۔ دولت و حکومت معیار فضیلت نہیں ہے معیار فضیلت

صرف اکتساب علم و اخلاق اور تقویٰ ہے۔ وہ شخص جو اپنی زندگی میں عقبیٰ کا خیال نہیں رکھتا، اور دنیا کی دولت و حشمت پر جان دیتا ہے ہمارے نزدیک کُتے سے بدتر ہے۔ تم اگر دولت و حکومت کے سلطان ہو تو ہُوا کرو، ہمیں اس سے بحث نہیں، ہم تمہارے اخلاق کو دیکھتے ہیں، اور اس لحاظ سے ہماری نظروں میں تمہاری وقعت حیوانوں سے بھی کم ہے۔ جاؤ، تم یہاں سے ابھی چلے جاؤ، یہاں ایسے بدنفسوں کا کام نہیں۔" قولون کی شیطنت کیلئے یہ باتیں بہت تھیں، وہیں لڑنے کھڑا ہو گیا، اور شور و غل مچا کر سارے جلسہ کو سر پر اُٹھالیا۔ لیکن تنہا ہونیکی وجہ سے کچھ کر نہ سکا، فتنہ اُٹھ کر رہ گیا، اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔ مگر اسکے دل میں دشمنی کی آگ دہک چکی تھی، آکر ایکدم کیلئے بھی چین سے نہ بیٹھا اور اپنے حلقہ اثر میں فیثاغورث کے خلاف زہر اُگلتا رہا۔ کہیں یہ شہرت دی کہ فیثاغورث کافر و لا مذہب ہے، کسی جگہ یہ کہا کہ اسکی تعلیمات بالکل ملحدانہ ہیں، اور کہیں یہ بات اُڑائی کہ وہ آوارہ و بدچلن ہے، روپے کے لالچ اور مار کے خوف سے ایک بڑی جماعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ خانقاہ میں رہنے والوں کو قتل کر دے خود اس نے بھی تیاریاں کرکے کئی حملے کئے، خانقاہ کو مسمار کر دیا اور جو جہاں ملا اسے بے دریغ قتل کیا، اس پر فیثاغورث کے حامی بگڑ گئے، انہوں نے اسکے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہا، لیکن وہ تلوار چلانا بدترین گناہ سمجھتا تھا۔ اس نے کہا: "میں اور میرے تمام عزیز دوست موت کو اس زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، ہم نے اپنی زندگی خدا کی راہ میں قربان کرنیکے لئے وقف کر دی ہے، ہم اسکے بچاؤ کے لئے تلوار نہیں اُٹھائینگے خبردار، اگر تم میں سے کوئی شخص ہمارے لئے تلوار اُٹھائے، محض زندگی کیلئے لڑنا، اور خون خچر کرنا شیطانی کام ہے، قولون کو مجھ سے عناد ہے اسلئے وہ یہ کر رہا ہے، میرے کاموں سے اسکو دشمنی نہیں ہے، ورنہ وہ پہلے ہی ایسا کرتا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کی یہی مشیت ہے، اس لئے میں نے اسکی مشیت کے آگے اپنا سر جھکا دیا ہے، اور اس راہ میں جس قدر تکلیفیں آئینگی سب کو خوشی خوشی برداشت کرونگا۔ میرے تمام رفیق بھی میرے ساتھ اپنی جانیں دینے کیلئے تیار رہیں۔" یہ تقریر سُن کر وہ سب خاموش ہو گئے، اور فیثاغورث اور اُسکے تمام ساتھی، ہنسی خوشی مُصیبتیں جھیلتے رہے۔ جب ظالموں نے زیادہ تنگ کیا تو یہ لوگ قیروس چلے گئے، مگر اتفاق سے یہاں کا حاکم قولون کا دوست تھا، اس نے خبر پاتے ہی مار پیٹ کر نکالا۔ یہاں سے کلوون کا رخ کیا، اور بمشکل تھوڑے دن گذرے ہونگے کہ کمبخت قولون آ پہنچا، مصیبت کے مارے مارا مارا یہاں سے نکل کر طرنوطیون گئے، لیکن بدقسمتی سے یہ شہر اسی ظالم کے علاقہ میں تھا، وہاں کی رعایا ان لوگوں کا نام سنتے ہی ٹوٹ پڑی اور بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ لوہے اور خون کا کھیل ہونے لگا۔

وفات | آخر یہاں سے بھی نکلے اور موسٹین جاکر وہاں کے مشہور مندر میں مقیم ہو گئے۔ یہ مندر "ہیکل اسنان" کے نام سے مشہور تھا، اور سارے اطالیہ میں یہی ایک ایسی مقدس جگہ تھی جہاں مجرموں اور مظلوموں کو پناہ مل جاتی تھی۔ مگر قولون کے دل میں شیطان سما گیا تھا، وہ یہاں بھی اپنی شیطنت سے باز نہ آیا، چالیس روز مندر کا محاصرہ کئے پڑا رہا، اور کھانے پینے کی تمام چیزیں روک کر اکتالیسویں دن مندر میں آگ لگا دی، اور فیثاغورث مع اپنے ساتھیوں کے اس آگ میں جل کر جاں بحق ہوا۔

یہ ۴۹۴ سنہ ق م کا واقعہ ہے۔ عمر ۸۶ برس تھی ۵۶ برس تعلیم میں اور ۳۰ برس ارشاد و ہدایت میں گذرے،

شاگردوں کی جاں نثاری | ان مصیبتوں میں اس کے شاگردوں نے جس جاں نثاری کا ثبوت دیا وہ ایک یادگار واقعہ ہے۔ بیسیوں زہر سے ہلاک کئے گئے، ایک ایک حملہ میں چالیس چالیس قتل ہو گئے، کروتونہ سے نکل کر جن جن مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، اور پھر جس دردناک تکلیف میں انہوں نے جانیں دیں اسکے خیال سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ لیکن باوجودیکہ خستگی سے اُٹھنے کی طاقت بھی نہ تھی، اور چالیس روز سے کھیل کا ایک دانہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی انکی زبان تک نہ گیا تھا، تاہم انکی جاں نثاری کی یہ کیفیت تھی کہ جب آگ کے شعلے اُٹھے، اور جسم کو جھلسانے لگے، تو انہوں نے اپنی دیواریں بناکر اپنے اُستاد کو اپنے بیچ میں لے لیا، کہ جبتک وہ زندہ ہیں اس پر آنچ نہ آنے دینگے۔ جن شاگردوں نے اس طرح جل کر جان دی انکی تعداد سو سے زیادہ تھی۔

ظالموں کا انجام | مگر خون ناحق خالی نہیں جاتا۔ بدی خواہ کتنی ہی بڑھ جائے، اور نیکی کتنی ہی مظلوم ہو جائے، لیکن آخری فتح اسی کی ہوتی ہے۔ قولون کے مظالم کی زیادتی نے اسکی موت کو اٹل کر دیا تھا۔ فیثاغورث کے مرید و معتقد بھرے بیٹھے ہی تھے، اور صرف موقعہ کے منتظر تھے کہ "ہیکل اسنان آگ لگانیکی خبر مشہور ہوئی۔ اس سے ملک میں چاروں طرف نفرت و مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بچہ بچہ جوش سے بے قابو ہو گیا، انتقام کے جذبات سے لبریز ہو کر اُٹھا، اور ظالموں کو بے دریغ تہ تیغ کیا، یہ فتنہ کئی مہینہ خون کی ہولی کھیلتا رہا، طرفین کے بہت آدمی ضائع ہوئے، آخر تیسرے مہینہ قولون گرفتار ہوا، اس کا انجام بہت ہی عبرت انگیز تھا۔ قتل سے پہلے خوب سزائیں دی گئیں طرح طرح ظلموں کے مزے اسکو چکھائے گئے، اور پھر گردن کاٹ کے گوشت و پوست کتوں اور چیلوں کو کھلا دیا گیا۔ لوگ مدتوں ظالموں کو اسکی بد انجامی سے ڈراتے رہے۔ اسکے حلیفوں میں جو لوگ بچ رہے انہوں نے اپنے گناہوں کی توبہ کی، مالداروں نے اپنا مال راہ خدا میں انفاق کیا، حاکم حکومت سے دست بردار ہوئے، ظالموں نے مظلوموں سے معافیاں چاہیں، اور مع اپنے اہل و عیال خویش و اقربا،

دوست احباب کے صدق دل سے حق کے مطیع و منقاد ہو گئے۔

حیات بعد الممات | موت و حیات کا سلسلہ نامتناہی ہے، شمع حق گو باطل کی طوفانی آندھیوں سے ٹمٹمانے لگے، مگر بجھ نہیں سکتی۔ فیثاغورث نے جو شمع حق روشن کی تھی وہ عارضی ٹمٹماؤ کے بعد پھر روشن ہوگئی، اور اس طرح کہ دوست دشمن سب نے اسکی روشنی سے ہدایت پائی۔ انکے سر اسکی بزرگی کے اقرار میں جھک گئے، سب نے یک زبان ہوکر اسکی پرخلوص للّہیت کا اعتراف کیا، اور یہ مان لیا کہ وہ ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بڑا انسان تھا، اور یقیناً خدا نے اسکو ہماری ہدایت کیلئے بھیجا تھا۔ صور میں اسکے نام پر ایک عظیم الشان مندر بنایا گیا، ساموس اور کروتونہ سب اسکے رہنے کی جگہ معبد اور مدرسے تعمیر کئے گئے، جہاں اسکی تقدیس کی جاتی تھی، اور بتوں کی پوجا کی گمراہی سے ہٹ کر خدائے واحد کی عبادت میں ہزاروں جبینیں سجدہ ریز ہوتی تھیں۔ اس طرح اسکی دعوت پھر زندہ ہوگئی اور اسکی تعلیمات مدتوں جاری رہیں +

فیثاغورث کا فلسفہ | فیثاغورث کی فلسفیانہ حیثیت بہت بلند ہے۔ وہ یونانی حکماء کے نظام شمسی کا آفتاب ہے، زہد و تقوے، دیانت و راستبازی، حلم و عفاف، ضبط نفس و پاکبازی میں کوئی حکیم اس کا لگا نہیں کھا سکتا۔ وہ علم و فضل کے لحاظ سے سب سے ممتاز، اور متعدد فلسفوں کا بانی ہے، خدا، روح، حیات، تناسخ، عمل، اعیان، دنیا، آخرت کے متعلق جتنے فلسفے ہیں ان سب کا موسس اول وہی ہے، سقراط، افلاطون، ارسطو، اپیکورس، دیوجانس وغیرہ نے بالواسطہ و بلاواسطہ اسی کے ہاتھ سے علم کے جام لئے ہیں، اسی کے خیالات کی بنیادوں پر انہوں نے اپنے اپنے فلسفوں کی بڑی بڑی عمارتیں بنائی ہیں، خدا نے اسکو اپنی بیشمار دانائیاں سکھادی تھیں، ریاضیات فلکیات روحانیات، الٰہیات، مادیات، موسیقیات اور اخلاقیات کا وہ بڑا جید عالم تھا۔ مصر میں، ہندسہ و ریاضی کا مسلمہ طور پر بانی ہے، موسیقی میں کئی آلات و طرزوں کا موجد ہے، سارنگی اسی نے بنائی تھی، اسی نے مادیات، روحانیات اخلاقیات اور الٰہیات کے مسائل ریاضی کی اصطلاحات میں بیان کئے ہیں، افلاطون اس بارے میں بالکل اسی کا مقلد ہے +

روح کے متعلق افلاطون کے عقائد بالکل اسی سے ماخوذ ہیں۔ وہ کہتا ہے روح حقائق ابدی کی غیرفانی اور محسوسات مادی کی فانی دنیا کے درمیان ایک رشتہ ہے، جو دونوں کو باہم ملاتا ہے۔ مادی دنیا کے تمام کرشمے، سارے ساز و سامان روح کے دم قدم سے ہیں، روح نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ روح کائنات کی زندگی، رونق اور حرکت کا منبع ہے۔ اجسام کے پردوں میں یہی چیز کام کرتی ہے۔ لیکن جسموں کی حیات و ممات سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ غیرفانی اور

ابدی ہے، اسکو مرنے جینے سے سروکار نہیں۔

افلاطون تناسخ کا بھی قائل ہے۔ مگر یہ خیال بھی اس نے فیثا غورث ہی سے لیا ہے۔ فیثا غورث نے یہ عقیدہ بودھ سے لیا تھا، اور اس عقیدہ کی حقیقت پر بہت غور کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں کہ روح جب غیر فانی ہے، تو جسموں کی موت و زیست کے ساتھ ہمیشہ ایک نیا جون نہ بدلتی رہے۔ تناسخ اور نجات توام ہیں اسلئے وہ مختلف زندگیوں کی نیکیاں مل جانے سے نجات کا بھی قائل ہے۔ لیکن اس نے ان مسائل کی تعلیم اخلاقی رنگ میں دی تھی، اور یہ بات اسکے ہر شاگرد کے دل نشین ہوگئی تھی کہ انسان کو بہت ہی پاک و نیکوکار زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

اس زمانہ میں دنیا کی نسبت حکماء یونان کے مختلف خیالات تھے۔ ایک گروہ اسکو بہتی ہوئی ندی کہتا تھا، اور دوسرا آگ کے شعلے سے تعبیر کرتا تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جو مادہ دنیا کا مایۂ حیات ہے اس میں قوتِ فکر ہے، اسکے لئے انہوں نے جسم بھی ضرور سمجھا تھا۔ وہ اس بات کے بھی مدعی تھے کہ انسان کی تمام معلومات کی انتہا نادانی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جو باتیں ہم جاننی چاہتے ہیں جاننے سے پہلے انکی حقیقت بدل جاتی ہے ایک تیسرا گروہ اور بھی تھا، جو ان کے خلاف یہ آواز بلند کرتا تھا کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں نظر کا دھوکا ہے۔ یہ گروہ تغیر و حرکت کا قائل نہ تھا، اور ان چیزوں کو بھی ماننے سے انکار کرتا تھا جو تصور میں نہیں آسکتیں۔ اسکے فلسفہ کا اصل الاصول وحدتِ حقیقت تھا۔ تفریق، تمیز، تقسیم، تغیر، حرکت اس کے نزدیک اعتباری باتیں تھیں لیکن فیثا غورث نے ان سب کے خیالات پر محاکمہ کیا ہے، وہ کسی کی بات نہیں مانتا، اسکی نظر ان سب سے گہری ہے، وہ ان کی باتوں کو ناواقفیت کی وہم آرائیاں کہتا ہے۔ اس نے ایک ایسے مادۂ اساسی کو دریافت کیا جو گردش ایام کے اثرات سے بالاتر، اور زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ سقراط اسی کے فلسفہ کا حامی ہے، اور افلاطون بھی اسی کی رائے کو مان کر متلون دنیا کی گردش، اور نظر فریب سکون کے جمود سے رہائی حاصل کرتا ہے، اور اسی کے فلسفہ کی عصا کے سہارے اس بلند مقام پر پہنچتا ہے، جہاں سے اس نے کثرتِ حقائق کا اعلان دیا ہے، اور حقائق و محسوسات کی حدود متعین کر کے ان دونوں کے درمیان ایک تصوری دنیا قائم کی ہے۔

حکماء یونان میں ایک گروہ اس خیال کا بھی تھا کہ نیک و بد کوئی چیز نہیں، یہ محض رسم و رواج کے چند اعتبارات، اور انسان کی گڑھی ہوئی تہذیب کے مفروضات ہیں، ورنہ نیکی اور بدی کوئی چیز نہیں

اور نہ انکا کوئی مستقل مفہوم ہے۔ پس دنیا کی کوئی چیز نہ حقیقتاً بُری کہی جاسکتی ہے نہ اچھی، لیکن فیثاغورث نے اس خیال کی بڑے زور سے تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے نیکی ہر حال میں نیکی رہتی ہے اور بدی بہرحال بدی ہے، انکا مفہوم غیر متغیر ہے۔ کوئی اچھا کام بُرا نہیں ہوسکتا، اور برائی کا اچھائی کی صورت اختیار کرنا ناممکن ہے قتلِ انسان بہرصورت ایک بُرا فعل ہے، چوری کرنا اور غیبت کرنا کسی طرح بھی نیکیوں میں داخل نہیں ہوسکتا۔ حق پرستی کی اچھائی، حسن اخلاق کی خوبی اٹل ہے، ان پر رسم و رواج کا مطلق کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ نیکی اور بدی محض اعتباری ہیں۔ انکے وجود کی غیر متغیر ابدیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ بعض باتوں کو ہم اچھا کہتے ہیں اور بعض کو بُرا۔

افلاطون نے اس بات کو بہت شد و مد سے بیان کیا ہے کہ حقائق ابدی کا علم سب سے زیادہ سچا اور غیر متغیر ہے۔ یہ علم ہمیں جن حقیقتوں کے وجود کی خبر دیتا ہے، وہ ہمارے محسوسات سے باہر ہیں۔ انہیں ہم صرف مدرکات کی مدد سے جان سکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال بھی فیثاغورث ہی کا ہے، سب سے پہلے اسی نے اسکو ظاہر کیا تھا، مگر افلاطون نے اسکو آب و رنگ دیدیا ہے۔

یہ نظریہ کہ کائنات ایک مجموعہ پریشاں ہے، اسکی کسی چیز میں نظم و ترتیب تخصیص و تعیین نہیں، انسان کا نفس اس پریشاں مجموعہ کو مرتب کرتا، ہر چیز کو اسکی جگہ رکھتا، اور ماحول کے اثرات کے مطابق مضرت و منفعت کی خصوصیات مقرر کرتا ہے۔ انقصاغورث کے دفتر خیال کا ایک صفحہ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال میں فیثاغورث اس سے آزاد طور پر اس کا شریک ہے۔ مگر انقصاغورث یہیں تک آکر رک گیا ہے، اور فیثاغورث اس سے ایک قدم آگے ہے۔ وہ کہتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ایک مقررہ قانون، ایک روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ انکے فوائد سے ہم صرف اسی صورت میں متمتع ہوسکتے ہیں جب اسکے اصولوں سے واقف ہوں، اور انکے موافق ان سے استفادہ کریں۔ پھر وہ کہتا ہے۔ یہ بات علم سے حاصل ہوتی ہے، علم میں سب سے بڑا درجہ انسان اور خدا کے تعلق کا ہے، اس سے ہمکو دنیا و مافیہا کے سارے راز معلوم ہوتے ہیں اپنی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے، اور کائنات کی تمام چیزیں اپنی اصلی روشنی میں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ علم ہمیں روحانی مسرت بخشتا ہے، اپنی شرافت و بزرگی کے اعلےٰ درجوں تک پہنچنے کی قوت ملتی ہے، اور حقیقت عالم کے سربستہ راز عیاں ہوجاتے ہیں۔ جو لوگ علم حاصل نہیں کرتے، وہ اپنی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ خدا کی خدائی انکے لئے ایسی ہے جیسے اندھے کے لئے خوبصورت عورت۔ وہ ایسے علم کو جو مادی فوائد حاصل کرنے کے ذریعے

بتاتا ہے، بدترین قسم کی جہالت کہتا ہے، اسکے خیال میں علم معرفت ہی بہترین علم ہے۔
اسکی تحریرات کے بعض اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روح کو رب روح کا ظل سمجھتا ہے، اور اسکی تمام حرکتوں کو اس غیر متحرک محرک کے حوالے کرتا ہے جو خالق عالم ہے، مگر یہاں بھی وہ اپنی اصل تعلیم کو نہیں بھولتا، کہتا ہے کہ:-
ہر انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس اعلےٰ و اکمل اور رحیم و کریم ذات میں اپنے تئیں فنا کردے، دُنیا کی ہر چیز اس اصول پر پیدا کیگئی ہے کہ وہ غیر مکمل صورت سے مکمل صورت کی طرف جاتی ہے، اور ہر صورت کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تکمیل کو پہنچے اسلئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ادنیٰ حالت سے اعلےٰ حالت کی طرف ترقی کرے، اور ایسی نیک و پاکباز زندگی بسر کرے کہ ایک ہی جنم میں نروان حاصل ہو جائے، ایک جگہ اس نے بالکل صاف لکھا ہے کہ:- اس دنیا کے اوپر جو روحانی دُنیا ہے، وہ نہایت لطیف اور نورانی ہے، انسان کی عقل اسکی خوبیوں کا احاطہ نہیں کرسکتی لیکن تمام پاک روحیں اس دُنیا کی بغیر دیکھے مشتاق ہوتی ہیں۔ جو لوگ دُنیا کی طرف سے مُنہ موڑ کر ترک و انقطاع کی زندگی اختیار کرتے، اور زبان پر مہر سکوت لگا کر بڑی بڑی ریاضتیں کرتے، اور اپنے اندر اخلاق الٰہی پیدا کرتے ہیں، ان پر اس دُنیا کے راز کھُل جاتے ہیں، وہ اس دُنیا میں پہنچکر سب کچھ پالیتے ہیں اور دُنیا کی ساری حقیقتیں ان پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔
خدا کے متعلق اسکے خیالات متصوفین اسلام سے ملتے جُلتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اسے حضرت سلیمان کی تعلیمات بھی پہنچی تھیں۔
نظامِ شمسی جو فلکیات کے موجودہ دورِ علمی کا ایک عظیم الشان مسئلہ سمجھا جاتا ہے، اسکا مکتشفِ اول بھی فیثاغورث ہی ہے۔ یہ اسکے اجتہادِ فکر و اصابت رائے، اور عمیقانہ مشاہدۂ کائنات کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے طبقات الارض کا یہ مسئلہ کہ ایک زمانہ گذرنے پر خشکی کی جگہ تری اور تری کی جگہ خشکی لے لیتی ہے، اسی نے دریافت کیا تھا جو اب تک مانا جاتا ہے۔

ناظر دہلوی

---

**پھُول** - چمن کی ہوا کو بے انتہا قیمتی بنا دیتے ہیں کلیاں اسی ہوا سے ملنے کیلئے باہیں پھیلا دیتی ہیں، پرندے میرے چاروں طرف پھدکتے، گاتے، اور کھیلتے پھرتے ہیں میں انکے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا مگر انکے نغمے اتنا مانوس ہو کر سنتا ہوں کہ میری تمام مسرت بخش کیفیتیں، دماغی صدمات میں منتقل ہو جاتی ہیں، اور میرا جسم کانپنے لگتا ہے —— ! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اس طرح میری روح کا مشاہدہ کرتی ہے ! ! !

مینا زبیری

# ماضیات

## کلام مسیح الدولہ اعجاز الملک سلطان الشعرا حکیم محمد سلطان محمود خان بہادر گرامی مرحوم

(ایک قلمی نسخہ سے)

مرحوم مرزا غالب دہلوی کے فارسی گو معاصرین میں سب سے بڑے حریف کمال تھے، راجستان کے اجڑے، اسلامی دیار، ٹونک میں جنم لیا تھا، والئے ٹونک کے ارشاد پر واقدی شریف کا، فارسی نظم میں شاہنامہ فردوسی کی طرز پر ترجمہ کیا مقابلہ کیا جائے تو شاعرانہ نغمہ سنجیوں میں اسکے سوا کچھ فرق نظر نہیں آتا کہ ایک کی لے اساطیر عجم سے لبریز ہے اور ایک کی لے میں شجعان اسلام کی رجز خوانیاں موجزن ہیں، قصائد، غزلیات، اور دوسری اصناف سخن میں کمال کے موتی جڑنیکے علاوہ ایک کتاب اجمیری پیا، خواجہ معین الدین کی منقبت میں بھی لکھی ہے، نظم کی طرح نثر فارسی پر بھی قدرت رکھتے تھے، لیکن یہ سب جواہر مقفل پڑے پڑے دھندلے ہو رہے ہیں۔

مشہور ہے کہ مرزا غالب نے جو اس زمانہ میں اردو کی طرح فارسی میں بھی داد سخن دے رہے تھے، آپ کے کلام کو سنکر فرمایا تھا کہ "ابھی ہندوستان کے گوشوں میں بہت سے غالب چھپے ہوئے ہیں"۔ افسوس ہے ایسے باکمال سخن سنج کے حالات وکمالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہے۔ بشرط فرصت ہم پھر کسی صحبت میں ان کے کلام پر مفصل تبصرہ کریں گے۔

---

دوزخ، شرارہ ایست، ز دودِ چراغ ما — جنت، نظارہ ایست، ز گلگشتِ باغ ما
کس پے بمعنی، از رہِ مقصد نمی برد — تا گم نشد، ز وادیٔ صورت سراغ ما
نار سقر چو برق درخشید و بر فسرد — از زہر خند دود سر شمع داغ ما
قرابۂ فلک نشود چوں تہی ز مئے؟ — ہل من مزید جوش زند از ایاغ ما
ہر چند روز و شب ہمی سعی و کوششیم — صورت نہ بند د از غم دنیا فراغ ما
گر جنبش ازل نہ رفیق سفر بود — کے میتواں رسید بمنزل الاغ ما
بادلبش گرامی اگر بے اثر بود — چوں لالہ شگفد ز در و دشت و راغ ما

---

# مخزن الغرائب وانیس العاشقین

## مؤلفہ احمد علی سندیلوی

ماہ جون ۲۴ء کے معارف میں مولوی محمد محفوظ الحق صاحب ایم اے لیکچرر عربی فارسی۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ کا ایک مختصر مضمون مولوی احمد علی سندیلوی کی تالیف تذکرہ مخزن الغرائب پر میری نظر سے گذرا ہے۔ میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا ہے کہ مولوی محفوظ الحق صاحب نے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے مضمون "تذکرہ مخزن الغرائب" معارف بابت ماہ مارچ ۲۴ء کے بعض غیر اہم پہلوؤں کو غیر ضروری فروغ دیا ہے حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو مخزن الغرائب کی قیمت یا اس قیمت کے حساب میں غلطی چنداں اہم سوال نہیں ہے۔ یہ امور بائع اور مشتری سے تعلق رکھتے ہیں اور عام دلچسپی کا کوئی سامان پیدا نہیں کرتے۔ مولانا شروانی نے بسبیل لطیفہ ایک بات کہی تھی کہ قیمت فی شاعر ایک پیسہ ٹھہری۔ اس شرح سے ایکسو پینتیس ۱۳۵ روپیہ قیمت دیگئی اس میں ممکن ہے، کہ مولانا کو سہو ہوگیا ہو یا یہ کہ رد و بدل کے بعد دو اور تین پیسہ فی شاعر کے نرخ سے شرح ٹھہری ہو بہرکیف وہ کچھ بھی ہو لیکن مولوی محفوظ الحق صاحب کا محاسبانہ اعتراض میری نگاہ میں وقیع نہیں ہے کیا اس قسم کی کوشش سے مولوی صاحب کا اصل مقصد اس امر کا اعلان ہے کہ خدانخواستہ مولانا شروانی صاحب حساب میں کمزور ہیں لیکن لطیفہ پر لطیفہ یہ ہے کہ خود مولویصاحب نے اپنی صحیح حساب دانی کا کوئی شاندار نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ تین ہزار ایکسو اڑتالیس پیسوں کے انتالیس روپے تین آنے بتائے ہیں حالانکہ فی الواقع انچاس روپے تین آنے ہوتے ہیں میں اُمید کرتا ہوں کہ مولویصاحب اس موقع پر کاتب کا رسمی عذر پیش نہیں کرینگے۔

نواب صدر یار جنگ کے مضمون کا جو اہم پہلو ہے میں افسوس سے دیکھتا ہوں کہ اسکے متعلق مولویصاحب نے ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔ اس سے میرا مقصد سید انشاء اللہ خاں انشاء کے حالات کے متعلق وہ متضاد بیانات ہیں جو احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب میں اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اپنی تالیف آبحیات میں درج کئے ہیں درحقیقت اگر دیکھا جائے تو مولانا شروانی نے اپنے اس تبصرہ سے بہت بڑی علمی اور ادبی خدمت کی ہے۔ آبحیات آزاد کے سحر بابل کے طلسم شکن واقعتاً نواب صدر یار جنگ ہیں۔ اس سے

قبل تذکرہ میر تقی میر پر دیباچہ لکھتے وقت بھی انہوں نے آبحیات کے بعض غیر تاریخی بیانات کی معقول تردید کر کے صحیح اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد مرحوم کی اس تصنیف میں بعض ایسے بیانات مشاہدہ کئے جاتے ہیں جنکی تسلیم سے تاریخی ذوق ہمیشہ ابا کرتا رہیگا۔ مثلاً آبحیات کا وہ بیان جس میں چھوساقن امیر خسرو علیہ الرحمۃ کو حقہ پلاتی دکھائی گئی ہے کسی طرح قابل تسلیم نہیں گویا مولانا آزاد مرحوم کے نزدیک تمبا کو جسکو پرتگالی فرنگی گیارھویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان میں لاتے ہیں اس عہد سے تین سو سال قبل یعنی آٹھویں صدی ہجری میں رواج پا چکی ہے۔

بہرحال اس انکشاف کے لئے ہمکو نواب صدر یار جنگ کا سپاس گذار ہونا چاہیئے اور جو اصحاب میری طرح انکے پُر مغز اور عالمانہ مضامین کا جو وقتاً فوقتاً ملک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں شوق سے مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ میرے ساتھ اس رائے کے اظہار میں ضرور شریک ہونگے کہ مولانا شروانی کا رتبہ بلحاظ ادبی نقاد نہایت رفیع ہے۔ ابتک وہ ایک مصروف ادبی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اور ہمارے ملک کے رسائل انکی تحقیقات عالیہ کے منت گذار ہیں کیونکہ اردو صحافت کی جس قدر قلمی امداد مولانا ممدوح نے کی ہے ہماری زبان کے صرف چند ادیب ہی اس پایہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

ہم مولوی محفوظ الحق صاحب کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے مولف تذکرہ مخزن الغرائب کے حالات جو فی الواقعہ مولانا شروانی کے مضمون سے رہ گئے تھے بہم پہنچا کر ہمیں مستفید کیا۔ تاہم میں اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن امور میں انہوں نے مولانا صدر یار جنگ سے اختلاف کیا ہے وہاں مجھکو شک ہے کہ صحیح رہبری کا حق ادا نہیں کیا بلکہ اگر مولویصاحب مجھکو اجازت دینگے تو یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ بعض مواقع پر خفیف خفیف غلط فہمیاں بھی اضافہ کردی ہیں یا بعض باتیں جنکا بیان ہونا ضروری تھا ذکر نہیں کیں مثلاً:۔

احمد علی سندیلوی اپنے والد کے حالات میں کسی انقلاب کی بنا پر صغر سن میں ہی سندیلہ کو خیرباد کہہ کر رہگرائی عالم مسافرت ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولف کے الفاظ ہیں" از مشیت الٰہی در اوضاع والد بزرگوارم از گردش فلکی اختلال واقع گردید بندہ از صغر سن از خانہ برآمدہ بغربت افتادم" مولویصاحب اس واقعہ کو قریب قریب حذف کر گئے ہیں۔ علیٰ ہذا عزت الدولہ سہراب جنگ کے ہاں مولف کی ملازمت کا واقعہ جسکا ذکر مولویصاحب نے

---

عہ آبحیات صفحہ ۷۶

کیا ہے بیحد موردِ شک ہے میرے خیال میں مؤلف سہراب جنگ کا ملازم نہیں تھا بلکہ انکے وسیلہ سے نجف خاں تک رسائی حاصل کرکے بادشاہی رسالہ میں معقول مشاہرہ پر ملازم ہو جاتا ہے اس موقعہ پر صاحب تذکرہ کا بیان ہے کہ "رفتہ رفتہ کہ بیاں آں طول دارد در خدمت مغفور شہید نواب عزت الدولہ۔ میرزا حسن سہراب جنگ طاب ثراہ کہ خلف الصدق میرزا محمد محسن کہ برادرِ کلاں نواب صفدر جنگ بودند رسیدم و ایشاں از راہ قدر دانی کہ در طبع و نہاد بزرگ زادگان و بزرگ منشاں ودیعت است بآئین شائستہ و بحرمت تمام مجوز ملازمت بندہ بجناب نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر غالب جنگ الحسنی گردیدہ بمبر سوم تمیز داخل رسالہ پادشاہ جمجاہ شاہ عالم بہادر ادام اللہ ملکہ فرمودند"

مولویصاحب کی یہ رائے غالباً انکے انگریزی پیشروؤں کے اثرات میں قائم ہوئی ہے۔ نواب صدر یار جنگ نے مولف کے ذکر میں فرمایا تھا "نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے سرکاری ملازم تھے وہاں اہل کمال کا مجمع تھا انکو بھی استفادہ کا موقعہ ملا اسی فیض صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے" مولویصاحب اس بیان کی تردید میں تحریر فرماتے ہیں "لیکن میرا خیال ہے کہ میرزا نجف خاں کی سرکار کا یہ فیض خاص نہیں، کیونکہ میرزا نجف خاں نے ۱۱۹۶ھ میں قضا کی اور یہ تذکرہ انکی وفات کے ۲۲ سال بعد ۱۲۱۸ھ میں لکھا گیا ہے علاوہ بریں مولف خود لکھتا ہے کہ نجف خاں کی وفات کے بعد اس نے یہ حالات فراہم کئے اور اپنے استاد مرزا قتیل کی فرمائش پر انکو تذکرہ کی صورت میں ترتیب دیا اس لئے واقعتاً مولف کا ذوق اور میرزا محمد حسین (کذا) قتیل کی تحریر (کذا) اس تذکرہ کی تالیف کا باعث ہے"

مؤلف کا قول ہے:-

(۱)۔ کہ از سن سیزدہ چہاردہ سالگی الی یومنا ہذا کہ ہمگی پنجاہ و چہار مرحلہ از عمر طے گشتہ اکثرے از قسم شعر و غزل بنظر درآوردم و اوقات شبانروزی خود را مصروف ایں فن داشتم و از مطالعۂ دواوین گاہے خود را معاف نمیداشتم چوں بزبان فارسی و سیاق و سباق کلام و محاورۂ روزمرہ ایں زبان چنداں بلدیت نداشتم و فرصت دست نمیداد کہ از زباں داناں کسب ایں معنی کنم از اکثر اصطلاح و استعارہ و محاورہ۔ عاجز و عاطل میماندم و تلذذ بعدم بضاعت نوعیکہ بایدو شاید بکام جاں نمیرسید۔"

اس سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ مولف تیرہ چودہ سال کی عمر سے دشت شعر و سخن کی سیاحی میں مصروف تھا لیکن فارسی محاورات اور روزمرہ سے عدم واقفیت کی بنا پر شعر خوانی میں اسکو پورا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا تھا نہ ایسا موقع میسر تھا کہ زباندانوں کی صحبت سے مستفید ہو کر یہ بات حاصل کرلے۔

(۲)۔ جب وہ نواب عزت الدولہ سہراب جنگ کے توسط سے نجف علیخاں کی سرکار میں پہنچکر دہلی آگیا

تو یہاں اسکو یہ بات میسر آئی یاران ہمجنس و ہم مذاق کی صحبت نصیب ہوئی ہیں اسکو اہل خراسان و عراق و فارس کے ساتھ ہم بزمی کا موقعہ ملا اور انکے ساتھ ہردم نشست و برخاست رہنے سے فارسی محاورہ پر بھی عبور حاصل ہوگیا چنانچہ نواب نجف خاں کی وفات کے تاسف آمیز ذکر کے موقعہ پر مولف کہتا ہے :-

" بعد انتقال نواب موصوف غفران پناہ اختلال کلی در اوضاع اکابر و اصاغر و اہالی و موالی حضرت دہلی راہ یافتہ فتنہ را چار طرف بازار گرم گشتہ یاران مجموع کہ از ازارہ جدائی گشتند مثل اوراق درختاں پریشاں گشتند و بنوعی از جا بجائے شدند کہ باد صرصر خود را بگرد شاں نمی تواند ملحق سازد. لشکر کہ موج بآسماں میزد با خاک برابر و ناچیز گشتہ. اکثر بزرگان دوستاں کہ از دیدن آنہا حیات تازہ داشتم دریں انقلاب شربت شہادت و شوراب ممات نوش شاں شد و از ہمدماں فراموش گشتہ اکنوں دریا و آنعزیزاں و دوستاں اشک رمانی نثار روح آنہا می سازم. خدائے عزوجل جملہ را بیامرزاد. خلاصہ شب و روز در یکجا با مردم خراسان و عراق و فارس صحبت گرم میداشتم تا از برکت صحبت و فیض مجالست ایشاں بے بہرہ نماندم کم و بیش پے بمحاورہ فارسی بردم دریا سیاہ و سفید فرق توانستم کرد

جمال ہمنشیں در من اثر کرد    وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(۳) اسی اثنا میں جو معلومات اسکو اپنے خراسانی عراقی اور خطۂ فارس کے دوستوں سے بہم پہنچی مولف انکو کاغذات کے پرچوں پر علیحدہ علیحدہ لکھتا رہا. اسکا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو مجموعۂ بیاض کی شکل میں ترتیب دیدے لیکن اسکے دوست میرزا محمد حسن قتیل نے مشورہ دیا کہ اشعار ہر اعتبار سے مدون ہو چکے ہیں بہتر ہو گا کہ اسکو بترتیب حروف تہجی تذکرہ کی شکل میں لکھدو چنانچہ مولف نے اسی مشورہ پر عمل کیا. اسکا بیان ہے:-

"اکثر اشعار از زبان عزیزان خراسان و عراق و فارس گوش زد فقیر شدہ بود و بر کاغذ پارہ ہا علیحدہ علیحدہ جمع آمدہ بود خواستم کہ ایں ہمہ اشعار را فراہم ساختہ جہت مشغولی خاطر در قید بیاض آرم کہ صحبت بے نفاق است و بارہا اتفاق استادی افصح الفصحا و اکمل البلغا میرزا محمد حسن المتخلص بقتیل کہ واقعی گشتہ راہ دوست است . . . . . . . .
فرمود کہ اشعار از ہر قسم بسیار فراہم شدہ اگر بطرز تذکرہ طریق تہجی رعایت کردہ آید چہ کہ خوانندۂ ایں بآسانی ہر کدام شاعر را کہ بخواہد اشعارش برآوردہ بخواند بصواب نزدیک تر است بحسب فرمودۂ آں وحید عصر ایں جواہر زواہر بطریق تہجی در رشتۂ تحریر کشیدہ آمد"

اب ظاہر ہے کہ اسی مواد کو جو دہلی کے قیام کے زمانہ میں مولف نے جبکہ نجف علیخاں زندہ تھے اپنے

ایرانی دوستوں کی ہم بزمی میں جمع کیا تھا بجائے بیاض کی شکل میں ترتیب دینے کے بترتیب حروف تہجی تذکرہ کی شکل میں جمع کردیا اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ مؤلف کے بیانات مولانا شیرانی کے قول کے موید ہیں۔

یہاں ایک دوامر اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مرزا قتیل کا نام محمد حسن ہے نہ محمد حسین اور نہ وہ مولف کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ مولف نے استاد کا لفظ بنظر احترام اضافہ کردیا ہے اگر مولوی صاحب مرزا قتیل کے حالات پر جو مولف نے اسی تذکرہ میں بیان کئے ہیں ایک نظر ڈال لینگے تو یہ شبہ جس میں انکے ساتھ انکے انگریزی پیشرو بھی شریک ہیں رفع ہو جائیگا قتیل کے حق میں مؤلف کے یہ الفاظ ہیں:۔

"نہایت یار باش و دوست پرست و ظریف است سی سالست کہ فقیر با ایشاں فرط محبت و اخلاص دارد و بسا اتفاق افتادہ کہ دریک جا بودہ ایم آنچہ یارانہ از راہ شوخی و ظرافت بہ فقیر میکند اگر تحریر آں نماید ضحک و فضیحت خودم است ؎ گر ہمہ سنگ ورہمہ چوب است      ہرچہ از دوست میرسد نیکوست ۔ بلاشبہ دریں زمان قحط الرجال ذات او از غنایم روزگار است و دل مردۂ من بآب لطف یاری او زندہ و تازہ است"

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ انکے تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ تھے نہ استادانہ و شاگردانہ۔ ضخیم تذکروں کے ذکر میں مولوی محفوظ الحق صاحب نے تذکرۂ نشتر عشق کا بھی ذکر کیا ہے اور مصنف کا نام انہوں نے نواب قلیخاں بتلایا ہے حالانکہ انکا نام حسین قلیخاں ہے۔ میں نے یہ تذکرہ پروفیسر شیرانی کے ہاں بچشم خود دیکھا ہے۔

میں اس امر کے سمجھنے سے بھی قاصر ہوں کہ مولوی خدابخش خاں مرحوم کے کتبخانہ کے نسخہ مخزن الغرائب کو مولوی صاحب چنداں قدیم نہیں مانتے جبکہ بوڈلین کتبخانہ کے نسخہ کو جو ۱۲۲۴ھ کا نوشتہ ہے دارالمصنفین کے نسخہ نوشتۂ ۱۲۲۰ھ سے دوسرے درجہ پر مانتے ہیں حالانکہ بانکی پور کے کتب خانہ کا نسخہ بھی ۱۲۲۴ھ ہی کا مرقومہ ہے۔

مخزن الغرائب کے قدیم نسخوں کے سلسلہ میں میں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کا نسخہ جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ دارالمصنفین کے نسخہ سے بھی قدیم ہے اور ابھی تک اسی کو شرف اولیت حاصل ہے اس نسخہ کی تاریخ کتابت ۴۶ھ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۲۱۹ھ اور مقام کتابت لکھنو ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس نسخہ کو امتیاز حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ مؤلف کے اصل مسودہ سے منقول معلوم ہوتا ہے اس میں ایسے آثار اور قرائن موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ خود مؤلف

کے پاس رہا ہے کیونکہ بعض مقامات پر اس میں حک و اصلاح بھی کیگئی ہے۔ اسکے علاوہ بعض معاصرین کے حالات جو اصل مسودہ میں شامل نہیں تھے بعد میں حاشیہ پر اضافہ کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ اصحاب قابل ذکر ہیں۔ سید انشاءاللہ خاں انشا، حضرت شاہ علی اکبر۔ میاں فرخ حسین حرمان۔ سید میر علی حریق۔ غلام فخرالدین خاں حیرت مولوی مصطفیٰ علیخاں۔ گوپاموی خوشدل۔ جواہرلال دبیر۔ حاجی عابد صفاہانی۔ سید تقی میر (شاعر مشہور) کچھمی نرائن محبت۔ میرزا ابوالمعالی عالی وغیرہ ۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسماء مصنف کی پہلی اشاعت ۱۲۱۸ھ میں اگر درحقیقت اس وقت تک کوئی اشاعت ہوچکی تھی داخل ہونے سے رہ گئے تھے۔ وہ اس نسخہ میں اضافہ کردئے گئے۔

تعجب ہے کہ اس نسخہ میں خود خادم کے اشعار نہیں ملتے حالانکہ فہرست اسماء میں حرف خا کے خاتمہ پر یہ الفاظ نظر آتے ہیں "خادم سندیلہ مؤلف تذکرہ" میں یہاں انکے ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

بدیر و کعبہ چہ جوئی خدا کجاست کہ نیست　　　بطوف پردۂ دل شو صفا کجاست کہ نیست

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ احمد علی سندیلوی اپنے مجموعۂ بیاض کے قدیم ارادہ کو نہیں بھولے جو انہوں نے انیس العاشقین کی صورت میں پورا کیا اور شکر ہے کہ انیس العاشقین آج بھی موجود ہے۔ پروفیسر شیرانی کی کتابوں میں جہاں اور نوادر علمی محفوظ ہیں انیس العاشقین کا نسخہ بھی موجود ہے۔ یہ نسخہ بدد علی کاتب نے نواب ابوالقاسم خاں کے ارشاد سے لکھا تھا تاریخ کتابت مذکور نہیں۔

میں ذیل میں اسکی فہرست ہدیہ ناظرین کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست جسکو مولوی صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے مکمل معلوم نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ احمد علی سندیلوی نے اپنے لئے ایک خاص بیاض تیار کی تھی اس بیاض کے ضمن میں بعد میں انہوں نے مختلف بیاضوں اور تذکروں کو موقعہ بموقعہ شامل کردیا اور اصل بیاض حمد و نعت سے شروع ہو کر کہیں آخر میں جاکر ختم ہوتی ہے:۔

(۱)۔ سلسلۂ اصل بیاض مشتمل بر حمد و نعت و منقبت۔

(۲)۔ اشعار بر مضامین مختلفہ مشتمل بر ہشتاد فصول۔ یہ کسی نامعلوم بیاض کا انتخاب ہے ڈاکٹر اسپرنگر بقول مولویصاحب اس میں تراسی فصلیں بتاتے ہیں لیکن موجودہ بیاض میں صرف اسی فصلیں ہیں جنکی فہرست حسب ذیل ہے:۔ (۱) در مراقبہ و ذکر (۲) اشعار کہ مریدان بہ پیران نویسند (۳) اشعار کہ پیران بمریداں نویسند (۴) در تاسف و ندامت (۵) در ذکر شعر و سخن (۶) در ذکر عشق و عاشق (۷) ناز معشوق (۸) ادا و

| نمبر ۴ | # فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء | | جلد ۲ |
|---|---|---|---|
| نمبر شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
| ۱ | جہاں نما | بشیر احمد | ۱۹۴ |
| | تصویر | | |
| ۲ | ٹیپو سلطان | اختر | ۱۹۶ |
| ۳ | رباعی | شیخ غلام قادر گرامی شاعر خاص حضور نظام | ۲۰۴ |
| ۴ | درس عمل | آغا سید عابد علی شاہ صاحب نیر | ۲۰۴ |
| ۵ | اخلاقیات اجتماعیہ | مولانا ابو الاعلیٰ مودودی | ۲۰۵ |
| ۶ | مصر کے آثار قدیمہ | جناب سید حفیظ الدین صاحب (شملہ) | ۲۰۹ |
| ۷ | مآثر الملک توت عنخ امن | جناب مولوی عبد اللہ صاحب | ۲۳۳ |
| ۸ | روداد ہجرت | ابو الفاضل سید راز چاندپوری | ۲۳۵ |
| ۹ | انگلستان کے اخبارات | پروفیسر رام سروپ کوشل ایم۔ اے | ۲۳۶ |
| ۱۰ | غزل | حضرت آبر قدوائی | ۲۴۲ |
| ۱۱ | مطالعہ کتب | مسٹر محمد عبد الحی صدیقی بی۔ اے۔ (علیگ) | ۲۴۳ |
| ۱۲ | شام غم | جناب محمود اسرائیلی (بمبئی) | ۲۴۵ |
| ۱۳ | پرستارۂ مسیح (افسانہ) | حضرت رفیعی اجمیری | ۲۴۶ |
| ۱۴ | جذبات سیفی | ابو الاعجاز جناب سیفی سہواردی | ۲۵۲ |
| ۱۵ | وی نس | مولانا ناظر دہلوی | ۲۵۳ |
| ۱۶ | محفل ادب | - - - - - - - - - - | ۲۵۴ |
| ۱۷ | نئی کتابیں | - - - - - - - - - - | ۲۵۶ |

# جہاں نُما

## لندن کی نمائش

کہتے ہیں کہ اگست میں لندن بے رونق ہوتا ہے نہ بادشاہ کے محل میں عوام وخواص بُلائے جاتے ہیں نہ بڑے بڑے جلسے منعقد ہوتے ہیں نہ بڑے بڑے آدمی ایک دوسرے کو ملاقاتی کارڈ بھیجتے ہیں کہ اگست لندن کا "موسم" نہیں لیکن جیسا کہ پچھلے روز ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار نے لکھا اس دفعہ لندن کا "موسم" ختم نہیں ہوا۔ نمائش کی وجہ سے دُنیا کے مشتاق سیر کنندگان لندن پر ٹوٹ پڑے۔ پھر اہل نمائش کی اشتہار بازی بھی انسانی دماغ کو پاگل کئے دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی نمائش ہے ایسی نمائش کبھی تاریخ کی آنکھوں نے نہیں دیکھی جس سے یہ بھی مُراد ہے کہ پھر ایسی نمائش کبھی دیکھنے میں نہ آئیگی۔ ایک روپیہ دو آنے کا ٹکٹ لیکر داخل ہو جیئے تو کتابیں اور نقشے بیچنے والے احاطہ کر لیتے ہیں کہ نمائش کو آپ ہدایت واشارات کے بغیر کیا سمجھینگے۔ یہ لیجئے خضر راہ! بدبختی سے آپنے اس فرضی خضر کو ساتھ لے لیا تو آپ لگے سامنے کو چلنے اور کتاب پڑھنے کہ کہاں کیا شئے ہے؟ بھیڑ اتنی ہے کہ خدا کی پناہ آپ بار بار کھڑے ہو کر نقشے کا مطالعہ کرتے ہیں کہ یہ عمارت کونسی ہے یہ تماشاگاہ کیا ہے۔ ایک گھنٹے میں آپ بمشکل نصف نمائش کی عمارتوں تک پہنچینگے کہ آپکا دماغ چکرا جائیگا۔ نقشہ کتاب لپیٹ کر آپ جیب میں ڈال لیجئے اور ایک معمولی متنفس بن کر جو شئے سامنے آجائے اُسے دیکھئے۔ بیچوں بیچ میں ایک مستطیل صورت جھیل ہے جس کے اوپر وینسی طرز کے پل ہیں۔ اسکے دائیں بائیں کنیڈا اور آسٹریلیا کی عمارتیں در صنعت وحرفت اور آرٹ کے محل ہیں دوسرے پر ہندوستان کی تاج نما تعمیر ہے۔ اسکے اردگرد افریقی چینی ایشیائی مقبوضات کی نمائشی گاہیں ہیں مصر کو جگہ نہیں دی گئی اور مصر لے بھی کیوں؟ اب وہ برطانوی پنجے میں نہیں ہے کہ بُلائے سے چلا آئے!

ویمبلے کی نمائش میں ہر روز ایک لاکھ یا اُس سے کم وبیش لوگ جاتے ہیں لیکن نمائش والے مایوسی سے کہتے ہیں کہ یہ گھاٹے کا سودا ہے البتہ اُن کا خیال ہے کہ سلطنت برطانیہ میں ربط وضبط اور اتحاد اسی طرح بڑھیگا۔ گویا اس خیال کے مطابق اگر مصر الگ نہ ہو چکا ہوتا تو یہ نمائش اُسے بچا لیتی شائد؟ نہیں نہیں! دُنیا کی تحریکیں جہاں اُن میں جان ہو نمائشوں سے روکے نہیں رُک سکتیں اور جہاں

ہیجان ہوں ُہاں نمائشوں میں چلی آتی ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان کو اس نمائش میں حصہ نہ لینا چاہیئے تھا ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان والے یہاں آئیں اور دیکھیں کہ یہ قومیں کس طرح جیتی جاگتی ہیں کس طرح کام کرتی ہیں پھر آرام لیتی ہیں کس طرح مصروف و منہمک ہیں۔ اسی واسطے دُنیا کو اپنے قابو میں کئے ہُوئے زندگی سے حظ اُٹھاتی ہیں۔ انگلستان کس طرح اپنی سلطنت کو تباہ ہوتے دیکھے اور خاموش رہے شیر جب تک جنگل میں موجود ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ جنگلوں کا بادشاہ نہ بنا رہے پھر جب جنگل کی لومڑیاں شیر بننا سیکھ لینگی تو یہ شیر اپنے جنگل میں جا بسیگا اور ہمارے جنگل میں ہمارا شیر دھاڑیگا۔ یہ قدرت کا قانون ہی فطرت کا تقاضا ہے۔ قوت زندگی ہے اور طاقت دنیا پر حکومت کرتی ہے کمزوری سے تو اک جسم بھی نہیں سنبھلتا کہاں اک ملک ؟

یہ نمائش بہت عظیم الشان ہے لیکن بہت خوبصورت نہیں! تجارت کی عظمت ہے حسن کی شوکت نہیں۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں اب جنگِ عظیم کے بعد کس کے پاس فالتو روپیہ ہے کہ خوبصورتی اور نقاشی اور دل آویزی میں کھو کا مرے۔ زندگی کی جدوجہد ہے اور جینا اور رہنا منظور ہے۔

ایک طرف کو تفریحی حصہ ہے پنگوڑے کوہستانی ریلیں اور ایسی ہی بیسیوں چیزیں ہیں بڑے بڑے کھوسٹ جوان بنے بیٹھے ہیں۔ جب تک موت نہ آجائے اور گلا نہ گھونٹ دے یورپ میں کوئی مرنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ لوگ کہتے ہیں ہمیں مرنے کی فرصت نہیں موت کو اپنے سے بہت دُور رکھتے ہیں ہماری طرح اُس کی خاطر مدارات نہیں کرتے کہ آئیے حضور کچھ نوش فرمائیے! جیتے ہیں تو جیتے ہیں اور مرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے اخبار میں چھپ گیا کہ یہ حضرت اُٹھ گئے۔ تماشا ختم ہُوا۔

د۔ ب

# ٹیپو سلطان

دُنیا کے جس مُبارک خاندان پر پہلے پہل اسلام کی برکتوں کا نزول ہُوا وہ قریش تھا۔ مکہ کا جو گھر ختم المرسلین کا گہوارہ بنا وہ ایک قریشی کا تھا، اور جس آواز نے عرب کے کفرستان کو نغمہ زار توحید بنادیا وہ ایک قریشی ہی کی آواز تھی ––! اس خاندان کیلئے سب سے بڑا فخر تو یہی ہے کہ اسکا ایک فرد، رحمۃ اللعالمین بنکر آیا، دُنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کر گیا۔ اور دیارہستی کے بھٹکے ہُوئے مسافروں کو سیدھے راستے پر لگا گیا ——— ! لیکن اسکا یہ اثر، بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسکے بعد اسکے خاندان نے ہر جگہ ایک نہ ایک جوہر قابل ضرور، یادگار چھوڑا ہے..... اور تو اور ہندوستان جیسے دور دراز خطہ میں بھی اس شریف ترین قبیلہ کے معزز افراد کے آغوش، بچّوں سے نہیں اقبال وخوش بختی کے پھُولوں سے معمور رہے ہیں ——— ! چنانچہ بارھویں صدی ہجری میں جنوبی ہند میں قریش کی فرخندہ اقبالی نے ایک ایسا ہی پھول کھلایا، جس کی مہک نے بزم شاہی کو معطر کردیا۔ اور دیار شجاعت کے رہنے والوں کو مدہوش ——— ! کون ہے؟ جس نے ٹیپو سُلطان ابن حیدر علی خان (سُلطان) کا نام نہ سُنا ہو! جس کی تلوار کی جھنکار سے، جنوبی ہند کے دشت وجبل آج بھی گونج رہے ہیں، جسکے دلیرانہ نعروں سے دکن کے درودیوار اب بھی لرز رہے ہیں! مورخ کا قلم اسے بھُول جائے، لیکن دل اسے نہیں بھُول سکتے، سرنگاپٹم کی زمین پر اسکا مقبرہ ویران ہوجائے مگر سینوں میں ہمیشہ آباد رہیگا ——— !

حسب نسب | ٹیپو سُلطان کے حسب نسب کے باب میں انگریز مورخین نے بہت کچھ زہر اُگلا ہے لیکن اس صداقت سے انکار کرنا کفر ہے۔ کہ وہ قریشی النسل تھا، اسکا سلسلۂ نسب حسن بن یحیٰی سے شروع ہوتا ہے جو عرب کے امرا و رؤسا میں جمال صورت اور کمال معنی کے اوصاف سے موصوف تھے، اور سلطنت عثمانیہ کی طرف سے شریف مکہ تھے،

انکی اولاد میں ایک شخص حسن بن ابراہیم نام تھا جو اپنے عزیزوں کو لیکر ہندوستان آگیا۔ اور اجمیر پہنچکر خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ میں رہنے لگا۔ آخر کار متولی درگاہ نے اسکے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کردیا۔ حسن بن ابراہیم نے ۱۰۷۵ھ میں انتقال کیا۔ انکے فرزند ولی محمد بعض خانگی جھگڑوں کی وجہ سے اجمیر کو الوداع کہکر دلی اور دلی سے گلبرگہ (دکن) پہنچے۔ درگاہ شاہ گیسودراز کے متولی کی صاحبزادی سے اپنے

لڑکے کا نکاح کر دیا۔ اور خود ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اور آخر عہد حکومت علی عادل شاہ میں انتقال فرمایا

انکے اخلاف کبھی گلبرگہ میں مقیم رہے، کبھی بیجاپور میں اور کبھی کولار میں۔ انکی فرائض ابتدا میں مذہبی رہے اور آخر میں فوجی خدمات میں تبدیل ہو گئے۔

حیدر علی سلطان | ۱۱۲۹ھ میں اس خاندان کو حیدر علیخاں جیسے اولوالعزم اور بہادر سلطان کی ولادت پر خوشیاں منانے کی عزت نصیب ہوئی۔ جسکے، خود ساختہ زندگی، عروج و ترقی، اور جوانمردی کی کہانی اپنی آپ نظیر ہے۔ اسکا عہد وہ عہد تھا جب مغلیہ حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، انگریزوں نے "بھارت ماتا" کی انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑ لیا تھا۔ ہر طرف طوائف الملکی کا دور دورہ تھا، جنوبی ہند میں کئی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ پیشوا، نظام اور نواب ارکاٹ سبھی یہ چاہتے تھے کہ اپنی اپنی حکومت کو پھیلائیں۔ ایک طرف آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی براجمان تھیں دوسری طرف فرانسیسی بازیگر تلوار کا خونی ناچ دکھا دکھا کر انعام میں فیاض مشرق سے سارا ہندوستان مانگ رہے تھے، کسی کو اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں پر بھروسہ تھا۔ کوئی آگ کے ہتھیاروں سے اپنا کام نکالنا چاہتا تھا۔ اس حال میں یکایک حیدر علیخاں بھی میدان جنگ میں نکلا اسکا چہرہ ہمت و استقلال کا نمونہ تھا اور اسکی پیشانی اسکے نام کے جاہ و جلال کی روشنی سے جگمگا رہی تھی، اسکے طاقتور ہاتھ دنیا کی دولت سے خالی تھے لیکن "ذوالفقار" سے مزین، اسکے دل میں ریشہ دوانیوں کی امنگ تھی، نہ سازشوں کا خیال، لیکن یہ اعتقاد کہ ع

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

آخر وہ کارپول نپولین کی طرح حیدر علی نائیک سے ترقی کرکے ایکدن تاج و تخت کا مالک بنگیا اور اس عروج کے عالم میں ۷، دسمبر ۱۷۸۲ء مطابق ۱۱۹۵ھ کو دنیا سے سدھارا۔ لیکن اپنا ایسا جانشین چھوڑ گیا جسکی مثال تاریخوں میں بہت کم ملتی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ باپ جسکے باقیات الصالحات میں ٹیپو سلطان جیسا فرزند ہو!

ٹیپو سلطان کی ولادت | ٹیپو سلطان ۲۰۔ ذی الحجہ یوم سہ شنبہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۷۵۲ء کو دیون ہلی میں پیدا ہوا اسکی ماں میر معین الدین خاں صوبیدار کڈاپہ کی صاحبزادی فخر النساء بیگم تھیں۔

تعلیم و تربیت | جب ٹیپو سلطان کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو عربی فارسی فرنچ انگریزی کی تعلیم کا اعلےٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا۔ اور فنون سپہ گری کیلئے بڑے بڑے مشہور استاد ملازم رکھے گئے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں اس نے اپنے تئیں ایک لائق شہزادہ اور بہادر سپاہی ثابت کر دیا اور باپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہونے لگا۔

تخت نشینی | جس وقت نواب حیدر علیخاں بہادر نے رحلت فرمائی ہے ٹیپو سلطان کو نیباتور اور پانی گھاٹ

کے علاقوں میں مصروف تنبیہ و انتظام تھا۔ وفادار درباریوں نے نہایت پوشیدگی سے مرحوم سلطان کا جنازہ سری رنگ پٹن کو روانہ کرکے کچھ دنوں کے لئے مصلحتاً ٹیپو سلطان کے چھوٹے بھائی محمد کریم شاہ کو تخت پر بٹھادیا اور فوراً قاصد بھیجکر ٹیپو سلطان کو اس سانحہ سے اطلاع دی۔ یہ خبر سُن کر ٹیپو سلطان اپنی فوج لے کر ارکاٹ پہنچا۔ اور سراپردۂ شاہی میں داخل ہوکر بیسویں محرم ۱۱۹۷ھ بروز یک شنبہ سلطنت کی باگ ہاتھ میں لی۔ مُبارک سلامت کی دھوم ہُوئی۔ اور انعام و اکرام سے ہر ایک کو سرفراز کیا گیا۔

**سلطان کی مشکلات** | دُنیا کا کوئی تاجدار اسقدر مشکلات سے دوچار نہیں ہُوا ہوگا۔ جس قدر مشکلات کا ٹیپو سلطان کو اپنی زندگی میں مقابلہ کرنا پڑا۔ تخت پر بیٹھتے ہی حاکموں، ناظموں، اور قلعداروں کی نمکحرامیاں بغاوتیں، اور لڑائیاں نظام کی فوجوں سے مقابلہ۔ پیشوا کے حملوں کی روک تھام، انگریزوں کی باضابطہ سپاہ کی مقاومت مرہٹوں کے شر و فساد کا استیصال، اور اپنے ملک کا انتظام، الغرض یہ ایسی اہم دقتیں تھیں جنہیں اسی کا دل گردہ تھا کہ آخر وقت تک برداشت کرتا رہا۔ اور انکی دفعیہ میں اپنی جان لڑاتا رہا۔

کچھ شک نہیں اسکی ساری کی ساری زندگی ملکداری کے جھگڑوں میں کٹی، اسکے ہموطنوں نے اسکا ساتھ نہیں دیا، اسکے دوستوں نے اسے ہمیشہ دھوکا دیا، اور اسکے ملازموں نے ہر وقت اسکی نمکحرامی کی، اسکے باوجود جب ہم اسکی فتوحات، انتظامات اور وسعت ملک پر نظر کرتے ہیں تو دل پر اسکی عظمت اور ہمت و شجاعت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

**معرکہ آرائیاں** | وہ ایک دلیر، جفاکش، اور بیدار مغز سُلطان تھا، میدانِ جنگ سے اسے کسی نے کبھی پیچھے ہٹتے نہیں دیکھا۔ جہاں گیا فتح پائی، اور جس پر حملہ کیا اسے شکست دی۔ اسکی معرکہ آرائیوں کے تفصیلی حالات کی یہاں گنجایش نہیں البتہ بعض اہم اور قابل ذکر معرکے یہ تھے۔

فتح حیدر نگر ——— ۱۱۹۷ھ

سرکشان کوڑک کا استیصال ——— ۱۱۹۸ھ

دربار پونا و نظام دکن کی فوجکشی ——— ۱۱۹۹ھ

مرہٹوں کی گوشمالی، کیبلی کی تسخیر مع محاربات عظیم ——— ۱۱۹۹ھ

تسخیر شانور ——— ۱۱۹۹ھ

جنرل میڈوس کی لشکر کشی ——— ۱۲۰۵ھ

انگریز | اس زمانہ میں دو بیرونی طاقتیں ہندوستان پر قبضہ کرنیکی کوشش کر رہی تھیں اول انگریز دوسرے فرانسیسی ٹیپو سلطان انگریزوں کا دشمن تھا اور انہیں ہندوستان سے نکالنے پر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ البتہ فرانسیسی اسکے دوست تھے۔ باقی رہے نظام دکن و دربار پونا تو وہ انکی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ انگریزوں سے تھا، اور انگریز بھی ہندوستان بھر میں اسی سے ڈرتے تھے اور اسی لئے کبھی عیاریوں سے کبھی صلح کر کے کبھی سازشوں کے جال بچھا کر اسکی طاقت کو کمزور کر دینا چاہتے تھے، دو سے زیادہ بڑی لڑائیاں ایسی ہوئیں جن میں اکیلے ٹیپو سلطان کے مقابلہ میں انگریزوں کے ساتھ نظام اور دربار پونا کی فوجیں بھی شریک جنگ تھیں۔ ایک وطن پرست کیلئے اس سے زیادہ روح خراش امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ غیروں کے ساتھ خود اسکے ہموطن بھی اسے مٹی میں ملانا چاہیں اور اس عبرتناک منظر سے صرف ٹیپو سلطان ہی دوچار نہیں ہوا۔ بلکہ ہندوستان کا جو سپوت بھی جب کبھی ہندوستان کے لئے لڑا ہے سب سے پہلے اسے اپنوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز ننالم — کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

بیرونی حکومتوں سے تعلقات | حیدر علیخاں کی طرح ٹیپو سلطان کے ارادے بھی بہت بلند تھے، اس نے ایک بڑے فرمانروا کی طرح حکومت افغانستان، حکومت ایران، اور حکومت ترکی و فرانس سے دوستانہ تعلقات قائم کئے تھے۔ سلطان سلیم کے نام اسکے جو خطوط ہیں ان سے اس جذبۂ خلوص کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے جو ایک سچے مسلمان کے دل میں خلیفۃ المسلمین کی طرف سے موجزن ہوتا ہے۔

بحری فوج کا انتظام | بری فوج کے انتظام کے علاوہ اس نے ۱۷۹۶ء میں امیر البحروں کی ایک جماعت قائم کی جس میں گیارہ اراکین تھے۔ انکا لقب "میریم" تھا۔ انکے ماتحت تیس امیر البحر تھے اور بیس بڑے جنگی جہاز اور بیس چھوٹے جہاز کا بنانا تجویز ہوا تھا اول درجہ کے ہر جہاز پر ۷۲ توپیں چڑھانے کی تجویز تھی۔ چھوٹے جہازوں پر ۴۶ توپیں چڑھانیکا انتظام تھا۔ سلطان نے ان امیران یم کے پاس جہازوں کے نمونے بھیجے تھے کہ انکے مطابق جہاز تیار کرائے جائیں اور جہازوں کی لکڑی کے لئے جنگل بھی نامزد کیا گیا تھا لیکن اس زبردست سیاسی تجویز پر عمل درآمد سے پہلے خود اسکا جہاز حکومت "دریائے ہنگلی" میں ڈوب گیا۔ اگر یہ شاندار اسکیم بر روئے کار آتی تو کون کہہ سکتا ہے، ہندوستان اور ہندوستان ہی نہیں دنیا کا موجودہ عہد کس قدر بدلا ہوا ہوتا ؟

ترویج صنعت | ٹیپو سلطان نے اچھے اچھے انگریز اور فرانسیسی صناع جمع کرکے توپ بندوق، چاقو قینچی گھڑیاں مخمل بانات اور ظروف چینی بنانے کے لئے چار کارخانے، سرنگاپٹن بنگلور۔ چیتل درگ، اور چیدرنگر میں کھولے تھے۔ اور دیسی کپڑے، کمخواب اور زری کے کاموں پر ہندوستانی کاریگر مامور کئے تھے جس سے ہر قسم کی چیز ملک میں کثرت سے بننے لگی تھی۔

اختراعات سلطانی | ٹیپو سلطان کو جدت و اختراع کا بہت شوق تھا، شہروں کے نام بدلنا تو معمولی بات تھی، وزن اور پیمانہ بھی خود اپنے اختراعی رائج کئے تھے۔ لیکن اسکا تخت اور ارگن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تخت بنوانے کی تحریک خلیفۃ المسلمین کے خط سے ہوئی جس میں ٹیپو سلطان کو لفظ سلطان سے یاد کیا گیا تھا اور تخت و تاج کے قائم رہنے کی دعا دی گئی تھی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان نے ایک سونے کا تخت بنوایا اور اسے نہایت قیمتی جواہرات سے سجوایا اسکی صورت یہ ہے کہ ایک شیر کی پشت پر رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے تخت کے اوپر چتر شاہی قائم ہے اور چتر کی کلغی پر ہما بیٹھا[1] ہے جو سلطان کے سر پر سایہ زن رہتا تھا۔ اسکے پروں پر لعل و زمرد جڑے ہوئے تھے! ارگن شیر کی صورت پر بنوایا تھا جو ایک انگریز کو دبوچے ہوئے معلوم ہوتا ہے، شیر کے پنجے انگریز کے سینہ میں پیوست ہیں، شیر کے پیٹ میں ساز کے کل پرزے نہایت اُستادی سے لگائے گئے ہیں۔ اس کی آواز ایک چیتے کے غرانے اور ایک آدمی کے خوفزدہ آواز سے مشابہ ہوتی تھی گویا ایک چیتا کسی آدمی کو پھاڑ کھانا چاہتا ہے جس سے وہ آدمی سہمے ہوئے لہجہ میں فریاد کر رہا[2] ہے۔ اس سے اس نفرت کا پتہ چلتا ہے جو اسے انگریزوں سے تھی اور یہ بھی کہ وہ شیر کو کس قدر پسند کرتا تھا اس کا قول تھا کہ "مجھے دو دن کیلئے شیر کی زندگی پسند ہے لیکن دو سو برس کے لئے بھیڑ کی زندگی پسند نہیں" اسکے سپاہیوں کی وردیوں میں شیر کی کھال کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں اور توپوں اور دوسرے سامان پر بھی شیر کی تصویر بنی ہوتی تھی، اسکے محل کے سامنے کٹہروں میں شیر بند رہا کرتے تھے، اور اسکے تمام ہتھیاروں پر "اسد اللہ الغالب" کندہ یا لکھا ہوتا تھا،

شہادت | آخر وہ دن آیا جب نیستان ہند کا یہ بہادر شیر موت کی گہری نیند سو گیا، وہ جنگل جن میں وہ دھاڑا

---

[1] اب یہ تخت انگلستان کے ونڈسر کیسل میں رکھا ہے۔

[2] یہ ارگن ٹیپو سلطان کے اور سامان سمیت برٹش میوزیم میں رکھا ہے۔

کرتا تھا سنسان نظر آنے لگے اور جن آبادیوں میں وہ حکومت کرتا تھا ویران ہوگئیں، اسکا واقعہ یوں ہے کہ ۱۲۱۳ھ میں انگریزوں نے اعلےٰ پیمانہ پر جنگی تیاریاں کر کے سری رنگ پٹن پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے بڑی سختی سے مقابلہ کیا لیکن افسوس اسکے نمکحرام درباری سب دشمنوں سے ملے ہُوئے تھے کچھ پیش نہیں گئی۔ اس جنگ میں فرانسیسیوں نے بہت مدد دی اور آخر وقت تک لڑے رہے مگر جب گھر والے ہی گھر لوٹنے لگے تو وہ بیچارے بھی کیا کر سکتے تھے۔ ادھر قلعہ کی دیوار ٹوٹی اُدھر دشمن کی فوج قلعہ میں گھس گئی۔ جسکے لئے نمکحرام نوکروں نے رومال سے اشارہ کیا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ جب آخر وقت سلطان نے ایک دربان کو دریچہ کھولنے کے لئے آواز دی تو اس ملعون نے بھی چپ سادھ لی۔ اتنے میں گورے باڑھیں مارتے ہُوئے قریب آپہنچے سلطان شیر دل نے نہایت غضبناک ہو کر تنہا ان پر حملہ کیا اور کئی سپاہیوں کو تلوار سے مار گرایا۔ آخر زخموں سے چور چور تو ہو ہی رہا تھا۔ ایک گورے کی گولی پیشانی پر لگی اور جام شہادت نوش فرمایا۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون ؎

پڑا تھا خاک پہ اس نامور کا لاشہ ہائے
فلک یہ تو نے دکھایا ہے کیا تماشہ ہائے

یہ تھا مشرق کے اس نامور محب وطن سپہ سالار اعظم کا دردناک انجام، جو سیاسیات ہند میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اور اپنے شاندار جنگی بیڑے کے ذریعہ ایران و افغانستان اور دولت عثمانیہ سے ربط ضبط بڑھا کر اتحاد اسلام کی زبردست تحریک کو برسوں پہلے منتہائے عروج تک پہنچانیکا ارادہ کر رہا تھا۔ اسکی بے سروسامانی اور آئے دن کے باہمی ملکی فسادات کو دیکھتے ہُوئے اس کی اولوالعزمی کے مقابلہ میں نپولین کی ہمت و شجاعت نظروں میں نہیں جچتی۔ اسکے دلاورانہ حملوں اور زبردست جنگوں پر نظر کرتے ہُوئے دل سے تیمور و نادر کے کارناموں کی یاد مٹ جاتی ہے۔ وہ سپاہی کے گھر میں پیدا ہُوا، اس نے سپاہیانہ زندگی گذاری، اور سپاہیانہ موت مرا ؎

مرا وہ موت جسے کہئے عاشقانہ موت سپاہی کہتے ہیں جس کو سپاہیانہ موت

اسکے شاہانہ دل و دماغ کی قدر و قیمت کوئی اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک اسکے سے شاندار ارادے لیکر پیدا نہ ہو ؎

زمانہ گرچہ مخالف ہی پایا ٹیپو نے کریگا کون جو کچھ کر دکھایا ٹیپو نے

صفات وعادات | مرحوم سلطان کی بہادری شہسواری اور قادراندازی کا اسکے دشمنوں کو بھی اعتراف ہے لیکن ایک جنگجو بیدار مغز، سپہ سالار ہونیکے علاوہ وہ بہت بڑا انشی بھی تھا۔ وہ ہر اہم مراسلت خود لکھتا۔ ہر صیغہ پر نگرانی رکھتا، اور علوم وفنون، طب، تجارت، مذہبی معاملات، تعمیر محکمہ جات، فوجی اور انکے سوا، ہر ضروری معاملہ میں یکساں مہارت سے قطعی رائے دیتا تھا۔ اس نے ایک تقویم بھی بنوائی تھی، زبان فارسی کی تکمیل پورے طور کی تھی۔ عربی درسیات سے بھی فارغ تھا۔ اپنے دستخط طغرا میں کرتا تھا۔ کھیل اور تفریح سے اسے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ اس نے ایک حربی کتاب لکھوائی تھی اور اسکا نام فتوحات غازیاں رکھا تھا۔ اس میں ورزشوں، فوجی کرتبوں، افسر کے فرائض، شبخوں کے طریقوں، رخصت کے قاعدوں، فوجی قوانین اور جنگی معاملات کے متعلق نہایت ضروری اور اہم امور درج کئے گئے تھے۔ وہ جس کسی سے جو عہد کرلیتا تھا اسے پورا کرتا تھا۔ اور عورتوں کی عزت کرتا تھا۔ چنانچہ جب سنہ ۱۲۰۰ھ میں دربار پونا اور نظام کی فوجوں سے جنگ ہوئی اور سلطانی عساکر کے ہاتھوں قیدیوں میں سرداران مرہٹہ کی اٹھارہ عورتیں بھی گرفتار ہوکر آئیں تو سلطان نے انہیں نہایت حفاظت اور عزت وآبرو کے ساتھ انکے لشکر میں پہنچادیا۔ کامل الحیا ایسا تھا کہ اسکے پنجوں اور کلائیوں کے سوا کسی نے اس کا جسم کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔ پکے دیندار مسلمان کی طرح بالکل سادہ اور شرعی لباس پہنتا تھا اور یہی قاعدہ اپنے ماتحتوں کے لئے جاری کر رکھا تھا۔ سرنگاپٹم کے پہلے محاصرہ کے بعد سے ٹاٹ پر سونا شروع کردیا تھا۔ اور کھانا کھاتے ہوئے کوئی مذہبی کتاب پڑھوا کر سنتا تھا۔

سکہ | ۱۲۰۰ھ میں اس نے اپنا روپیہ چلایا اور اسکا نام امامی روپیہ رکھا۔ روپیہ کے دونوں رخ پر ایک فقرہ اور ایک مصرعہ مضروب ہوا۔

| | |
|---|---|
| دین احمد درجہاں | ہو |
| روشن ز فتح حیدر است | السلطان الوحید العادل |
| ضرب نگر سال دو ۱۱۵۵ء | سیوم بہاری سال دو ۴ء |
| ہجری | جلوس |

رقبہ | جو ممالک ٹیپو سلطان کے قبضے میں تھے عرض وطول انکا اسی ہزار میل انگریزی سے کم نہ تھا ان میں ایک ہزار جزیرے تھے انکا سالانہ خراج بعد وضع اخراجات ملکداری تین کروڑ روپیہ خزانہ

سلطانی میں داخل ہوتا تھا۔ لنکے باشندوں کا شمار ساٹھ لاکھ نفوس سے زیادہ تھا۔ ان میں سے ایک لاکھ پینتیس ہزار سوار، پیادے اور قواعد داں ان ملکوں کے حصار و قلاع پر متعین رہتے تھے اسکے علاوہ مختلف حدود میں اور فوجیں تھیں جنکا شمار ایک لاکھ اسّی ہزار تھا۔ انکے گروہ الگ الگ تھے جیسے دکنی، کرناٹکی، ہندی حبشی، ایرانی، ترک عرب، فرانسیسی، انگریزی، اور ہر ایک گروہ کی وردی علٰحدہ علٰحدہ تھی۔ گویا ایشیا، افریقہ، یورپ کا مجموعی نمونہ قائم کیا تھا۔

مقبرہ | جب سلطان شہید ہوگیا اور انگریزوں نے قلعہ میں داخل ہوکر ہر جگہ چوکی پہرے بٹھادئے تو دوسرے دن جنرل بیرڈ نے سلطان کے نوکروں اور شہزادوں سمیت اس دروازہ پر جہاں سُلطان شہید کی لاش پڑی تھی، آکر بڑی تلاش سے اسکے جسم پاک کو دوسری لاشوں کے درمیان سے نکالا۔ سلطان کے چہرہ پر کوئی تغیر پیدا نہ ہُوا تھا۔ ابتک شجاعت اور بہادری کی علامتیں پائی جاتی تھیں۔ جنازہ کو حرم سرا میں لیجاکر رکھاگیا۔ پھر جنرل ہارس نے حکم دیا کہ اسکی تجہیز و تکفین نہایت احترام سے کیجائے۔ قاضی نے دفن و کفن کا سامان کیا۔ اور ۵ مئی ۱۷۹۹ء کو اسکا جنازہ بڑے احتشام کے ساتھ قلعہ سے روانہ ہُوا۔ تمام سردار اور عہدہ دار شریک تھے۔ دوسرا فرزند شہزادہ عبدالخالق جنازہ کے ساتھ روتا ہُوا جارہا تھا۔ گوروں کی چار کمپنیاں ساتھ تھیں جب جنازہ لال باغ کے دروازہ پر پہنچا نظام علیخاں کی فوج کے سب سردار اور مسلمان شریک جنازہ ہُوئے جنازہ نواب حیدر علیخاں کے مقبرہ پر ٹھیرایا گیا اس وقت تمام سپاہیوں نے دورویہ صف بستہ ہوکر اپنے ہتھیاروں کو خم کرکے رسم تعظیم ادا کی پھر قاضی شہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اور نواب حیدر علیخاں کی قبر کے پاس دفن کیا۔ اتفاق سے اُسی دن شام کو دفعتہً ایک طوفان اُٹھا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نے زمین کو ہلا دیا۔ گویا اسکی عبرتناک موت پر زمین و آسمان نوحہ کر رہے تھے۔ اکثر مقامات کے علاوہ سلطان کے دیوانخانے اور محلسرا پر بھی بجلی گری۔ جس سے سارے شہر میں سُلطان کی شہادت کو ایک غیر معمولی عزت حاصل ہوگئی۔

اب یہ جوانمرد سُلطان اپنے بہادر باپ کے پہلو میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے جہاں ملکداری کے جھگڑے ہیں، نہ حکومت کی معرکہ آرائیاں! انگریزوں کے حملے ہیں، نہ مرہٹوں کے فساد! زمردیں پتوں کی ہلالی تلواریں اسکے دائمی خوابگاہ پر سایہ زن ہیں، اور جوانان چمن اس کی

ابدی آرامگاہ کے محافظ! ہر سال بہار آتی ہے، اور مشرق کے اس نامور سپہ سالار کی قبر پر عقیدت کے پھول بچھا جاتی ہے، برسات کی بھیگی ہوئی ہوائیں آتی ہیں اور اسکی تربت پر بھینی بھینی خوشبو کا غلاف چڑھا جاتی ہیں ؎

رہا زمانہ میں کچھ روز میہماں کی طرح — بہار اسکی جو آئی بھی تو خزاں کی طرح
چھپا نگاہوں سے وہ گنج شایگاں کیطرح — دلوں سے محو ہوا یا درفتگاں کی طرح
کسی بشر نے نہ کی اسپہ اشک افشانی
فرشتے گور پہ کرتے ہیں فاتحہ خوانی

(اختر شیرانی)

---

## رباعی

مارمز شناسِ نکتہ ہائے دردیم — ما جوہرِ قابلیم یعنی فردیم
مائیم اسیر کعبتینِ امید — سرگردان بر بساطِ ہستی نردیم

گرامی

---

## درسِ عمل

خودی پر مٹنے والے آ خدا کا ترجمان ہوجا! — محبت کی زباں ہوجا! حقیقت کا بیاں ہوجا!
سنا دے نوحہ سنجان چمن کو نغمۂ شیریں! — مچل کر ساحل امید پر میل رواں ہوجا!
بہت سی منزلیں طے کرچکے ہیں قافلہ والے — نکل آ! پردۂ محمل سے گردِ کارواں ہوجا!!
ترا دل بھی تو سودیر وحرم کا جلوہ خانہ ہے — پرستارِ وطن! تو آپ اک ہندوستاں ہوجا!!
تجھے شمع حرم، درسِ تپش دیتی ہے اے نیرؔ!!
محبت میں جلا کر دل کو دل کا راز داں ہوجا!!

آغا عابد علی شاہ نیر

# اخلاقیاتِ اجتماعیہ

گذشتہ سے پیوستہ

اکثر لوگ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ تمدن جتنا جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا کاروباری زندگی میں رفق و محبت کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے پہلے ارباب معاملہ کے باہمی تعلقات رفیقانہ ہوتے تھے اور بعض اوقات ان میں خاندانی تعلقات کی جھلک پائی جاتی تھی، مگر اب بقول کارلائل سوائے "روپے کے تعلق" کے نہ مربیانہ شفقت ہے اور نہ وفاداری۔ لیکن یہ بات در اصل قابل افسوس نہیں ہے۔ رفیقانہ تعلق جب کسی فطری محبت پر مبنی نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ نہایت آسانی سے تلخ انجام صورتیں اختیار کرلیتا ہے۔ اس حالت کو ایک بہتر صورت پر لانیکے لئے صرف یہی طریقہ ہوسکتا ہے کہ ان تعلقات کو راستبازانہ معاہدات پر قائم کیا جائے اور جہانتک معاملات کا تعلق ہے کسی قسم کے دوسرے تعلقات کو اسکے ساتھ آمیز نہ کیا جائے۔ اس طرح صاحب معاملہ آدمیوں کے تعلقات کاروباری حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتے، نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیجا توقعات قائم کرسکتے ہیں اور نہ ایسی توقعات کو صدمہ پہنچنے سے ان میں کشیدگی پیدا ہوسکتی ہے۔ معاملات کو صحیح اصولوں پر چلانیکے لئے صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے بدنظمی، ناانصافی اور بدمعاملگی کا سد باب ہوسکتا ہے رہا یہ معاملہ کہ خادم و مخدوم، آڑھتیہ اور ایجنٹ، اور چھوٹے بڑے تاجروں کے ذاتی تعلقات کن بنیادوں پر ہونے چاہئیں تو اسکے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ ان میں بھی رفق و محبت کو دخل نہ ہونا چاہیئے کیونکہ انکی وجہ سے انکے معاملاتی تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے، انہیں صرف ہموطنی، ہم پیشگی اور عام انسانی ہمدردی پر قائم ہونا چاہیئے تاکہ ایک دوسرے کی معاونت، دستگیری اور ہمدردی کی طرف مائل رہے مقصد در اصل یہ ہونا چاہیئے کہ بالادستی و زیردستی کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کیجائے، اور انکو ایسے اصولوں پر قائم کیا جائے کہ نہ تو ان سے معاملات کو کوئی نقصان پہنچے اور نہ کاروباری آدمیوں کے باہمی تعلقات میں کوئی کشیدگی ہو۔

اخلاقی کاروبار کے اس حصہ سے کوئی بحث نہیں جو اشیائے تجارت کی مانگ، اسکے تغیر و تبدلا

اور تجارتی معاملات کے اتار چڑھاؤ سے متعلق ہے۔ کیونکہ وہ موضوع اخلاق سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا البتہ اس حیثیت سے کہ مانگ کی کمی و بیشی جماعت کے مذاق و عادات کے تغیر و تبدل کا نتیجہ ہوتی ہے، اخلاق یہ دیکھ سکتا ہے کہ جن چیزوں کی مانگ بازار میں بڑھ رہی ہے وہ جماعت کی اخلاقی حالت کے کس پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر بازار میں اسباب طباعت اور لکھنے پڑھنے کی چیزوں کا زیادہ زور ہے تو خیال کیا جاتا ہے کہ جماعت کا میلان علم کی طرف زیادہ ہے۔ اور اگر اسباب زینت و آرائش کی بکری زیادہ ہے تو فوراً ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جماعت کا میلان عیش و عشرت کی جانب ہے اسی طرح وہ یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ جن پیشوں سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ حیات انسانی کے لئے مضر تو نہیں ہیں پس اس نقطۂ نظر سے تمام لوازم تمدن سے بحث کیجاتی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو چیزیں اخلاقی حیثیت سے جماعت کی زندگی پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالتیں، اور جن کے تیار کرنیوالوں کو جسمانی حیثیت سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا انکا کاروبار درست ہے اور جنکا حال اسکے برعکس ہے وہ ناجائز ہیں۔

اس مسئلہ پر علمائے اخلاقیات میں بہت دلچسپ اور مفید بحثیں ہُوئی ہیں خصوصاً اسباب عیش و تنعم کے متعلق بسکنٹ کی مسیحی تمدن، بیکن کی Ethics of citizenship اور اسٹیفن کی Social Rights Duties. میں بہت کچھ لکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو میں اخلاق اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اجتماعی فوائد کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور افراد کے تمام اعمال اجتماعی ترقی کے لئے ہوں دوسرے الفاظ میں وہ آخری معیار جس پر علم الاخلاق تمام معاملات، اور تمدنی کیفیات کو جانچتا ہے، محض اجتماعی مفاد ہے۔ مگر ایک عرصہ سے انفرادی اغراض کے تغلب نے اس اجتماعی مفاد کو اپنا تابع بنا رکھا ہے، اور جماعتوں کے مصالح کو قوی افراد اپنے ذاتی مصالح پر قربان کرتے رہے ہیں۔ جماعتیں اب اس انفرادی غلبہ سے بیزار ہوگئی ہیں اور ان میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہورہا ہے کہ دنیا سے انفرادیت کو مٹا کر اشتراکیت کا اصول رائج کریں جسکا منشأ یہ ہے کہ ہر چیز جماعت کی ہو، افراد کی تمام کوششیں اور ساری قوتیں محض جماعت کی ترقی و فلاح کیلئے ہوں، اور تمام انفرادی مصالح اجتماعی مصالح میں جذب ہو جائیں۔ اس تحریک کی حمایت خصوصیت کے ساتھ وہ جماعتیں کر رہی ہیں جو انفرادیت و استبدادیت سے بہت زیادہ دُکھ پا چکی ہیں اور خاص خاص افراد نے جنکے عادلانہ نظام کو بالکل درہم و برہم کر کے تمام ذرائع ترقی پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ جماعت

کے بقیہ افراد کے لئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس تحریک میں غصہ اور جوش کی اجزا بھی کافی مقدار میں شامل ہیں اس لئے وہ انتہائی اجتماعیت پر زور دینے میں عدل سے ہٹ گئے ہیں، مگر اخلاقی حیثیت سے انکے یہ مقاصد بہت اچھے ہیں کہ ادنیٰ پیشوں کو معزز بنایا جاوے، ہنرمندیاں قابل وقعت ہوں، اعلیٰ پیشوں پر سے پابندیاں ہٹا دی جائیں، جماعت کا ہر فرد اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے، اور جماعت کے ہر فرد کو اپنی محنتوں کے پورے پورے ثمرات سے متمتع ہونیکا حق حاصل ہو۔ اگر یہ تحریک اعتدالی صورت اختیار کرلے تو وہ بہت سے اخلاقی فوائد پیدا کریگی۔

ان مباحث کی تفصیلات کے لئے یا حسن نظام اخلاقیات، سجوک کی Principles political سے اور گرین کے سیاسی لکچر دیکھو۔

## ۷۔ عناصر ترقی

گذشتہ صفحات میں ہم نے جگہ جگہ اس امر کا ذکر کیا ہے کہ اخلاقی زندگی ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ بات زیادہ صاف اور واضح بحث کی محتاج ہے۔ اگرچہ ہمیں اس خیال میں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ خواہ کتنا ہی شک کرنے کو جی چاہتا ہو، مگر اسکی صداقت کسی نہ کسی طرح عام طور پر تسلیم کیجاتی ہے۔ دنیا کی ترقی کا خیال تمامتر دور حاضر کی پیداوار، اور عہد فطرت کے انسانی خیالات سے کسی قدر مختلف شئے ہے اب یہ ایک مسلمہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ بنی نوع انسان کی عمر جتنی جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے، اسکے تجربات، اور اسکی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے اور اسکے ساتھ ہی اسکا نصب العین بلندتر اور اسکے ذرائع حصول وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم یہ دلفریب مایوسی ابتک ہم میں موجود ہے کہ موجودہ نسل اپنے اسلاف کی تنزل پذیر یادگار ہے، اور ہماری ماضی پرست فطرت کے لئے گذشتہ عہد زریں کا خیال جبکہ انسان موجودہ عیش پرستوں اور حماقتوں سے پاک تھا، اپنے اندر قدرتی کشش رکھتا ہے۔ اور اگر اس پرانے عقیدہ پر ہم غور کرتے ہیں تو ایک حد تک وہ درست بھی نکلتا ہے، کیونکہ جب نئے حالات اپنے ساتھ نئے فرائض لاتے ہیں تو ساتھ ہی شر کے نئے مواقع بھی پیدا کرتے ہیں۔ آجکل کے تاجرانہ اخلاق سے دور گذشتہ کے دوستانہ اخلاق کا موازنہ کرو تو تمہیں یہ فیصلہ کرنے میں سخت زحمت پیش آئیگی کہ ہم درحقیقت تنزل کر رہے ہیں یا ترقی۔ اگر ایک طرف بعض حیثیات سے ہمارے فعال

زیادہ منظم، معقول اور وسیع اصول پر مبنی معلوم ہوتے ہیں تو دوسری طرف بعض حیثیات سے یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہم اگلے لوگوں سے نسبتاً زیادہ خود غرض اور بد دیانت ہو گئے ہیں۔ لیکن اگر ہم کو اپنی ترقی کا کبھی یقین ہوتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ افراد کے افعال سے قطع نظر کر کے ہم اخلاق کے ان اعلیٰ اصولوں اور نصب العینوں پر نظر کریں جو ہمارے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور پھر افراد کے متعلق بھی جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یاد کرنا پڑتا ہے کہ انفرادی زندگی میں بھی بہرحال ترقی ہوئی ہے، کیونکہ جب اصولوں اور نصب العینوں میں ترقی ہوئی ہے تو لازماً افراد کی اخلاقی حالت میں بھی ہونی چاہیئے جنکے بغیر ان اصولوں کا قیام مشکل ہے۔

**ترقی کا ثبوت** موجودہ نظام زندگی میں ہم جس چیز کو تنزل کی علامت سمجھتے ہیں وہ دراصل ہماری ترقی کے یقین کو قوی کرنے والی شئے ہے۔ رسکن کہتا ہے کہ "گھانس ہر سال ہری ہو جاتی ہے مگر آفت آتی ہے تو صرف گیہوں پر۔ اس لئے کہ اسکی فطرت اعلیٰ ہے" کارلائل نے اس سے زیادہ خوبصورت الفاظ میں اس مطلب کو ادا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "انسان کی اضافی شقاوت اسکی فطری سعادت و بزرگی کا نتیجہ ہے" امرسن کا بھی ایک مشہور مقولہ اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ "ہماری کمزوری و کوتاہی کا اثبات دراصل ہماری روح کی برتری کا ایک لطیف کنایہ ہے" ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسان کی فطرت کو جس زوال کے خطرہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ اسکے علو فطرت کی بدولت ہے۔ حیوان کو یہ بات نصیب نہیں انسان ہیں گناہ کرنے اور گناہ سوچنے کی جو قوت ہے، اگرچہ اسے ذی الطبع بناتی اور اسکے درجۂ شرافت سے گرا دیتی ہے، مگر اسکی یہ ذلت بھی حیوان کو میسر نہیں۔ میں کسی کی عزت و شہرت، جاہ و منصب کی ترقی اور ہر دلعزیزی پر رشک کرتا ہوں تو یہ جذبات خواہ میری دنائت کا ثبوت ہوں مگر میرے ذی شعور ہونے کی صریح علامت ہیں۔ گرین نے اس قسم کے اخلاقی گناہوں کا حوالہ دینے میں سخت غلطی کی ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ نہیں ہے کہ وہ برائی کے نئے اصناف اپنے اندر رکھتا ہے، بلکہ دراصل اسکی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعور رکھتا ہے اور اگر برائی ہیں مبتلا بھی ہوتا ہے تو شعور کے ساتھ

---

ابوالاعلیٰ

# مصر کے آثارِ قدیمہ

## فرعون توتنخ امین کا مقبرہ

ذیل کا مضمون فرعون امین کے مقبرے کی صرف ان کھدائیوں سے تعلق رکھتا ہے جو ۱۹۲۲ء کے موسم سرما میں عمل میں آئیں۔ ۱۹۲۳ء میں مزید حفریات کے بعد۔ اور بہت سے جدید اور اہم انکشافات ہوئے ہیں۔ جن میں شاہ امین کے سنگین۔ سنہری تابوت کا بحالتِ محفوظ دستیاب ہونا بھی شامل ہے۔ تابوت ابھی تک کھولا نہیں گیا۔ مگر یہ دلچسپ بیان۔ بجائے خود ایک الگ مضمون ہے۔ اور انشاء اللہ عنقریب ہدیہ ناظرین ہوگا۔ حفیظ الدین

مصر قدیم الایام سے تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور صنعت و حرفت کا مرکز رہا ہے۔ دنیائے قدیم کی تاریخ میں صرف یہی ایک ملک ہے۔ جہاں اول اول کسی باقاعدہ سلطنت کے قیام اور سیاسی مجلس کے انعقاد کا نشان ملتا ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جس وقت زمانہ حال کی نہایت متمدن اقوام بالکل ابتدائی حالت میں وحشیانہ زندگی بسر کر رہی تھیں اور تہذیب کے نام تک سے واقف نہ ہوئی تھیں۔ اس تہذیب و تمدن کی ابتدا تو خدا جانے کب ہوئی تھی۔ مگر اس کی قدامت کا تھوڑا سا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ کہ جب ولادتِ مسیح سے بیس صدی قبل حضرت ابراہیم مصر تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں ایک خوشحال اور پھلتی پھولتی سلطنت قائم دیکھی۔

اس اعلیٰ ترقی کا راز مصری زمین کی زرخیزی و شادابی۔ قدرتی ذرائع کی کثرت۔ اشیاء خوردنی کی بہتات اور ان کی ارزانی میں مضمر تھا۔ اور یہ وہ اسباب تھے۔ جنہوں نے مصر کو شروع ہی سے ایک کثیر آبادی کا اولین مرکز بنا دیا۔ اشیاء خوردنی کی اس افراط اور آبادی کی کثرت نے مزدور پیشہ لوگ بھی وہاں بکثرت پیدا کر دئے تھے۔ جو ہر وقت نہایت کم اجرت پر مل سکتے تھے۔ چنانچہ اہرام مصر جیسی سربفلک اور مستحکم عمارات کی تعمیر کا یہی راز ہے۔ یہ مینار قدیم مصری تہذیب و تمدن کی ایک زندہ مثال ہیں۔ الغرض جہاں اشیاء خوردنی کی طرف سے یہ فارغ البالی اور فراغت نصیب ہو اور مزدوری

ایسی اشیاء دستیاب ہو سکتی ہو۔ کوئی تعجب کا مقام نہیں اگر وہاں تہذیب اپنے معراج کمال پر پہنچ جائے۔

قدیم مصری تمدن کی کیا شان تھی؟ اُسکا اندازہ اُس ساز و سامان سے لگایا جا سکتا ہے جو حال ہی میں وادی الملوک۔ واقع لکسر (مصر) میں فرعون توتنخ ایمن کے مقبرے کی دریافت کے سلسلہ میں ملا ہے۔ یہ چیزیں آج سے تین ہزار تین سو سال قبل قرینے سے چن چن کر اس مقبرے میں رکھدی گئی تھیں۔ اور اُس کے دروازوں کو سربمہر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس طول طویل عرصہ کے گذر جانے پر بھی وہ دروازے آج اسی طرح سربمہر پائے گئے اور اندر کی اکثر اشیاء بجنسہ نہایت اچھی حالت میں برآمد ہوئیں

ان اشیاء کا بالتفصیل ذکر کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مجمل سا حال وادی الملوک اور فرعون ایمن کا بیان کر دیا جائے۔ تاکہ ناظرین برآمد شدہ اشیاء کی قدامت اور اُنکی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ علاوہ ازیں اس طریق کار اور سلسلہ واقعات کی مختصر سی کیفیت بھی بتا دینی لازمی ہے جو اس مقبرے کی دریافت کا باعث ہوا۔

وادی الملوک | وادی الملوک وہ حصہ ملک ہے جو اُن بنجر چٹانوں اور پہاڑیوں کے پس پشت واقع ہے۔ جو دریائے نیل کی زرخیز وادی کے لئے مغربی اور حدودی دیواروں کا کام دیتی ہیں۔ یہ وادی لکسر سے بالکل قریب۔ قاہرہ سے ۴۵۰ میل کے فاصلے پر دریائے نیل کے چڑھاؤ کی طرف واقع ہے۔ لکسر اُس جگہ واقع ہے جہاں قدیم زمانے میں کبھی فراعنہ مصر کا دارالسلطنت تھیبس Thebes آباد تھا۔ اس وادی کی بنجر اور جھلسی ہوئی چٹانوں میں، اٹھارھویں خاندان (قبل مسیح ۱۳۰۰ ——— ۱۵۵۰ قبل مسیح) کے اکثر فراعنہ مصر کے مقابر دبے پڑے ہیں۔ یہ مقبرے اینٹوں یا پتھروں کی چنائی کے نہیں بلکہ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ اس استحکام اور احتیاط کی غرض و غایت۔ ایک حد تک ان مقابر کو پوشیدہ رکھنا تھا۔

قدیم مصریوں کے عقائد | بات یہ ہے کہ فراعنہ مصر اگرچہ اکثر ملحد تھے۔ مگر اُن کا یہ اعتقاد ضرور تھا۔ کہ مرنے کے بعد اُنہیں دوسری دُنیا میں جانا ہے، یا کم از کم یہ کہ موت کے کچھ عرصہ بعد روح دوبارہ جسم میں آجاتی ہے اور انسان از سرِ نو زندہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اسے اُن سب چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دنیا میں زندگی کے لئے ضروری اور آرام و آسائش کے لئے لازمی ہیں۔ چنانچہ یہ عام

دستور ہوگیا تھا کہ جب کوئی فرعون مرتا تو اُسکے استعمال کی تمام چیزیں اُسکے ساتھ دفن کر دیتے۔ دیگر اشیاء کے علاوہ سامانِ خورد و نوش بھی مصالح لگا کر اور ڈبوں میں بند کرکے وہاں رکھدیا جاتا تھا۔ یہی اعتقاد تھا جس کے باعث اُس زمانے کے لوگ مُردے کی نعش کو نہ تو دباتے ہی تھے اور نہ دفن ہی کرتے تھے۔ بلکہ مختلف قسم کے مصالح لگا کر اُنہیں گلنے سڑنے سے بچاتے تھے۔ یہ مصالح ایسے عجیب تھے کہ آج قرنوں گذرنے کے بعد بھی فراعنہ مصر کی نعشیں اپنی اصلی حالت میں برآمد ہو رہی ہیں اور وہ کھانے جو انکے پاس رکھدئے جاتے تھے، جوں کے توں اچھی حالت میں موجود ہیں۔ الغرض جن قبروں کی یہ شان و شوکت ہو اور جہاں اِس قسم کی بیش بہا اور نادر اشیاء مدفون کیجائیں۔ انہیں یقیناً چوروں اور رہزنوں کے لئے خاص ترغیبات کا موجب ہونا چاہیئے۔ یہی باعث تھا کہ ان مقابر کو نہایت خفیہ مقامات پر بنایا جاتا تھا تاکہ لوگوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔

توتنخ امین کون شخص تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ زمانہ قدیم کے کن کن اہم واقعات سے اُسکو واسطہ پڑا؟ اور اُس زمانے کے کن کن جلیل القدر اشخاص سے اسکا براہ راست تعلق رہا؟ یہ وہ سوالات ہیں جنہیں آج ہر شخص دریافت کرنیکا متمنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم شاہان مصر کے متعلق فرداً فرداً تو ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ البتہ قدیم تواریخ میں "خاندانوں" کا بحیثیت مجموعی ذکر آتا ہے۔ مضمونِ زیر بحث کی اغراض کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ ۴۴۰۰ء قبل مسیح سے لیکر ۳۴۰ء ق۔م تک ۳۰ خاندانوں نے مصر پر حکومت کی اور شاہ امین کا تعلق ان میں سے اٹھارھویں خاندان کے ساتھ تھا۔ جسکا عہد حکومت مورخین نے ۱۵۵۰ء ق۔م اور ۱۳۰۰ء ق۔م کے مابین قرار دیا ہے۔ اور یہی وہ عہد تھا جس میں مصریوں کی تہذیب منتہائے ترقی تک پہنچ گئی تھی۔

**کیا فرعون امین بنی اسرائیل والا فرعون تھا؟**

اس سوال پر کہ کیا توتنخ امین وہی فرعون تھا جس نے بنی اسرائیل کے ساتھ جبر و تشدد کیا۔ اور انہیں مصر سے نکلنے پر مجبور کیا؟ کافی بحث مباحثہ ہوچکا ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شاہ امین۔ اخراج بنی اسرائیل سے پہلے فوت ہوچکا تھا۔ اس خیال کے موید اس واقعہ کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کہ بنی اسرائیل نے روانگی سے قبل اہل مصر کو خوب لوٹا اور اُنکی تمام مال و دولت پر قبضہ کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بنی اسرائیل کا دشمن فرعون

اپنے لاؤ لشکر اور ساز و سامان سمیت بحیرہ قلزم میں غرق ہو چکا تھا۔ اور کہ غرق ہونے کے وقت اُسکے ساتھ چھ سو چیدہ رتھیں۔ مصر کی تمام رتھیں۔ سوار کپتان اور پیادے تھے۔ پھر اُسکی نعش اور رتھیں اس مقبرے میں آئیں تو کہاں سے آئیں ؟

کیا شاہ ایمن ہندی الاصل تھا؟ اس ضمن میں مسٹر کدار ناتھ۔ وکیل گیا (بہار) کے اُس طول طویل آرٹیکل کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جس میں چند الفاظی مماثلت کی بنا پر انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ توتنخ ایمن دراصل ہندی نژاد تھا۔ اور کہ اُسکا اصلی نام "توڈن کھیم" تھا۔ اُنکا خیال ہے کہ قدیم زمانے میں ملک مصر اور قدیم ہندوستان میں بہت تعلقات تھے اور مصر اُس زمانے میں "مبصر" برہمنوں کی ایک نو آبادی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کیجاتی ہے کہ یہ برہمن اول اول سنگلدیپ (موجودہ لنکا) میں آباد تھے جو اُس زمانے میں اس قدر وسیع تھا کہ ایک براعظم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس براعظم کو اجودھیا کے مشہور راجہ رامچندر جی نے فتح کر کے اپنا مطیع و منقاد کر لیا۔ اور اُسے ہندی تہذیب و تمدن سے بہرہ اندوز کیا۔ جب وہ براعظم تہ آب ہوا۔ تو اُسکے بہت سے باشندے تو غرق ہو گئے اور جو بچے وہ ملحقہ ممالک کی طرف بھاگ گئے۔ چنانچہ اُنکا ایک حصہ شمال ہند میں آیا۔ جنکی اولاد آجتک وہاں "مصر" کے نام سے مشہور ہے۔ اور ایک حصہ مشرق کی طرف چلا گیا۔ اور اُدھر بہت سا ملک فتح کر کے اُسکا نام اپنے نام پر "مصر" رکھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرعون اخناتن توتنخ ایمن شاہی نسل سے نہ تھا۔ بلکہ شاہ اخناتن کے دربار میں ایک معمولی امیر اور درباری کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اُسکی شادی بادشاہ کی بیٹی سے ہوگئی۔ اور اس استحقاق سے وہ شاہ اخناتن کی وفات پر ۱۳۵۰ء ق۔م کے قریب سریر آرائے سلطنت ہوا۔ شاہ اخناتن جس نے ۱۳۸۳-۱۳۵۰ء ق۔م تک حکومت کی۔ قدیم مصر کی تاریخ میں نہایت اہم اور اعلیٰ شخصیت رکھتا تھا۔ اور مورخین اُسکا نام بڑی عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا شخص تھا جس نے ملحدانہ اعتقادات کو خیر باد کہہ کر ایک نئے مذہب۔ یعنی آفتاب کی پرستش کی بنیاد ڈالی۔ یا بالفاظ دیگر اُس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دنیا محض وہم و گمان اور دھوکے کی ٹٹی ہے اور اُن بیشمار بتوں میں کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں جنکی پرستش کیجاتی ہے بلکہ قابل ستائش تو کوئی ایک ذات واحد ہی ہے۔ پس اُس نے قدیم زنجیروں کو توڑ ڈالا اور جداگانہ آزاد

اعتقاد بنا لئے۔ لہٰذا یہ کتنا بالکل صداقت لئے ہوئے ہے کہ اُس نے توحید کے اصلی مفہوم کو پاکر وحدانیت کی طرف پہلا قدم اُٹھایا۔ جو قدرتی مناظر اُسکے پیش نظر تھے۔ اُن میں اسے آفتاب سے زیادہ اور کوئی چیز شاندار معلوم نہ ہوئی۔ الحاد سے وہ بیزار ہو ہی چکا تھا۔ جنوں نے اُسے نفرت ہوگئی تھی۔ پس اسکے سوا اُسے کوئی اور چارہ کار نظر نہ آیا کہ آفتاب کی پرستش اختیار کرے۔ جسے وہ کسی سبب سے بڑی اور اہم ہستی کا مظہر سمجھتا تھا۔ اُسکے دماغ نے یہیں تک کام کیا۔ وہ موردِ الزام نہیں بلکہ اُس کا یہ فعل قابلِ داد ہے کہ بیشمار دیوتاؤں کی پرستش کو چھوڑ کر اس نے ایک واحد چیز کی عبادت شروع کردی۔ اس میں کلام نہیں کہ وحدانیت کے قائم کرنے کے لئے یہ پہلی کوشش تھی۔ نئے مذہب سے پہلے اس فرعون کا نام امینؔ ہوٹپ تھا۔ جس میں الحاد کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن آفتاب کی پرستش اختیار کرتے ہی اُس نے اپنا نام اخناتن یا شعاعِ آفتاب کی تجلی رکھ لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ نئے مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ اخناتن نے بت پرست شہر تھیبس کی سکونت بھی ترک کردی۔ اور قاہرہ سے ۱۰ا میل جانبِ شمال۔ ساحل نیل پر ایک نیا شہر آباد کرکے اقامت گزیں ہوا۔ اس شہر کے کھنڈرات۔ گذشتہ صدی میں شہر ایل۔ امرنا پر کھود کر نکالے گئے تھے۔

ملکہ نیفرتی تی | وہ حسین اور دلفریب عورت بھی کچھ کم شخصیت نہ رکھتی تھی جس کے ساتھ اخناتن کی شادی ہوئی۔ اس ملکہ کا ایک نصف مجسمہ۔ اہلِ جرمن نے جنگ عظیم سے صرف دو سال قبل ایل امرنا کے کھنڈرات سے نکالا تھا۔ یہ قبول صورت اور موہنی لڑکی ایک رئیس مسمی اے کی بیٹی تھی اور اخناتن ابھی عالم شہزادگی ہی میں تھا۔ کہ اس لڑکی سے اُسکی شادی ہوگئی۔ جب اخناتن تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو یہی لڑکی ملکہ نیفرتی تی کہلائی۔ اور نہ صرف پرلے درجے کی محبت کرنے والی بیوی ہی ثابت ہوئی۔ بلکہ اپنی سات بیٹیوں کے حق میں اُس نے نہایت مشفق اور مہربان ماں ہونیکا بھی ثبوت دیا۔ اُس نے اخناتن کا نیا مذہب بھی اختیار کرلیا۔ اور اُس کی اشاعت میں اپنے خاوند کے پہلو بہ پہلو کوشش کرتی رہی۔ اخناتن کے نئے اور مقدس شہر میں اُس نے لب دریا ایک عبادتگاہ بنوائی۔ جہاں تبلیغ و اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا رہا۔ مجسمہ پر ایک سرسری نظر کافی ہے نہ صرف اسکا دلفریب حسن ہی آپ سے خراجِ تحسین مانگیگا۔ بلکہ آپکو معلوم ہوگا۔ کہ اُس عورت

---

سلہ امین۔ قدیم مصری بتوں میں سب سے بڑا بت تھا۔

ہیں بلا کا تحمل اور غضب کی متانت ہے۔ مزید براں شاہانہ رعب داب نے سونے پر سوہاگہ کا کام کیا ہے۔ الغرض ؎

زفرق تابقدم ہر کجا کہ مے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

توتنخ ایمن | پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ شاہ ایمن کو مصر کا تاج و تخت اخناتن کے داماد ہونیکے استحقاق سے ملا تھا۔ اس بادشاہ کا عہد حکومت (ق۔م ۱۳۵۸ - ۱۳۷۵) بہت مختصر تھا اور وہ عالم جوانی ہی میں فوت ہوگیا۔ اُسکی شہرت کا باعث اُسکے عہد کے دو بڑے واقعات ہیں۔ اول تو اُس نے فوجی طاقت کی تجدید کی جو اُسکے خُسر کے زمانے میں مذہبی اشغال میں انہماک کی وجہ سے کمزور پڑگئی تھی اور اس طرح سلطنت میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ دوسرا کام اُس نے وہ کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا یعنی اُس نے اپنے خُسر کے مذہب کو چھوڑ کر از سرِ نو الحاد کو رواج دیدیا اور اس طرح اُس مذہبی اور وحدانی تحریک کا خاتمہ ہوگیا جس کو اُس نے خُسر کے بڑی محنت سے قائم کیا تھا۔ اور جسے اس قسم کی اولین تحریک ہونیکا شرف حاصل تھا۔ الحاد کی تجدید کے ساتھ ہی اس بادشاہ کو بھی نام تبدیل کرنیکی ضرورت پیش آئی۔ اُسکا اصلی نام توتنخ ایٹن[1] (یا آفتاب کی زندہ تصویر) تھا لیکن ملحد ہوتے ہی اُس نے اپنا نام توتنخ ایمن[2] (یا ایمن کی زندہ تصویر) رکھ لیا۔ علاوہ ازیں اُس نے اپنا دارالسلطنت بھی ایل امرنا کی بجائے ملحد شہر تھیبس کو بنا لیا تھا۔

شاہِ ایمن کی ملکہ | یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہِ ایمن کے مقبرے کی دریافت سے چند ہی ہفتہ پیشتر پروفیسر سائس کو شاہِ ایمن کی بیوہ کی کچھ خطوط کہیں سے ہاتھ لگ گئے۔ جنکا ترجمہ انہوں نے رسالہ "اینشینٹ ایجپٹ"[3] میں شایع کرایا۔ یہ خط و کتابت نہایت دلچسپ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں شاہانِ ہٹائیٹ حملہ آور ہوتے ہوئے اینٹیوک Antioch کے میدان تک آپہنچے تھے۔ شاہِ ایمن کی وفات کے بعد اُسکی بیوہ نے ہٹائیٹ بادشاہ کو ایک پیغام بھیجا جس میں مذکور تھا۔ کہ اُسکے (یعنی بیوہ کے) کوئی اولاد نہیں اور درخواست کیگئی تھی کہ خاندانِ ہٹائیٹ[4] سے کوئی شہزادہ

---

[1] ایٹن۔ آفتاب کی ٹکیہ۔ [2] ایمن۔ قدیم مصری بتوں میں سب سے بڑا بت تھا۔

[3] Ancient Egypt (1922 - Part iii)

[4] یہ خاندان اناطولیہ میں حکمران تھا۔

اُس سے شادی کرنے کے لئے بھیجدیا جائے۔ مزید خط وکتابت ہوئی اور آخر ایک شہزادے سے اُس کی شادی ہوگئی۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاہ اخناتن کا کوئی اور داماد اُسوقت موجود نہ تھا جو تخت اور سلطنت کا وارث بنتا۔ لہٰذا اس شادی سے بیوہ کا مطلب یہ تھا کہ مصر کے تخت کو اغیار دا جانب کی دستبرد سے بچاکر وہ خود اُسکی ملکہ بنی رہے اور اپنی آزادی کو بھی قائم رکھ سکے یہ بات تھی بھی معقول۔ اس لئے کہ صرف وہی ایک عورت ایسی تھی جو تخت کی جائزوارث ہونے کے علاوہ ملک کی حالت کو بھی اچھی طرح سمجھتی تھی چال اچھی تھی مگر افسوس کہ کامیاب نہ ہوئی۔ اہل مصر نے اس شادی کو تسلیم نہ کرکے شاہ امین کے دور دراز کے رشتہ داروں میں سے یکے بعد دیگرے چند لوگوں کو تخت پر بٹھایا۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی کامیابی کے ساتھ تادیر حکومت کو قائم نہ رکھ سکا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک جرنیل حرم ہب نامی تخت پر متصرف ہوگیا۔ جس نے اپنے آپ کو سلطنت کا جائزوارث ثابت کرنے کی غرض سے شاہ اخناتن کی ملکہ نیفرتی ٹی کی چھوٹی بہن سے شادی کرلی۔ اس عورت سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُسکی عمر شادی کے وقت ۵۲ سال کی تھی۔ حرم ہب کے بعد سلطنت ایک اور فوجی خاندان کے قبضہ میں چلی گئی۔ ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خاندانِ ہٹائیٹ کا شہزادہ شادی کے بعد بیوہ کو جلا وطن کرکے خود سلطنت پر متصرف ہوگیا تھا۔

حاصل کلام یہ کہ شاہ امین ہی اپنے خاندان کا آخری اور جائز وارث سلطنت تھا اور اُسکے مقبرے میں بیشمار ساز وسامان کے اجتماع کا ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جو اُسکے بعد تاج وتخت کی مالک بنتی۔ اُس نے یہ ضروری سمجھا کہ قلعہ میں جو قیمتی اشیأ اُس سے تعلق رکھتی ہیں وہ سب اُسی کے ساتھ دفن کردی جائیں۔

**مقبرے کی برآمدگی** اس مقبرے کی دریافت کا سہرا لارڈ کارنارون اور مسٹر کارٹر کے سر ہے۔ ۲۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مسٹر کارٹر نے بالائی مصر میں آثارِ قدیمہ کی تحقیق وتفتیش کا کام شروع کیا تھا۔ اس اثنار میں وقتاً فوقتاً دلچسپ معلومات بہم پہنچتی رہیں۔ مگر کوئی ایسی اہم بات دریافت نہیں ہوئی۔ کہ آثارِ قدیمہ کی معلومات میں عظیم انقلاب پیدا کردے۔ گذشتہ سات سال سے وادی الملوک میں کھدائی کا کام ہورہا تھا۔ اس سے قبل بھی بہت لوگ وہاں کام کرچکے تھے اور مایوس ہوہوکر چلے گئے تھے۔ خود مسٹر کارٹر اور اُنکے رفقا بھی ایک حد تک کسی اہم کامیابی کی توقع اُٹھا چکے

تھے کہ شروع نومبر ۱۹۲۲ء میں شاہ امن کے مقبرے کی دریافت نے انکے بجھے ہوئے حوصلوں میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اور انہیں معلوم ہو گیا کہ انکی ۳۰ سالہ جانکاہ محنت اور جانفشانی رائگاں نہیں گئی۔ بلکہ جو معاوضہ انکو ملا۔ وہ توقع سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ تو امید تھی کہ یہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل رہیگا۔ مگر یہ بات کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ اس شان و شوکت کا کوئی مکان دستیاب ہوگا۔ جسکے چند در چند کمرے طلائی اور جواہراتی ساز و سامان اور دیگر نہایت بیش قیمت اشیاء سے پر معلوم ہونگے۔

آہ! کیا عبرتناک اور سبق آموز نظارہ ہے۔ شاہ امن کے ماتم کرنے والے رخصت ہو چکے ہیں۔ نعش کے آس پاس وہ سب چیزیں رکھدی گئی ہیں۔ جنکی دوسری دنیا میں اسے ضرورت پیش آسکتی ہے۔ خوراک وہاں ہے۔ رتھیں اور زرہ بکتر بھی ہیں۔ اسکے پہننے کے کپڑے اور ہتھیار بھی موجود ہیں۔ وہ کھلونے بھی وہاں رکھے ہیں جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ پے پیرس[۱] پر وہ تحریریں بھی موجود ہیں جنہیں وہ زمانۂ طالب علمی میں پڑھا کرتا تھا۔ وہیں ان شیروں کی کھالیں بھی ہیں جن کو عالم شباب میں اس نے شکار کیا تھا۔ بلیوں اور مقدس چڑیوں کی مورتیں بھی دھری ہیں۔ تاکہ انکے اعتقاد کے مطابق ملک عدم کے اس مسافر کو آفات ناگہانی سے بچائیں مزید براں گویا گھر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسکے قریب ہی اسکی بیوی کا ایک مجسمہ بچوں کی چھوٹی چھوٹی مورتیں اور چند دیوتاؤں کی تصویریں بھی رکھی ہیں۔ اب باقی کیا رہا۔ معماروں نے سوراخوں اور روزنوں کو بند کر دیا ہے اور چٹانوں پر قدیم مصری رسم الخط میں جو یادداشتیں لکھدی گئی ہیں۔ انکو اپنی نہایتوں سے پختہ کر دیا ہے۔ کمروں کو سربمہر کیا جا چکا ہے۔ اور مذہبی پیشوا ان لوگوں کے حق میں بری سے بری بددعائیں دے چکے ہیں۔ جو اس خاموش مقام کے مہر سکوت کو توڑنے کی جرأت کرے۔ الغرض ایک طرف تو خانہ داری کی کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جس کی گھروں میں ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور دوسری طرف مقبرہ کی حفاظت اور صیانت کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جا چکی ہے۔ اسی حالت میں اس واقعہ کو ۳۰ صدیاں گذر گئیں۔ ان مذہبی پیشواؤں اور درباریوں

---

[۱] پے پیرس (Papyrus) قدیم زمانے میں ایک قسم کا موٹا گھاس ہوتا تھا۔ جو دریاؤں اور دلدلی مقامات پر اگتا تھا۔ اس گھاس کے اندرونی گودے سے اہل مصر کاغذ بنایا کرتے تھے۔ یہ گھاس اب دستیاب نہیں ہوتا۔

کو جنہوں نے اپنے ہاتھوں شاہِ ایمن کی نعش اُس وادی کے ایک کونے میں رکھی ہوگی اور اسباب اُن کمروں میں چُنا ہوگا۔ اس امر کا گمان بھی نہ تھا۔ کہ ساڑھے تین ہزار سال کے بعد اُن اجنبی ممالک سے لوگ آئینگے جنکو اس وقت مصر میں شاید کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اُنکی سربمہر اور پوشیدہ اشیاء کو کھود کھود کر نکالینگے۔ اور اُنکی صنعت کی ہر تفصیل کو حیرت اور استعجاب کی نظر سے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائینگے۔

اگر کسی شخص میں تخیل کا کچھ بھی مادہ ہے تو ان عبرت خیز واقعات سے اُسکے دل و دماغ میں مختلف جذبات کا ایک طوفان جوش مارنے لگیگا۔ کمرے کے دونوں پہلوؤں پر آبنوس کی بنی ہوئی بادشاہ کی دو تصویریں کھڑی ہیں۔ پاؤں میں سلیپر ہیں جن پر سنہری کارچوبی کام ہو رہا ہے۔ ہاتھ میں عصائے شاہی اور علم ہے۔ لیکن چہروں پر افسردگی سی چھائی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانی صحبتوں کے سربستہ راز اور ٹوٹی ہوئی امیدوں کی یاد اُنکے دماغ میں چکر لگا رہی ہے۔ الغرض اس مقبرے میں قدیم گم شدہ تہذیب ہمارے موجودہ اور بے چین تمدن سے ملتی ہے۔ اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری تہذیب تو اُس قدیم تہذیب کے مقابلے میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

**شاہِ ایمن کے زندہ ورثا** لیکن جہاں اربابِ بصیرت ان واقعات سے سبق حاصل کرتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہیں مذاق اور دل لگی سوجھتی ہے۔ چنانچہ مصر میں ایک صاحب ڈاکٹر اتھاناسیس نامی رہتے ہیں۔ جنہوں نے دعوے کیا ہے کہ اُنکے قبضہ میں ایسی دستاویز اور شجرہ نسب ہے جنکے ذریعے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتی ہے کہ اُسے شاہِ ایمن کی نسل سے براہ راست واسطہ ہے۔ اور اس طرح اُسکے تمام مال و اسباب کا جو مقبرے سے برآمد ہوا۔ وہی جائز وارث ہے۔

امریکہ مصر سے ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ وہاں مسٹر روک فیلر[1] کی ایک صاحبزادی مسز ایڈتھ مک کارمک نے دعوے کیا ہے۔ کہ وہ توتنخ ایمن کی بیوی ہے اُسے خوب یاد ہے۔ کہ اُسکی عمر سولہ سال کی تھی جب اُسکی شادی شاہِ ایمن سے ہوئی۔ وہ یہ بھی جانتی ہے۔ کہ وہ اسکی پہلی بیوی تھی۔ جونہی اُس نے اخبارات میں بادشاہ کے اُس تخت کی تصویر کو دیکھا۔ جو مقبرے کے ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ اُس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ تو وہی تخت ہے جس پر وہ اور شاہِ ایمن۔ درباروں تقریبوں پر اجلاس کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اپنے بیان کی تصدیق میں وہ یہ بھی کہتی ہے کہ بالوں کا جو گچھا مقبرے سے برآمد ہوا ہے۔ وہ

---

[1] روک فیلر۔ امریکہ کا رہنے والا اور دنیا کا تیسرا مالدار شخص شمار ہوتا ہے۔

اُسکی سوکن۔یعنی شاہِ ایمن کی دوسری بیوی کا ہے۔

مسز مک کارنک کا قصہ ادھورا ہی رہ جائیگا۔اگر ایک شخص پرسٹن گبسن کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو اس امر کا دعویدار ہے۔کہ وہ خود شاہِ توتنخ ایمن ہے۔اُسکا بیان ہے کہ اُسے اپنے عہد حکومت کے واقعات خوب اچھی طرح یاد ہیں اور یہ بات بھی اُسے فراموش نہیں ہوئی۔کہ وہ اور مسز مک کارنک دونوں تخت پر بیٹھتے اور مصر پر حکومت کیا کرتے تھے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار!

خیر گذشتہ ناکامیوں کے بعد لارڈ کارنارون تو واپس انگلستان تشریف لیگئے۔لیکن مسٹر کارٹر اس خیال پر جمے رہے کہ اگر کچھ حاصل ہوگا تو وادی الملوک ہی سے حاصل ہوگا۔اُنکی اور لارڈ کارنارون کی اس موضوع پر خط وکتابت ہوتی رہی اور اکتوبر ۱۹۲۲ء میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خدا کا نام لیکر وادی الملوک میں حفریات کا سلسلہ شروع کردیا جائے۔تاکہ اُدھر سے پورا اطمینان ہوجائے۔اس فیصلہ کے بعد یکم نومبر سے کام جاری ہوگیا۔مسٹر کارٹر کو کام شروع کئے تین ہی دن ہوئے تھے۔کہ مقبرے کا پہلا زینہ برآمد ہوگیا۔اُس نے ۷ نومبر کو بذریعہ تار لارڈ کارنارون کو اطلاع دی۔اب لارڈ موصوف کو تاب کہاں تھی فوراً لکسر آپہنچے۔زینے کی اٹھارہ سیڑھیاں تھیں۔سب سے پہلے انہیں صاف کیا گیا۔اس دوران میں بہت سی ٹوٹی ہوئی چیزیں۔مثلاً مٹی کے برتن اور لکڑی کے شکستہ پھول وغیرہ دستیاب ہوئے۔زینے کے انجام پر ایک دیوار معہ دو دروازوں کے تھی۔جس پر بہت سی مہریں لگی ہوئی تھیں۔بعض توتنخ ایمن کی ذاتی مہریں تھیں۔اور بعض سرکاری۔اس دیوار کو علیحدہ کرنے میں ایک دن لگ گیا۔اس سے آگے

برآمدہ | ۲۹ فٹ طویل ایک مسقف برآمدہ پایا۔جو سطح زمین سے چھت تک پتھروں اور ملبہ سے اٹا ہوا تھا۔دو دن برآمدے کے صاف کرنے میں لگ گئے اس ملبہ میں سے بھی مٹی کے شکستہ برتن ٹوٹے ہوئے زیورات اور شکیں۔پھول وغیرہ ہاتھ آئے۔انکے علاوہ ایک صندوق بھی ملا جس پر خاتن ایمن اور اُسکی بیوی کا نام کندہ تھا۔اب برآمدہ بالکل صاف ہوچکا تھا۔اور اُسکے انجام پر ایک دوسرا سربمہر

کمرۂ اول | دروازہ نظر آنے لگا۔یہ مقبرے کا پہلا کمرہ تھا۔اس دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ کیا گیا اور جب بتی کی دھندلی روشنی کے ذریعے اُس میں نگاہ کی گئی تو ایک متحیر کرنے والا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا کمرہ۔سنہری پلنگوں۔صندوقوں۔اور دیگر بیشمار ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا اس شان وشوکت کو دیکھ کر اُن پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔اب انتظار کی محنت کون اُٹھاتا۔

فوراً اُس سُوراخ کو زیادہ وسیع کیا گیا اور برقی روشنی بہم پہنچا کر لارڈ کارنارون اور مسٹر کارٹر اُس میں داخل ہُوئے۔

شاہی پلنگ | پہلی چیز جس نے اُنکی توجہ کو اپنی طرف منعطف کیا۔ وہ تین بڑے بڑے تخت یا شاہی پلنگ تھے جو دروازے کے مقابل والی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔ یہ تخت نما پلنگ لکڑی کے ہیں۔ مگر سونے کے پترو ں سے ڈھنپے ہُوئے ہیں۔ اور اُس پر مرصع کام ہے۔ ایک پلنگ کے سرہانے پر شیر کی شکل کے مجسمے ہیں اور ایک پر کسی اور جانور کے جوگائے سے مشابہ ہے۔ ان جانوروں پر بھی سونے کے خول چڑھے ہیں۔ پلنگوں کی سطح بھی تمام سنہری ہے۔ اور اتنی فراخ ہے کہ دو شخص بآرام تمام اُن پر بیٹھ سکیں۔ یہ غالباً اس مطلب کے لئے تھے۔ کہ بادشاہ اور بادشاہ بیگم دونوں اُن پر بیٹھ کر اہل دربار کو باریابی کا موقعہ دے سکیں۔ چونکہ شاہ آیمن اپنی شادی کے استحقاق سے ملک پر حکومت کرتا تھا۔ اس لئے ملکہ کا ہر ایسے موقعہ پر موجود ہونا ازبس ضروری تھا۔ پلنگ باوجود تینتیس صدیاں گذر جانے کے ایسے روشن اور چمکدار ہیں کہ گویا ابھی بنے ہیں۔ اُنکی اونچائی پانچ فٹ کے قریب ہے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ بحالتِ استراحت بھی حاضرین کے سروں کے برابر پہنچتا ہوگا۔ یہ پلنگ کئی حصّوں میں بنے ہیں جو علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں اور پھر یکجا بھی کئے جا سکتے ہیں۔

متفرق اشیاء | پلنگوں پر۔ کرسیوں۔ صندوقوں۔ چھوٹی چھوٹی کارچوبی پلکیریوں۔ اور نہایت عجیب دستی چھڑیوں کے انبار لگے تھے۔ چھڑیوں پر نہایت عجیب نقش ونگار اور بیش قیمت موتی جڑے ہیں بعض صندوق آبنوس کے ہیں۔ جن پر ہاتھی دانت کا نہایت خوبصورت کام ہے۔ ان پر کچھ عبارتیں بھی کندہ ہیں۔ باقی صندوقوں پر طلائی کام اور چینی کے نقش ونگار ہیں۔ انکے علاوہ بستر کے صندوقچیاں۔ چھوٹے چھوٹے منقش شمعدان اور بہت سی چیزیں رکھی ہُوئی تھیں۔

سامان خوراک | شیر والے پلنگ کے نیچے لکڑی کے ۳۰ سے زیادہ بیضاوی سفید ڈبے انبار در انبار پڑے تھے ان میں بادشاہ کی روح کے لئے خوراک تھی۔ خوراک میں علاوہ دیگر اشیاء خوردنی کے۔ بھیڑ۔ مرغابی۔ قاز۔ ہرن۔ اور دیگر جانوروں کی ٹانگیں۔ پٹھے۔ جگر وغیرہ شامل ہیں۔ ان چیزوں کو تازہ رکھنے کے لئے اُن میں مختلف قسم کے مصالح اور خوشبوئیں لگی ہُوئی تھیں۔ جنکی بدولت یہ چیزیں اتنی قدیم ہونے کے باوجود آج بھی اپنی اصلی حالت میں ہیں اور ذرا بھی خراب نہیں ہُوئی ہیں۔

برتن یا آفتابے | پلنگوں کے درمیان چار نہایت خوشنما برتن رکھے تھے یہ برتن فی الحقیقت اعجوبۂ روزگار

ہیں اور جس قدیم صنعت کی وہ یادگار ہیں اُسکا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھاتے ہیں۔ کوئی شخص انہیں دیکھ کر حیرت اور تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکیگا اور اُسے یہ ماننا پڑیگا۔ کہ قدیم مصری صنعت موجودہ صنعت سے کہیں ترقی یافتہ تھی۔ برتن سنگِ جراحت کے بنے ہُوئے ہیں اور اُن پر کثرت سے نقش و نگار ہیں۔ اُنکے دونوں پہلوؤں پر بہت ہی عجیب دستے ہیں جو کنول اور ایک اَور قسم کے پھول سے مشابہ ہیں۔ یہ پھول آپس میں اس خوبصورتی سے گندھے ہُوئے ہیں کہ اُنکی بناوٹ سے ایک نفیس جالی بن گئی ہے۔ ان پھولوں سے بالائی اور زیرین مصر کا الحاق ظاہر کرنا مقصود ہے۔ دہانوں میں سے بھی کنول کے پھول لٹک رہے ہیں اور دستوں کے حاشیوں پر توتنخ امین کا نام اور الفاظ "ایک لاکھ سال" کندہ ہیں۔ یہ برتن منقش تپائیوں پر رکھے ہیں اور تپائی سمیت ڈھائی فٹ کے قریب اونچے ہیں۔ ان میں سے ایک برتن ذرا چھوٹا اور فراخ دہانے کا ہے اور کنول کے شگفتہ پھول سے مشابہ ہے۔ بڑی بات ان برتنوں میں یہ ہے کہ وہ صرف ایک ڈال کے ہیں۔ یعنی ایک ہی پتھر کو تراش خراش کر بنائے گئے ہیں اور جوڑ کا اُن میں کہیں نام تک نہیں۔ اس میں بادشاہ کے استعمال کے لئے تیل اور مالش کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ وہ تیل اب بھی برتنوں میں موجود ہے اور جب اُنہیں دھوپ دکھائی گئی تو پگھل کر تیل میں چپچپاہٹ پیدا ہوگئی ۔

شاہی تخت | ایک اور پلنگ کے نیچے شاہی کرسی یا تخت رکھا ہُوا تھا۔ یہ قدیم مصری صنعت اور دستکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ تخت لکڑی کا ہے۔ جس پر سونے کا باریک پترا چڑھا ہے۔ دونوں کونوں پر شیر کے سر ہیں جن پر نہایت نفیس نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ تخت کے بازو بھی لکڑی کے ہیں اور اُن پر بھی سونا چڑھا ہے۔ بازوؤں کے نیچے چاندی کا بنا ہُوا مصر کا تاج ہے۔ جس پر شیشے کا ایک متبرک سانپ بیٹھا ہے ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایک پایہ پر بادشاہ کا پرانا نام توتنخ ایٹن کندہ ہے۔ یہ نام قیمتی پتھروں اور شیشے کی میناکاری میں لکھا گیا ہے۔ اس تخت پر اور بھی کئی جگہ بادشاہ کا نام آیا ہے۔ مگر وہ سونے کے پتروں پر ہے اور اُنہیں بدل کر توتنخ امین کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اول اول سب جگہ پہلا ہی نام تھا۔ مگر جب بادشاہ نے تبدیل مذہب کے ساتھ نام بھی تبدیل کر لیا۔ اس لئے تخت پر جو نام کندہ ہے۔ اُنکا بدلنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ سونے کے پتروں پر تو یہ تبدیلی بہ سہولیت تمام عمل میں آگئی۔ لیکن شیشوں اور پتھروں کو تبدیل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لئے اُس نام کو قدیم حالت

پر چھوڑ دیا گیا۔ تخت کی پشت پر بادشاہ کی تصویر چونے میں بنی ہوئی ہے۔ بادشاہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اُسکے قریب ملکہ کھڑی ہے اور بادشاہ اپنا ہاتھ اُسے پیش کر رہا ہے۔ چہرے اور بدن کے وہ حصے جو برہنہ رہتے ہیں عقیق جیسے کسی قیمتی پتھر کے ہیں جس کی سُرخی میں کسی قدر تاریکی میں جھلک مارتی ہے۔ بادشاہ کا لباس منقش ہے اور اُس پر شیشے کی مینا کاری ہے۔ ملکہ کا تمام لباس چاندی کا ہے۔ اُس کے قریب ہی میز پر ایک نہایت خوبصورت گلدستہ رکھا ہے جس پر قیمتی پتھر جڑے ہیں۔ ایٹن (یا سورج) اپنے لمعات بادشاہ اور ملکہ پر ڈال رہا ہے یا بالفاظ دیگر اُنکی حفاظت کر رہا ہے۔ تخت کی نشستگاہ پر۔ آسمانی۔ سنہری اور سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے مربعوں کی پچی کاری ہے اور اُن کے درمیان ترچھی وتری لکیریں کھچی ہیں نشستگاہ اور پایوں کے درمیان بھی ابتداءً میں کچھ تصویریں غالباً سونے کی بنی ہوئی تھیں۔ جن کا مقصد پایوں کو تھامنا اور قائم رکھنا تھا۔ مگر چوروں کی دستبرد سے وہ ضائع ہوگئیں۔ اور اُن پائیدانوں پر جن پر وہ ٹکی ہوئی تھیں۔ اُنہیں بے رحمی سے علیحدہ کرنے کے نشانات اب تک باقی ہیں +

الغرض یہ تخت اُن عجیب اور نادر روزگار چیزوں میں سے ہے جس کا ثانی اس سے پہلے کبھی دستیاب نہیں ہوا۔ تخت کو ایک ہی نظر دیکھ کر انسان سکتہ کے عالم میں رہ جاتا ہے۔ اور مصر کی گذشتہ صنعت کا اقتدار ذہن میں قائم ہوجاتا ہے۔ تصاویر میں اتنا زور اور قوتِ بیانیہ ہے۔ اور زندگی اُن میں اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کہ بادی النظر میں وہ بالکل زندہ اور بولتی چالتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس تخت کے لئے حفاظت کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ اُسکے کچھ حصے بمرورِ زمانہ بہت نازک ہوگئے ہیں۔ باستثناء اُن مقامات کے جن پر پتھروں کی پچی کاری ہے۔ باقی تمام تخت باریک سونے کے پترے سے ڈھکا ہوا ہے۔ اب جہاں یہ سونا براہ راست لکڑی پر لگا ہے۔ وہ تو بالکل محفوظ اور اصلی حالت میں ہے لیکن جہاں سونے کو چونے پر چڑھایا گیا ہے۔ وہاں چونہ بوسیدہ ہو کر چھٹنے لگا ہے اور ایسے ہی مقامات ہیں جہاں حفاظت کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ اسکے تحفظ کے لئے ضروری تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں۔

نصف مجسمہ | ذرا اور آگے لکڑی کا بنا ہوا ایک نصف مجسمہ تھا۔ جس میں سر اور شانے ہی دکھائے گئے ہیں۔ یہ بھی عجیب چیز ہے۔ چہرہ چپٹا ہوا ہے اور اُس کی تصویر کے دیکھنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا

کہ آیا وہ زندہ انسان سے لی گئی ہے۔ یا لکڑی کے مجسمے سے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ زمانہ حال کے درزیوں کے طریق پر یہ مجسمہ بادشاہ کے تاج اور لباس کے آنے کے لئے مخصوص تھا۔ اور بالکل اسی قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ جسے آجکل خیاطوں کی دوکانوں پر دیکھتے ہیں اور جسے نئے سلے ہوئے کپڑے پہنا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ شاہ ِ امین فیشن کا نہایت دلدادہ تھا۔ اور اپنے لباس کی تراش خراش اور موزونیت کا خاص لحاظ رکھتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ساڑھے تین ہزار سال کا قدیم مصری تمدن زمانہ حال کے تمدن سے کچھ کم پایہ نہ رکھتا تھا۔

اسکی نسبت ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ شاہ ِ امین کے زمانے کی کسی مصری خاتون کا مجسمہ ہے لیکن یہ بات زیادہ دلنشین نہیں۔

رتھیں | مجسمے سے تھوڑے ہی فاصلے پر چار شاہی رتھوں کے ہودے یا جسم رکھے ہوئے تھے اُنکے پہلے اور دیگر ساز و سامان از قسم زین وغیرہ ایک طرف پڑا تھا۔ اور بانس دیوار کے سہارے کھڑے تھے۔ رتھیں ایک قسم کی سخت لکڑی کی بنی ہوئی ہیں جو اس مطلب کے لئے نہایت موزوں ہے اُن پر تمام و کمال سونا چڑھا ہے جس پر کثرت سے بیش قیمت پتھروں کی میناکاری ہو رہی ہے حاشیئے عجیب و غریب نقش و نگار اور رنگ برنگ شیشوں سے مزین ہیں۔ جو بظاہر قیمتی پتھر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ تین رتھوں کی نشستگاہ پر معمولی چمڑا چڑھا ہے۔ اور ایک پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ پشت کی طرف وسطی تختے پر توتنخ امین کا نام کندہ ہے۔ اور اندرونی کنارے کے چاروں طرف لکڑی کا ایک نفیس جالیدار حاشیہ لگا ہے۔ جس پر اُن ایشیائی قیدیوں کی تصاویر ہیں جو لڑائی میں ہاتھ آئے تھے۔ اُن میں سے ایک رتھ بالخصوص نہایت شاندار ہے اور غالباً فتوحات کے جلوسوں میں بادشاہ اُس پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اس رتھ کے کچھ حصے امتداد زمانہ سے بوسیدہ ہوگئے ہیں۔ مگر اسقدر خراب نہیں ہوئے کہ اُنکی مرمت نہ ہو سکے۔ رتھ کے پرزے اگرچہ ہزارہا سال بیکار رہنے کی وجہ سے سخت اور زنگ آلود ہوگئے ہیں۔ تاہم رتھ کارآمد ہے اور جب اُسے قاہرہ کے عجائب خانے میں لیجانے کے لئے باہر نکالا گیا۔ تو اُس کی جگمگاہٹ اور زرق برق سے دیکھنے والوں پر ایک محویت کا عالم طاری تھا۔

طلائی صندوقچی | کمرے کے خاتمے پر ایک نہایت ہی خوبصورت طلائی صندوقچی رکھی تھی جو اپنی

بناوٹ صنعت اور نقش و نگار میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ اور اُس شاہی تخت سے جسکا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کہیں زیادہ خوبصورت اور قیمتی ہے۔ بلکہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اُسکی قیمت کا اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے۔ یہ صندوقچی لکڑی کی ہے اور اُس پر اس کثرت سے نقش و نگار ہیں۔ کہ کوئی جگہ اُن سے خالی نہیں۔ یہ نقش اپنی نفاست اور صنعت کی باریکی میں وہ پایہ رکھتے ہیں کہ چین اور جاپان کی بہترین صنعت بھی اُن کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ ڈھکنے پر بادشاہ اور امراء کی تصاویر ہیں جو شیر۔ بارہ سنگے اور دیگر صحرائی جانوروں کے شکار میں مصروف نظر آتے ہیں۔ پہلوؤں پر میدان جنگ کی تصاویر ہیں۔ جن میں بادشاہ بہ نفس نفیس۔ افریقی۔ اور ایشیائی دشمنوں سے برسرپیکار ہے۔ صندوقچی کے کناروں پر بادشاہ کی تصویریں بہ شکل سفنکس دکھلائی گئی ہیں۔ جنکے سر انسانی سروں سے مشابہ ہیں۔ ان تصاویر میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ بادشاہ اپنے دشمنوں کو پاؤں تلے روند رہا ہے۔

لباس اور آرائش سامان | اس صندوقچی میں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ بھی مستقل اہمیت رکھتی ہیں۔ یعنی اُن میں بادشاہ کے زمانہ طفلی کے ملبوسات۔ سلیپر (جوتے) اور دیگر آرائیشی سامان رکھا ہوا تھا لباس بہترین کپڑے کا بنا ہوا ہے۔ اور جواہرات از قسم لاجورد اور مرصع طلائی کام سے مزین ہے افسوس کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی کپڑا بھی اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکا۔ اور یہ اندازہ لگانا ناممکن ہے کہ اُس قدیم زمانے میں شاہی لباس کس وضع قطع کا ہوا کرتا تھا۔ جب اُن کپڑوں کو اُٹھایا گیا تو اُنکے تار الگ الگ ہو کر زمین پر بکھر گئے۔

دستانہ | صندوقچی میں سے ایک چھوٹا سا مکمل دستانہ بھی ملا ہے۔ جو تین یا چار سال کے بچے کے ہاتھ کا ہے۔ اور غالباً بچپن کے زمانے میں بادشاہ اُس وقت اُسے پہنا کرتا تھا۔ جب اُسے تیراندازی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تین ہزار سال کے طویل عرصہ میں وہ سُکڑ سُکڑ کر چھوٹا سا رہ گیا ہو۔ خیر کچھ بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ وہ دنیا کا قدیم ترین دستانہ اور ہزار ہا سال قبل

لہ سفنکس ز. Sphinx - دیوتاؤں کی تاریخ میں ایک عجیب الخلقت مہیب ہستی ہے جس کا سر عورت کا اور جسم شیرنی کا ہے۔ جب کوئی مسافر اُسکے پاس سے گذرتا ہے تو وہ اُس سے عجیب اور مشکل معمے پوچھتی ہے جو ان معموں کا کافی اور شافی جواب نہیں دے سکتا اُسے پھانسی دیدیتی ہے۔

کی اعلیٰ اور مکمل تہذیب پر ایک بیّن دلیل ہے۔ دستانہ نہایت نفیس سنی کے کپڑے کا بنا ہے اور سیاہی مائل بھورے رنگ کا ہے۔ کمزور اور بوسیدہ ہو جانے کے باوجود یہ امید کیجاتی ہے کہ اس دستانے کو شیشے کے چوکھٹے میں رکھ کر برسوں کے لئے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

زرہ بکتر | ایک نہایت عجیب اور خوبصورت چیز جو اس صندوقچی سے برآمد ہوئی وہ بادشاہ کا زرہ بکتر ہے یہ زرہ شکل میں سوتی سے مشابہ اور مرصع طلائی لڑیوں کے ذریعے پیوستہ ہے۔

سلیپر یا جوتے | صندوقچی میں چند جوڑے سلیپروں کے بھی تھے۔ یہ سلیپر چھوٹے پاؤں کے ہیں اور غالباً وہ ہیں جنکو بادشاہ بچپن میں پہنا کرتا تھا۔ یہ چمڑے کے ہیں جن پر سونے کا کام ہے چمڑے کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ مگر طلائی کام بدستور اصلی حالت میں ہے۔ ایک جوتے کے اگلے حصے پر ایک نہایت خوبصورت بکلس لگا ہے۔ جس پر سونے کی مرصع کاری ہے۔ اور کنول کے پھول بنے ہیں۔ درمیانی پھول کے دونوں سروں پر مرغابی کے دو سر بالخصوص قابل دید ہیں ایک اور جوتے پر مختلف رنگ کے شیشوں کی مینا کاری ہے۔

مالا۔ شاہی مہریں بکلس وغیرہ | مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ۔ صندوقچی میں سے ایک کہربائی مالا۔ اور ایک پارسل بھی ملا جسمیں شاہی مہریں ہیں۔ یہ مہریں ٹھوس سونے کی ہیں۔ اور نہایت نفیس نقش و نگار سے مزین ہیں بعض مہروں پر بادشاہ اور دیوتاؤں کی مورتیں ہیں اور حرف "ح۔ک" سونے۔ لاجورد اور شیشے میں کندہ ہیں جنکے معنے "حکومت کرنا" بتلائے گئے ہیں۔ اُنکے قریب ہی عصائے شاہی کی شکل بنی ہے۔ جس سے طاقت اور رعب داب جتانا مقصود ہے۔

صندوقِ کلاں | ایک پلنگ کے سامنے لکڑی کا ایک بڑا صندوق تھا جس پر سفید روغن چڑھا ہے اور اُس پر آبنوس کی گلکاری ہے۔ اس صندوق میں بادشاہ کا منقش لباس ہے جس پر طلائی مینا کاری اور جواہر نگار پچی کاری ہے لباس پر کیکڑے کی شکل کا ایک عجیب و غریب بکلس بھی لگا ہے۔ یہ بکلس بادشاہ کے نام کے حروف کا بنا ہے۔ چند حروف تو مرصع عقیق اور نیلے شیشے کے ہیں چند سبز شیشے کے اور باقی خالص سونے کے ہیں۔ صندوق میں سے چند تختیاں۔ ہاتھی دانت کا ایک چابک ایک شاہی علم۔ جس پر کانسی کا خول چڑھا ہے۔ اور بہت سے سوفار بھی برآمد ہوئے۔

طلائی گلوبند | صندوق کے ڈھکنے پر ایک مرصع گلوبند بہت سی جڑاؤ انگوٹھیاں اور چند طلائی آویزے

پڑے تھے۔ گلوبند نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ اور ہم مرکز چھلوں اور دھات کے مستطیل ٹکڑوں کا بنا ہُوا ہے۔ جن پر نیلی۔ سُرخ اور زرد رنگ کی چینی مرصع کاری نے عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ اس گلوبند کے مختلف حصے الگ الگ پڑے تھے۔ لیکن آثار قدیمہ کے ماہرین اس یادگار کو از سرِ نو جوڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ؂

آویزے | آویزے نہایت چمکدار اور روشن ہیں اُن پر پھُول پتیاں۔ میوے اور کھجور کے پتّوں کی تصویریں بنی ہیں۔ اور اُنکے قبضے اور بکسوئے مساحت کے مطابق ہیں ؂

انگوٹھیاں | انگوٹھیوں پر بادشاہ کا نام اور منقش شکلیں ہیں۔ اور حفاظت کی غرض سے اُنھیں کپڑے کی ایک لمبی سی بتی میں پرو رکھا ہے۔

کرسی اور سٹول اور تپائی | ایک پلنگ کے نیچے۔ لکڑی اور آبنوس کی ایک جواہر نگار کرُسی رکھی تھی اور اُسکے قریب ہی ایک شاہی سٹول تھا۔ یہ سٹول نہایت ہی عجیب شئے اور قدیم صنعت اور کمال کا بہترین نمونہ ہے وہ آبنوس اور ہاتھی دانت کا بنا ہے جس پر سنہری پچی کاری اور سونے کا ملمع ہے اس کے پایوں کو تراش خراش کر مرغابی کے سر سے مشابہ کر دیا ہے اور یہی سر زمین پر ٹکے ہُوئے ہیں نشتگاہ پر کسی جانور کی کھال پڑی ہے۔ جس پر عجیب و غریب نقش اور پھول بنے ہیں۔ سٹول کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی جالیدار تپائی رکھی تھی۔ جس پر سفید روغن ہو رہا ہے۔ یہ غالباً بچّوں کے بیٹھنے کے لئے تھی ؂

چوریاں | علاوہ ازیں گھوڑے کے بالوں کی دو چوریاں بھی ملیں۔ جن کے دستے چیتے کے سر سے مشابہ اور اُن پر کانسی کا خول چڑھا ہُوا ہے۔

شمعدان | ایک پلنگ پر چند نہایت نفیس شمعدان پڑے تھے۔ جنکی بناوٹ بعینہٖ زمانہ حال کے شمعدانوں کی سی ہے۔ یعنی ایک طشتری ہے جسکے وسط میں تو بتی کا گھر بنا ہے اور ایک طرف ایک تکونہ دستہ اُسے اٹھانے کے لئے لگا ہے۔ یہ نہایت محفوظ حالت میں ہیں اور کارآمد ہیں ایک شمعدان پر موم کی سالم بتی بھی چڑھی ہے۔ اور بتی کا وہ دھاگا بھی بدستور قائم ہے۔ جسے آگ دکھائی جاتی ہے۔

شاہی بارگاہ | ایک طرف سے لکڑی کے بیشمار ٹکڑے برآمد ہُوئے۔ جن پر سونے کے موٹے

بنے چڑھے ہوئے ہیں۔ اور جو رنگ برنگ کے نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ یہ ٹکڑے ایک شاہی بارگاہ کے اجزا ہیں۔ جو شکار کے وقت یا سفر کے موقعہ پر بادشاہ کے آرام کے لئے جنگل وغیرہ میں کھڑی کر دی جاتی تھی۔ اجزا اس ترتیب سے بنے ہیں کہ الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں اور پھر حسب ضرورت جوڑے بھی جا سکتے ہیں۔ اس بارگاہ کا ایک حصہ مکمل حالت میں بھی ملا ہے جس سے اُس کی بناوٹ کی طرز کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں ایک اکٹھا ہونے والا دروازہ بھی ہے جس پر لکڑی کا ایک کھٹکا لگا ہے اس کھٹکے پر بھی سونے کا خول چڑھا ہُوا ہے کواڑوں اور پہلوؤں پر بادشاہ اور بیگم کی گھریلو زندگی کے منظر دکھائے گئے ہیں اور بادشاہ تیر افگنی اور شکار کی مشق کرتا ہُوا نظر آتا ہے۔

کمرہ دوم۔ اس تمام مال و اسباب کے باوجود کمرہ اول سے کوئی تابوت دستیاب نہیں ہُوا۔ اور یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ شائد نعش کو مصالحوں سے محفوظ کرنے کے بجائے۔ زمین ہی میں دفن کر دیا ہو اس امر کی تفتیش میں کمرے کا از سر نو معائنہ کیا گیا تو جنوبی دیوار میں ایک چھوٹا سا سُوراخ نظر آیا۔ جو ضرور چوروں اور رہزنوں نے کیا ہوگا۔ سوراخ میں جھانک کر جب اندر نظر کی گئی تو عجب نظارہ دکھائی دیا۔ میزیں۔ کرسیاں۔ پلنگ۔ صندوق سنگ جراحت کے بت۔ چینی کے برتن اور دیگر بیشمار اشیاء ایک دوسرے پر چنی ہُوئی انبار در انبار پڑی تھیں۔ اور بعض جگہ تو پانچ فٹ سے بھی زیادہ بلند تھیں۔ سُوراخ نہایت چھوٹا تھا۔ اور دیوار کی کمزور حالت کی وجہ سے اُسے زیادہ فراخ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لئے کمرے کی پھر دیکھ بھال کی گئی۔ تو شمالی دروازے کے انجام پر ایک دروازہ ملا۔ جسے اینٹوں سے بند کر کے اُس پر پلستر کر دیا گیا تھا۔ اس دروازے پر بادشاہ کی ذاتی مُہر اور ایک سرکاری مہر بھی لگی ہُوئی تھی۔ دروازے کے دونوں جانب بادشاہ کے دو بت کھڑے تھے۔ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جب ۱۶ فروری ۲۳ء کو یہ کمرہ بڑے اہتمام سے کھولا گیا۔ تو اُسکی شان و شوکت اور چمک دمک نے دیکھنے والوں کی نظر کو خیرہ کر دیا۔ یہ کمرہ ۱۴ فٹ مربع تھا۔ جسکا بڑا حصہ ایک وسیع قبے کی چار دیواری نے گھیر رکھا تھا اس چار دیواری پر نیچے سے اوپر تک سونا چڑھا ہُوا ہے۔ جس پر نہایت بیش قیمت۔ نیلے چینی کے ٹکڑوں میں نقش و نگار بنے ہیں اونچائی میں یہ قریب قریب چھت تک پہنچ گئی ہے۔ اُس کے

پہلوؤں پر۔ اندر اور باہر۔ مذہبی تحریرات کندہ اور موت کے خوفناک نشانات بنے ہوئے ہیں مشرقی انجام" پر دو بڑے بند کواڑ تھے۔ جس کے اندر ایک اور قبہ تھا۔ وہ بھی بند اور سر بمہر تھا۔ اور اُس پر سرکاری مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ الغرض اس قسم کے پانچ قبّے ہیں جن سے شاہ امین کا تابوت کھڑا ہُوا ہے۔ وہ

**خزانہ یا گودام** مشرقی دیوار کے آخری انجام پر ایک اور کھلا ہُوا دروازہ ملا۔ جو کبھی بند نہیں کیا گیا تھا اس دروازے سے ہو کر مقبرے کے گودام یا خزانے میں پہنچتے ہیں۔ گودام میں ایک اور کار چوبی قبہ اس سج دھج کا ملا۔ کہ زبان اور قلم اُسکی شان و شوکت کے بیان کرنے سے عاجز ہے۔ اس قبّے یا شامیانے کے پہلوؤں پر حفاظت کی غرض سے چار دیویاں بٹھا رکھی تھیں۔ جنہوں نے ہاتھ پھیلا رکھے تھے

**دیویاں** یہ حسین اور موہنی دیویاں اپنی بناوٹ اور تفاصیل کی تکمیل میں اس پایہ کی ہیں کہ شاید یونانی صنعت بھی اُنکے سامنے شرم سے منہ چھپا لے یقیناً دنیا کے آثارِ قدیمہ کے انکشاف میں ابتک کوئی چیز ان سے بہتر دریافت نہیں ہو سکی۔ ان دیبیوں کے واجب الرحم اور مسکین چہرے۔ شانوں پر سے اُن لوگوں کو حسرت اور تاسف کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جو وہاں آتے ہیں۔ گودام کے عین دروازے پر چھوٹا سا حجرہ بنا ہے جو ایک عجیب اور چمکدار چھکڑے پر رکھا ہے۔ اس حجرے میں سونے کا ایک گیدڑ کھڑا ہے۔ حجرے کے عقب میں بیل کا ایک سر ہے۔ جو دوسری دنیا کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ گودام کے جنوبی پہلو پر بیشمار صندوق برنگ سیاہ ایک دوسرے پر چنے ہوئے رکھے ہیں۔ یہاں بھی سنگِ جراحت کے آفتابے اور برتن پڑے ہیں جو اپنی نفاست اور نزاکت میں اُن برتنوں سے کہیں اعلٰے ہیں۔ جو کمرہ اول سے دستیاب ہوئے تھے۔ یہ برتن ابھی تک سفید ہیں اور امتدادِ زمانہ سے زرد نہیں پڑے۔ صندوق نہایت مضبوط اور سر بمہر ہیں اس لئے امید کیجاتی ہے کہ جب اُنہیں کھولا جائیگا تو اُن میں سے بے اندازہ مال و دولت اور بے شمار نادر اشیاء ملینگی۔ ان میں ایک صندوق ہاتھی دانت کا بھی ہے۔ جس پر سونے کا جڑاؤ کام ہے۔ یہ نہایت خوبصورت چیز ہے چند کھلے صندوق بھی ملے۔ ایک میں چند لوگوں کی تصاویر ہیں۔ جنکی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ وہ دوسری دنیا کی محنت اور مشقت میں بادشاہ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ایک اور صندوق میں

**پنکھا** شترمرغ کے پروں کا ایک پنکھا ملا۔ جس کا دستہ ہاتھی دانت کا ہے اور اُس پر بادشاہ کا نام مختلف قسم کے رنگین پتھروں میں کندہ ہے۔ یہ پنکھا مکمل اور نہایت محفوظ حالت میں ہے۔

اور مصر کے آثارِ قدیمہ کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہے۔ ایک صندوق میں خوبصورت زیورات کا ڈھیر پڑا ہے۔ علاوہ ازیں رتھیں اور اُنکا سازو سامان یہاں سے دستیاب ہُوا۔ یہ رتھیں اُن سے زیادہ شاندار ہیں جو کمرہ اول سے برآمد ہُوئی تھیں۔

کشتیاں | گودام کی اشیاء میں نہایت دلچسپی کی چیزیں شاید کشتیاں ہیں۔ جو بالکل مکمل اور نہایت محفوظ حالت میں پائی گئیں۔ ان پر نہایت خوبصورت اور دلکش رنگ و روغن ہے۔ جو امتدادِ زمانہ سے ذرا زرد پڑ گیا ہے۔ یہ کشتیاں مختلف قد و قامت کی ہیں۔ سب سے بڑی کشتی ۴۲ انچ لمبی اور شاہی بجرے سے مشابہ ہے۔ اُس کے دونوں آخری حصّوں پر شامیانے ہیں جو بانسوں پر ٹکے ہُوئے ہیں۔ یہ حصّے ایک ہی شکل و صورت کے ہیں۔ اور اگلے اور پچھلے حصّہ میں تمیز کرنی ناممکن ہے ان میں کچھ کشتیاں بادبانی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو چپوؤں کے ذریعے چلتی ہیں۔ اگرچہ بعض بادبان کسی قدر بوسیدہ ہو گئے ہیں لیکن اکثر اب تک کارآمد ہیں اور جتنی چیزیں ازقسم پارچات مقبرے سے برآمد ہوئی ہیں۔ اُن سب سے بہتر حالت میں ہیں بات یہ ہے کہ جو پارچات احتیاط سے صندوقوں میں بند کر دئے گئے تھے۔ وہ تو ہوا اور روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے بہت جلد ضائع ہو گئے۔ لیکن بادبان جنہیں کھلی ہوا میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اچھی حالت میں ہیں اور اگرچہ اُنکا رنگ قدرے زرد پڑ گیا ہے۔ مگر وہ اب بھی اس قابل ہیں کہ ہلکی سی ہوا کو روک سکیں۔ کشتیاں بحیثیت مجموعی ابتک کارآمد ہیں*

مصریوں کا کشتیوں پر انحصار | قبل ازیں دیگر مقابر میں سے بھی کشتیاں برآمد ہُوئی ہیں مگر شاہِ امین کی کشتیاں اپنی صنعتی خوبیوں کے لحاظ سے اُن سب میں بہتر ہیں۔ کشتیاں قدیم زمانے میں ہر شاہی مقبرے کا ضروری جزو سمجھی جاتی تھیں اور اُس نے قدیم مصریوں کے اعتقاد پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ دریائے نیل۔ قدیم زمانے میں اہل مصر کی آمد و رفت کی نہایت ضروری منزل تھی۔ اور اُنکے لئے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبے میں جانے کے لئے اکثر دریائے نیل کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ اور اس لئے کشتیاں ضروری اور لابدی تھیں دریائے نیل پر مصریوں کے اس انحصار نے اُنکے عقائد پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ سمجھنے لگے کہ جس طرح ہم کشتیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اُسی طرح چاند اور سورج بھی کشتیوں میں آتے جاتے ہیں۔ اور کہ دوسری دنیا

میں بھی ایک دریائے نیل اُلٹی طرف کو بہتا ہے۔ جسکے ذریعے یہ اجرام فلکی اپنا سفر از سرِ نو شروع کرنیکے لئے پھر اُسی جگہ آجاتے ہیں جہاں سے وہ چلے تھے۔ اُنکا یہ بھی اعتقاد تھا۔ کہ مُردوں کو بھی دوسری دُنیا میں جاکر کشتیوں کی ایسی ہی ضرورت پڑیگی۔ جیسی کہ یہاں پڑتی ہے۔

ایک اور دلچسپ چیز ایک ڈولی ہے۔ جس میں کشتی کو اُٹھاکر جلوس وغیرہ میں لیجایا کرتے تھے اسکے علاوہ کشتیوں کے کھینے کے سات چپّو بھی وہاں سے دستیاب ہُوئے۔

طلائی صندوق | شاید سب سے عجیب اور بیش قیمت چیز ٹھوس سونے کا ایک صندوق ہے جو چھ فٹ اونچا اور چار فٹ لمبا ہے۔ اسکو ابھی کھولا نہیں گیا۔ اس صندوق کے متعلق بڑی بڑی توقعات ہیں قیاس چاہتا ہے کہ وہ شاہ امین کے خاص جواہرات کا صندوق ہوگا۔ اگر ایسا ثابت ہُوا تو یقیناً جو مال و دولت اُس میں سے برآمد ہوگا وہ انسانی خواب و خیال سے کہیں زیادہ ہوگا۔

بُت سرہانہ اور تاج | بادشاہ کے دو نہایت خوبصورت بُت یہاں سے بھی ملے ہیں ان پر سونے کے پتر چڑھے ہیں۔ قد میں ایک ایک فٹ کے قریب ہیں اور دونوں ایک شیر کے اوپر کھڑے ہیں دیودار کی لکڑی کا ایک عجیب و غریب سرہانہ بھی دستیاب ہُوا۔ جس پر بادشاہ آرام لینے کی غرض سے سر رکھ لیا کرتا تھا اس پر نہایت خوبصورت نقش و نگار ہیں۔ دو خوبصورت تاج بھی ہاتھ آئے، دونوں نہایت مکمل حالت میں ہیں۔

یہ ہے چند اُن بڑی بڑی چیزوں کا نامکمل اور ادھورا بیان جو فرعون امین کے مقبرے سے برآمد ہُوئیں اور حقیقت یہ ہے کہ اُنکی خوبیوں کا ہزارواں حصہ بھی معرض تحریر میں نہیں آسکا اُنکے علاوہ اور بیشمار چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ملی ہیں جنکے نادر اور بےمثل ہونے میں تو کچھ کلام نہیں مگر اُنکے مفصل اور مشرح بیان کی ان مختصر اوراق میں گنجائش نہیں۔ ان سب اشیاء کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے سالہا سال درکار ہونگے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ امین یا زیادہ وسیع معنوں میں ٹھارویں خاندان کا عہد حکومت قدیم مصری صنعت و حرفت کے اُس کمال اور ایجاد و ہنرمندی کے معراج کا زمانہ تھا۔ جسکا کوئی اور عہد ہمسری نہیں کرسکا۔ جو نداق سلیم اور صنعت کی نہمیں اس عہد میں ہوئی وہ آنکھوں سے دیکھنا تو کجا کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوگی۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی چیز کے رنگ و روغن کے قیام اور ثبات میں تاریکی کو بڑا دخل ہے

روشنی ہمیشہ رنگ کے بگاڑنے اور خراب کرنے میں خاص حصہ لیتی ہے۔ لہذا ان برآمدشدہ اشیاء کے تحفظ کے ضمن میں ایک دلچسپ سوال یہ اٹھتا ہے کہ شاہ امین کے خزائن۔ روشنی اور زمانہ حال کے بہتر سے بہتر ترتیب دئے ہوئے عجائب خانوں کی ہر آن بدلنے والی آب و ہوا کا کتنے عرصہ تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کا جواب توصاف ہے۔ کہ یہ رنگ روغن اور بعض اشیاء خود زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتیں۔ اس صورت حال میں یہ ضروری ہے کہ آئندہ نسلوں کے لئے ان اشیاء کا ایک نہایت مکمل اور مفصل تحریری بیان چھوڑا جائے۔ تاکہ انہیں بعض اشیاء کے ضائع ہو جانے کے باوجود بھی انکی قدر وقیمت کے صحیح اندازے کا موقعہ مل سکے۔ اس مختصر مضمون کے قلمبند کرنے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ ان چیزوں کے بیان کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ موجودہ مضمون کا مقصد تو صرف پبلک کو آثار قدیمہ کے مطالع کا شوق دلانا ہے۔ البتہ ایک اور مقصد یہ ہے کہ شاید اس مضمون کو دیکھ کر کوئی قابل دماغ اس اہم کام کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا۔

کمرہ اول کی سب اشیاء مقبرے سے اٹھا کر سردست قاہرہ کے عجائب گھر میں رکھدی گئی ہیں۔ مگر ایک علیحدہ عمارت ان چیزوں کے لئے زیر تعمیر ہے جسکے مکمل ہونے پر یہ سب اشیاء ادھر منتقل کر دی جائینگی۔ گودام اور اسکے ملحقہ کمروں کا سامان مقبرے ہی میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جہاں موسم گرما کے باعث بالفعل کام بند کر دیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس مقبرے کی بہت سی اشیاء قدیم زمانے میں چوروں اور رہزنوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ مگر چوروں کا گذر کمرہ اول و دوم میں ہی ہوا تھا۔ اور غنیمت ہے کہ وہاں سے وہ کسی بڑی شئے کے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے اُن سوراخوں کا قدوقامت جن کے ذریعے وہ داخل ہوئے تھے بتاتا ہے کہ وہ لوگ صرف چند چھوٹی چھوٹی چیزیں (از قسم برتن وغیرہ) ہی لیجا سکے ہونگے۔ اندرونی کمرے اور گودام بالکل محفوظ پائے گئے۔ اور اُن سے کچھ تعرض نہیں ہوا۔ اس مقبرے کے محفوظ رہنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا۔ کہ دو ایک صدیوں کے بعد ہی وہ ملبے میں دب کر نظروں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس لئے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ شاہ امین کا تابوت[1] بھی پانچ سنہری قبوں میں گھرا ہوا محفوظ حالت

[1] یہ تابوت ۱۹۲۳ء کی موسم سرما میں مل چکا ہے۔ مگر ابھی کھولا نہیں گیا۔

میں پڑا ہے۔ امید کیجاتی ہے کہ جب وہ برآمد ہوگا تو وہاں سے بے اندازہ مال و دولت بھی ہاتھ لگیگا۔ ابتک ایسا کبھی نہیں ہُوا۔ فراعنۂ مصر کے جو مقابر اس وقت تک ملے ہیں وہ سب کے سب قدیم زمانے میں چوروں اور رہزنوں کے ہاتھوں لُٹ چُکے ہیں۔ اور یہ پہلا ہی موقعہ ہوگا کہ ایک فرعون اپنے سازوسامان اور مال و دولت سمیت ہاتھ آئیگا۔ مزید برآں یہ بھی توقع ہے کہ تابوت کے اندر سے کچھ کاغذات بھی برآمد ہوں۔ جن سے شاہِ امین اور ممکن ہے کہ اُسکے زمانے یا اسکے خاندان کی کوئی مکمل تاریخ ہی وہاں سے مل جائے۔ اگر ایسا ہو تو مصر کی قدیم تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائیگا۔ لہذا ناظرین کو نئے واقعات اور انکشافات کے لئے دوسرے مضمون کا انتظار کرنا چاہیئے۔

اس مقبرے کی دریافت نے طرزِ نو کی دلدادہ اقوام اور کاروباری دنیا پر عجیب اثر ڈالا ہے۔ اور ایک عظیم انقلاب کی امید کیجاتی ہے۔ کارپردازانِ مقبرہ کے پاس دُنیا کے ہر حصے سے چٹھیوں اور تاروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بندھ گیا ہے۔ دستانہ ساز۔ وہ دستانہ یا اُسکا فوٹو طلب کر رہے ہیں جو صندوقچی میں سے برآمد ہُوا تھا۔ پارچہ باف کپڑے کو دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ بناوٹ میں تین ہزار سال کی قدیم طرز کو داخل کریں۔

لندن اور پیرس کے درزی۔ لباس کی قدیم طرز اُڑانا چاہتے ہیں۔ جوتہ بنانیوالے شاہی سلیپر اور جوتے کی وضع قطع معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ باغبان۔ اناج کے بیج پھولوں کی پتیاں اور اپنی دلچسپی کی دیگر اشیاء کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور سنیما فلم کی کمپنیاں اور فوٹوگرافر خاص خاص رعائتیں مانگتے ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل ہم لارڈ کارناروَن کی بے وقت اور افسوسناک موت کا ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ جنکا وجود اس مقبرے کی برآمدگی کا باعث ہُوا۔ یہ سچ ہے کہ لارڈ موصوف کو آثارِ قدیمہ کی تحقیق و تفتیش کا کوئی خاص مذاق نہ تھا۔ اور وہ مسٹر کارٹر ہی تھے۔ جنھوں نے اُن کو وادی الملوک کی کھدائی کا ٹھیکہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ اگر لارڈ کارناروَن کی طرف سے یہ مالی امداد نہ ملتی تو یہ مقبرہ ابھی تک سپردِ خاک ہی رہتا۔ اس لئے جہاں اس مقبرے کی دریافت کا اصلی باعث مسٹر کارٹر ہُوئے ہیں۔ وہاں لارڈ کارناروَن کی مساعی جمیلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔

لارڈ موصوف کی موت کسی زہریلے جانور کے کاٹنے سے واقع ہُوئی جس نے مقبرے کی دیکھ بھال کے

وقت اُنکے چہرے پر کاٹ کھایا تھا۔ اول اول تو اسکی کچھ پروا نہ کیگئی اور اُسے معمولی سمجھا گیا زخم بھی بھر گیا اور اُس پر کھرنڈ بھی آگیا تھا۔ مگر ایک دن حجامت کے وقت وہ کھرنڈ اُسترے سے چھل گیا۔ اُس وقت سے اُس میں زہر کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ حتیٰ کہ چند ہی دن میں وہ تمام جسم کے اندر سرایت کر گیا۔ ممکن ہے وہ اس صدمے سے جانبر ہو جاتے لیکن آخری وقت نمونیہ کا حملہ اُنکے لئے مہلک ثابت ہوا۔ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

یہ انتہا کا درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ ہے کہ موت کے ایک ہی وار نے لارڈ کارناروَن کی زندگی کا عین اُس وقت خاتمہ کر دیا جب وہ اپنی سالہا سال کی جانکاہ محنت اور صبر و استقلال کی آزمائش کے بعد اب اس قابل ہوئے تھے کہ اُنکے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوں۔ مقبرے کی دریافت گویا لارڈ موصوف کی موت کا پیش خیمہ تھی اس واقعہ پر لوگوں کو عجیب عجیب خیالات کے اظہار کا موقعہ ملا ہے۔ مس میری کوریلی کی رائے ہے۔ کہ یہ موت فوق العادت اسباب کا نتیجہ ہے وہ کہتی ہیں کہ اُنکے پاس ایک قدیم عربی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں تحریر ہے کہ پرانے مقبروں میں کچھ بکس رکھدئے جاتے تھے جن پر زہر اس مخفی طریقے سے لگایا جاتا تھا۔ کہ جو اُنکو چھوتا تھا وہ ہم آغوش موت ہو جاتا تھا اور لطف یہ اُسے گمان بھی نہ ہوتا کہ اُسکی مصیبت کا اصلی باعث کیا ہے سر کونن ڈائل کہتا ہے کہ قدیم نعشوں کی حفاظت بعض عنصری ارواح کے سپرد ہے اور اُن میں سے کسی منحوس اور شریر روح نے لارڈ کارناروَن کا کام تمام کیا ہے ——— اس میں کلام نہیں کہ سائنسدان اصحاب تو ان امورِ قیاسی کا ضرور مضحکہ اڑائینگے۔ لیکن سلسلۂ واقعات ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ اس کائناتِ عالم میں ہزارہا ایسی باتیں ہیں جن کا علم خدائے واحد کی ذات پاک کے سوا اور کسی کو نہیں اور جو سائنس اور فلسفے کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہونگی۔ انسان کا ہر موقعہ پر کامیاب نہ ہونا اور واقعات کا خلاف امید سرزد ہونا بھی خدا تعالیٰ کی ہستی کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ ؎

ز قدرتِ ملکوتش یکے نشان این است
کہ کارہا بخلافِ امیدِ ما باشد

حفیظ الدین

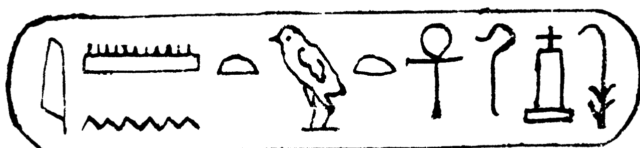
---

**محبت** ؏ سراپا، اک جستجو ہے، روح کی!! ایک راز ہے، عصمت کی خلقت کا۔ جس کا سراغ عالم مجاز میں، کچھ تو "دامن یوسف" کے چاک ہیں، اور کچھ رخنے "قلب زلیخا" کے!!!

**خلیقی دہلوی**

# مآثر

## الملک توت عنخ امنؒ





ناظرین میں سے جو اصحاب "ٹائمز آف انڈیا" کا برابر مطالعہ کرتے رہے ہیں انہیں یاد ہوگا کہ ہندوستان کے اس نامور انگریزی رسالہ نے آثار مصر سے متعلق اپنی پہلی اشاعت میں توت عنخ امن کے صحیح حالات کے ساتھ ساتھ قدیم رسم الخط کا نمونہ بھی پیش کیا تھا۔ ذیل کا مختصر مضمون بھی خصوصیت کے ساتھ انہی دو باتوں پر حاوی ہے اور عربی کتب سے ماخوذ ہے جس کے لئے مولوی عبداللہ صاحب شکریہ کے مستحق ہیں! زیادہ تر اس لئے بھی کہ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مغربی مستشرقین سے پیشتر عرب آثار قدیمہ کے دریافت کرنے میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن زمانہ کے انقلاب کے ساتھ ان کی معلومات کا ذخیرہ صرف کتابوں میں رہ گیا یا ان کے ساتھ پیوند خاک ہوگیا۔ اور اب دنیا مغربی مستشرقین کی تحقیقات کی دست نگر ہے۔ اور عرب محققین کا سرمایہ گمنامی کی حالت میں پڑا ہے +

اردو کے جرائد اور رسائل نے توت عنخ امن کے صحیح املا سے اہل ذوق کو مستفید نہیں کیا۔ مغربی مستشرقین نے اس کا تلفظ TUT ANKH AMEN کیا ہے۔ اوپر مصری خط میں جو دو تقرے ہیں ان میں پہلا اس کا نام توت عنخ امن اور اس کے نیچے اس کا لقب حق ان رس ہے +

(ہمایوں)

یہ مصر کے اٹھارویں خاندان کے پانچ بادشاہوں میں سے دوسرا بادشاہ تھا۔ اسکی بیوی کا نام امن عنخ انس ہے۔ اسکا اپنا نام دو کلموں سے مرکب ہے۔ پہلا توت عنخ امن[1] جو اس کا ذاتی نام ہے اور دوسرا حق ان رس جو اسکا لقب ہے جس سے وہ اس زمانہ میں ملک پر غلبہ پانے سے پہلے مشہور تھا اسکے لفظی معنے 'حاکم شہر ارمنت' ہیں +

---

[1] بعض مصری جرائد امن کی بجائے آمون لکھتے ہیں۔ چنانچہ

انا فرعون انا توت آن مون رب وادی النیل قہار العدی

اس کا نام اسکے مقبرہ (طیبہ[1]) کے کتبوں میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جہاں بعض تصاویر بھی موجود ہیں۔ ایک مجلس میں وہ تخت پر بیٹھا ہُوا دکھایا گیا ہے اور اُسکے آگے قبائل الشورہ والرتنوہ، لباس فاخرہ پہنے مع اپنے غلاموں کے، جزیہ، سونے چاندی کے برتنوں، عجیب و غریب صنعت کاریوں، گھوڑوں، درندوں اور چیتے کی کھالوں کی صورت میں پیش کر رہے ہیں، جو خاصکر دجلہ اور فرات کے مابین الجزیرہ میں بنائے جاتے تھے، اور پائے جاتے تھے۔

اس مجلس کے گرد جو کتبہ ہے اسکے یہ معنے ہیں۔

"قبیلہ اشورہ کا جزیہ اہل خست امنحتب[2] کے گوشہ کے نیچے اتھوپیا اور حاکم اقطار جنوبیہ کی طرف واقع ہے"

ایک کتبہ اشورین کے اوپر ہے جسکے معنے ہیں۔

"یہ تمام قبیلۂ اشورہ، شاہ مصر کو اُسکے بادشاہ ہونے سے پہلے نہیں جانتا تھا، جب جاننے لگا تو اُسی سے عفو و رضا کا سائل ہوتا تھا۔ ان کا قول ہے کہ نصر و اعانت اسکے یہاں ودیعت کئے گئے تھے اور دشمن اسکے زمانہ میں معدوم تھے، اور لوگ امن و راحت میں زندگی بسر کرتے تھے۔"

اس مقبرہ کی دوسری طرف اور تصویریں ہیں، ان پر جو کتبہ ہے اسکے یہ معنی ہیں۔

"اہل اتھوپیا کی طرف سے، جزیہ عظیمہ، سوڈان کے چیدہ چیدہ نفائس کی صورت میں وارد ہُوا ہے اور طیبہ کی طرف امیر اتھوپیا کے گوشہ کے نیچے پہنچ رہا ہے"۔

اس مجلس میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک کشتی سوڈان کی طرف سے نہایت بیش بہا جواہر، بیل گھوڑے، اور دیگر اشیاء نفیسہ، مثل برتن، اسلحہ وغیرہ کا ذخیرہ لئے ہُوئے آ رہی ہے ملکہ (سوڈان) اور قاصد کشتی سے نکلکر ایک خوبصورت گاڑی میں، جس میں دو بیل جُتے ہیں، سوار ہو گئے ہیں۔ پاس ہی امراء، وزُوسا بنی الاسود، امام ملک مصر کی تواضع کر رہے ہیں اور جزیہ اُٹھائے ہُوئے ہیں۔ (ماخوذ از عقد الثمین)

احقر عبد اللہ    چابکسواراں۔ لاہور ۲ ستمبر ۱۹۲۴ء

---

[1] طیبہ جسے (THEBES) کہتے ہیں اور چار پرگنوں میں تقسیم ہے کارنک لقصر جہاں موجودہ مقبرہ واقع ہے میڈینٹ آبو اور گورنو + انجیل میں طیبہ کو شہر آمون لکھا ہے اور ہومر نے ایک سو دروازہ والا شہر بیان کیا ہے جسے مصری آج محض عبد الکرنہ کے نام سے یاد کرتے ہیں +

[2] امنحتب۔ اسی خاندان کے سلسلہ میں سے ایک بادشاہ کا نام تھا جس کا لقب خون اتن (نور قرص الشمس) تھا۔ یہ توتنعنخ امن کا خسر تھا +

# رُودادِ محبت

عندلیب زار ہے وابستۂ دامانِ گُل
اور گُلِ نوخاستہ دیوانۂ روئے بہار
قمرئ خستہ جگر ہے عاشقِ سروِ سہی
اور "پی" کی یاد میں بیکس "پپیہا" بیقرار

———

ہالۂ روشن فلک پر ماہ در آغوش ہے
انجم تابندہ ہیں زینت فروزِ آسماں
چاند تارے رشتۂ اُلفت میں سب ہیں منسلک
مظہرِ جوشِ محبت ہے نمودِ کہکشاں

———

موج ہے وابستۂ دامانِ ساحل سربسر
اور دریائے رواں اپنے بھنور سے شاد ہے
گوہرِ خوش آب ہے بطنِ صدف سے شادکام
یعنی دُنیائے محبت اس طرح آباد ہے

———

دیدیا ہے دینے والے نے ہر اک کو دلنواز
اک مجھے بخشی ہے اُس نے فطرت تنہا پسند
دل ہے پہلو میں، مگر خو کردۂ رنج و الم
روح ہے قالب میں، لیکن بیقرار و دردمند

———

ایک میں دنیا میں تنہا خوگرِ آلام ہوں
قلب مضطر ہے مرا سرمایہ دارِ اضطراب
میری فطرت ہے مصیبت کوش خود میرے لئے
روح ہے میری ازل سے سازگارِ اضطراب

———

شکر ہے اُسکا مگر یہ بھی اُسی کی دین ہے
غم مری قسمت میں لکھا ہے تو پھر کیوں غم کروں؟
کیا کروں اُسکی شکایت کیوں بنوں میں ناسپاس
اس دو روزہ عیش کا میں کس لئے ماتم کروں؟

———

مٹتے مٹتے ایک دن احساسِ غم مٹ جائیگا
اور میں بھی قیدِ کلفت سے رہا ہو جاؤنگا
زندگی فانی ہے جب اور اُسکی ساری لذتیں
پھر مجھے کیا غم کہ میں خود ہی فنا ہو جاؤنگا

اعجاز احمد از [illegible]

# انگلستان کے اخبارات

یورپ میں اخبارات محض تفریح طبع یا خبریں معلوم کرنے کا ذریعہ ہی نہیں ہیں۔ سامانِ خورونوش لباس اور مکان کی طرح وہ بھی زندگی کا ایک جزو ہیں۔ اگر کوئی شخص ملازمت کا متلاشی ہے تو وہ اخبار میں اشتہار دیدیتا ہے۔ اگر کسی کو مکان چاہیئے تو وہ یہ شائع کرا دیتا ہے کہ اُسے اس قسم کے اتنے کمروں کی ضرورت ہے۔ فوراً خطوط آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو اپنا مکان یا اسکا کوئی حصّہ کرایہ پر چڑھانا منظور ہوتا ہے تو وہ بھی اخبار کی پناہ لیتا ہے۔ Moore [unclear] وغیرہ کئی اخبارات لنڈن سے اس قسم کے شائع ہوتے ہیں جن کا واحد مقصد کرایہ پر مکانات دلانا ہے۔ تجارت پیشہ اصحاب کے مزدوروں کے بچّوں کے بیسیوں اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ بہت سے اخبارات اور رسائل ایسے بھی ہیں جو صرف گھوڑوں۔ گھڑدوڑ۔ سٹہ اور فیشن سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ لٹریچر۔ آرٹ۔ آثارِ قدیمہ۔ صنعت وحرفت۔ زراعت اور بالخصوص پالٹکس سے تعلق رکھنے والے اخبارات اور رسالے لندن سے ہزارہا کی تعداد میں نکلتے ہیں۔ "ٹائمز" "ڈیلی نیوز" "مارننگ پوسٹ" "مانچسٹر گارڈین" "ویسٹ منسٹر گزٹ" "ڈیلی میل" وغیرہ وغیرہ بڑے بڑے اخباروں میں بھی عام پبلک کی دلچسپی کے لئے پالٹکس کے علاوہ بہت سا مسالہ ہوتا ہے۔ گھڑدوڑ میں ایک نہایت مشہور انگریزی گھوڑا (پپئے پیرس) ایک امریکن گھوڑے سے ہار گیا۔ دوسرے دن تمام بڑے اخباروں کے لیڈروں میں اس واقعہ کی تنقید ہوئی۔ اسباب کی تحقیقات کی گئی اور دونوں گھوڑوں کی تصویریں اور انکے حالات شائع کئے گئے۔ پہلوانوں کی کشتی۔ آکسفورڈ اور کیمبرج طلبہ کے کرکٹ۔ فٹ بال اور بوٹنگ (کشتی کھینا) تھیئٹر۔ سرکس اور سنیما کے مفصل حالات ہر روز شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُس روز عجائب گھر میں ایک نیا جانور آیا۔ ہر اخبار میں اُسکی تصویر اور اُسکا حال شائع ہوا۔ برٹش میوزیم میں ایک نیا بُت آیا۔ اُسکی مکمل تاریخ خواہ کسی اخبار میں پڑھ لیجئے۔

ہ Times ہ Daily news ہ Morning Post ہ Manchester guardian ہ West minster gazette ہ Daily mail ہ Boating ہ British museum

یہاں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو اخبار کا مطالعہ نہ کرتا ہو۔ کتب خانہ یا ریڈنگ روم کے ایک چوکیدار کا فرض ہوتا ہے کہ طالب علموں و دیگر ناظرین کے کوٹ۔ ٹوپیاں۔ چھتریاں۔ چھڑیاں وغیرہ لے کر رکھے ایک ایک نمبر اُن کو دے دے اور جب وہ واپس جانے لگیں تو وہ نمبر لیکر اُنکی اشیاء اُنکے حوالے کردے شام سویرے وہ یہی کام سرانجام دیا کرتا ہے۔ مگر لوگوں کے آنے جانے کے درمیان میں جو دو دو چار چار یا پانچ پانچ منٹ کا وقفہ ملتا ہے اُس میں وہ بھی اخباربینی کرتا ہے۔ جیسے ہندوستان میں یکے بگھیاں کرایہ پر چلتے ہیں اُسی طرح لندن میں ایک قسم کی موٹر گاڑیاں چلتی ہیں جنہیں Taxi کہتے ہیں۔ یہ سڑکوں پر جابجا مسافروں کا انتظار کیا کرتی ہیں۔ بوقت انتظار ڈرائیور عموماً کسی اخبار پر نگاہ ڈالے ہوئے دکھائی دیگا۔ صبح اور شام کے وقت لاکھوں اشخاص ریلوں پر کام کرنے جاتے یا کام کرکے واپس آتے ہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ریل گاڑیاں چلتی ہیں مگر پھر بھی یہ حال ہے کہ مارے بھیڑ کے بہت سے آدمیوں کو کھڑے کھڑے ہی جانا پڑتا ہے۔ وہ کھڑے کھڑے ہی اخبار پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ تھیٹر۔ بائیسکوپ وغیرہ میں داخل ہونے کے لئے ایک قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اخبار پڑھتے نظر آتے ہیں۔ سڑک صاف کرنے والا جاروب کش بھی اپنا کام ختم کرکے اخبار مول لیتا اور پڑھتا ہوا گھر کو چلا جاتا ہے ۔

لنڈن کے پکاڈلی۔ رجنٹ سٹریٹ۔ کنگسوے۔ ٹاٹنہم کورٹ روڈ وغیرہ وغیرہ بڑے بازاروں سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی گلی میں جی چاہے جہاں تشریف لیجائیے آپ کو سویرے علی الصبح شائع ہونے والے اور شام کو بوقت سہ پہر شائع ہونے والے روزانہ اخبارات کے بڑے بڑے اشتہارات گلے میں لٹکائے اخبار فروش (Newsvendors) ضرور مل جائینگے۔ بعض اوقات آپ دیکھینگے کہ ایک آدمی اشتہار کی ایک تختی گلے میں سے پیٹ پر گھٹنے تک لٹکائے ہوئے ہے اور دوسری تختی سر سے باندھ رکھی ہے تاکہ لوگ پیچھے سے دیکھ سکیں۔ ان تختیوں پر اس قسم کے فقرے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ "بونرلا کی وفات" "جنازے کی تصویریں" "لارڈ ڈگلس ہیگ کی گرفتاری" "معرکہ کا مقدمہ" "گھڑ دوڑ کا نتیجہ" "لاش زمین سے کھود کر نکال لی گئی" "دو آدمی موٹر کے نیچے کچلے گئے" "ریل میں لاش ملی" وغیرہ وغیرہ۔ اشتہارات کو دلکش بنانے کا فن اس ملک میں خوب ترقی پر ہے۔ اس کے سکھانے کے لئے باقاعدہ درسگاہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اشتہار بازی کے بعض نہایت عجیب وغریب طریقے ابھی حال میں ہی ایجاد ہوئے ہیں۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ہم ایک مثال

پیش کرتے ہیں:۔

لندن کی سڑکوں کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے چوڑے چوڑے رستے بنے ہوئے ہیں مگر بیچ سڑک پر دونوں طرف سے آنے جانے والی موٹر گاڑیوں کی اس قدر بھرمار رہتی ہے کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے سڑک پار کر کے جانا بعض اوقات نہایت مشکل ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بازاروں کے چوراہوں پر پانچ پانچ دس دس منٹ کھڑے رہ کر انتظار کرنا پڑتا ہے کہ پولسمین انگلی اُٹھا کر گاڑیاں روک دے اور ہمیں چوک پار کر لینے دے۔ پولسمین جس خوبی سے موٹروں کا آگے بڑھنا روکتا اور پھر انہیں چلاتا ہے اُسکی مناسب تعریف کرنا ناممکن ہے۔ وہ اُن چیزوں میں سے ہے جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں تاہم بھیڑ بھڑکے میں لوگ کچلے ہی جاتے ہیں۔ بہت سے باہمت جوان بڑے بڑے بازاروں میں بائیسکلوں پر چڑھتے اور کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔ بعض لوگ کھڑے کھڑے انتظار کرنے سے تنگ آ کر دوڑتی ہوئی گاڑیوں کے بیچ سے چھلانگ مار کر پار ہونے کی کوشش کرتے اور لڑکھڑا کر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ گاڑیاں ہانکنے والے بالعموم نہایت ہوشیار ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے تھوڑے دن ہوئے ایک ڈرائیور موٹر پر بغل کی سڑک کا نام پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسکی موٹر کار نے جو حرکت میں تھی ایک راہگیر کا خون کر ڈالا۔ لندن میں دو تین آدمی روز ہی گاڑیوں کے تلے دب کر اپنی جانیں گنوا بیٹھتے ہیں۔ قدرتی طور پر عوام کو یہ فکر دامنگیر رہا کرتی ہے کہ اگر ہم بھی کسی روز اسی طرح گاڑی تلے کچلے جا کر مر گئے تو پسماندگان کے گذارے کی کیا صورت ہوگی "ڈیلی میل"[1] اخبار جواب دیتا ہے "کچھ فکر نہ کرو۔ ہر روز ڈیلی میل خرید کر پڑھو۔ ڈیلی میل کے خریداروں میں اپنا نام درج کرا لو۔ اگر کوئی خریدار کچلا جائیگا تو بطور اُسکے بیمۂ زندگی کے دس پانچ ہزار روپے اُسکے گھر والوں کو ہم دے دینگے۔ بیمہ کی فیس کے طور پر ایک پیسہ بھی ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈیلی میل کا خرید لینا ہی بیمہ ہے یعنی مفت میں زندگی کا بیمہ ہو جاتا ہے" اور یہ زبانی جمع خرچ ہی نہیں ہے۔ ڈیلی میل کے جو خریدار دب کر مر جاتے ہیں اُنکے پسماندگان کو ضرور روپیہ دیا جاتا ہے۔ اس کام میں ڈیلی میل کا بہت سا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ لیکن اس سے اسکو جو شہرت حاصل ہوئی ہے اُس سے آمدنی بھی بہت بڑھ گئی اور سارا خرچ نکل آیا ہے۔ اسی طرح دیگر بڑے بڑے اخبار ہوائی جہاز کے ذریعہ ہزاروں میل کا سفر کرنے والوں کو بیسیوں میل تیرنے والوں کو اور ایسے ہی

[1] Daily mail

غیر معمولی کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں کو گرانبہا انعامات پیش کرتے ہیں۔ انعام کی شہرت دُور دُور تک پھیل کر اخبار کے خریداروں کی تعداد اور اس میں شائع ہونے والے اشتہارات کے ذریعہ ہونے والی آمدنی میں معقول اضافہ کر دیتی ہے۔ اخباروں کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ سارے کے سارے میدانِ تجارت میں اشتہار ایک آرٹ ہے۔ ایک سائنس ہے۔ جس پر صدہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جس کی باقاعدہ طور پر تعلیم دیجاتی ہے اور جس کے کمال کا اندازہ یورپ میں رہنے ہی سے لگایا جا سکتا ہے ؂

ہم ایک معمولی مثال پیش کرینگے۔ فاؤنٹین[1] پین ایک قسم کا قلم ہوتا ہے جس میں سیاہی بھر لی جاتی ہے اور جس کا رواج ہمارے ملک میں بھی بہت ہے۔ لندن میں فاؤنٹین پین فروخت کرنے والی کئی دوکانیں ہیں۔ جہاں جو چاہے جا کر اپنے قلم میں مفت سیاہی بھروا سکتا ہے۔ جن کے پاس فاؤنٹین قلم ہیں اُن کو یہاں سیاہی خریدنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوکاندار روزمرّہ بہت سی سیاہی مفت تقسیم کرتا ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اگر آپکے قلم میں کوئی معمولی نقص ہو جائے تو اُسے بھی بلا اُجرت رفع کر دیتا ہے۔ سیاہی بھرنے اور مرمت کرنے کے لئے وہ کئی آدمی ملازم رکھتا ہے۔ اُسے اس امر کا یقین ہے کہ دکان پر آنے والوں کو جب کبھی قلم کی ضرورت ہوگی وہ میرے ہی یہاں سے خریدینگے سب گھاٹا پورا ہو جائیگا۔ فنِ اشتہار بازی" کے متعلق مفصل حالات کبھی آئندہ بیان کرینگے۔ یہاں ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کر دینا ہے کہ اشتہاروں کے ذریعہ اخباروں کے خریداروں کی تعداد خوب بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ڈیلی مرّر[2] کی ہر روز دس لاکھ سے زیادہ کاپیاں چھپتی ہیں اور ڈیلی سکیچ[3] (باتصویر) اور "ڈیلی گرافک[4]" کی تقریباً دس لاکھ۔ ڈیلی میل کے خریداروں کی تعداد بیس لاکھ تک پہنچتی ہے ہفتہ وار اخباروں میں "سنڈے[5] پکٹوریل (باتصویر) کی اشاعت تیئس لاکھ تریسٹھ ہزار سے بھی زیادہ ہے اور نیوز[6] آف دی ورلڈ" کی اشاعت تو تیس لاکھ سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اخبار چار چار صفحے کے نہیں ہوتے کئی روزانہ اخبار چالیس چالیس اور چھپن چھپن بڑے بڑے صفحوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب کبھی کسی کو ردّی کاغذ کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اخبار خرید لیتا ہے۔ خبروں کی خبریں اور ڈھیر کے ڈھیر کاغذ

---

1. Fountain Pen. 2. Daily mirror. 3. Daily Sketch. 4. Daily grophic.
5. Sundy pictorial. 6. news of the world.

مفت میں کئی ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے تو پوری کتابیں ہوتی ہیں۔ اس قدر کاغذ۔ اتنے ٹائپ مشینوں وغیرہ کا جوڑنا اور انتظام کرنا معمولی کام نہیں ہے۔ بعض اخباروں نے امریکہ کے جزیرہ نیو فونڈلینڈ[1] میں جنگل خرید کر کارخانے قائم کر رکھے ہیں۔ جنگلوں سے چھال لا کر کارخانوں میں کروڑ ہا من کاغذ تیار ہوا کرتا ہے باہر سے کچھ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس روز ہم نے "ٹائمز" کے مطبع میں دیکھا کہ آجکل ایسی مشینیں کام کرتی ہیں جن میں ایک ساتھ ہی ٹائپ ڈھلتا اور کمپوزنگ[2] ہوتا ہے۔ مشین پر لگے ہوئے ایک حرف پر آپ نے انگلی رکھی کہ پرزے پر پرزے گھومنے لگے اور مشین کے ساتھ لگی ہوئی گرم سیسے کی ناند میں سے ذرا سا سیسہ اٹھ کر اس حرف کا ٹائپ بن گیا۔ ایک اور پیچ دبایا کہ فوراً ہی وہ حرف ادھر ادھر چکر کاٹتا ہوا تختے پر آ جا۔ مضمون سامنے رکھکر پیچ دباتے جائیے۔ بس آپ سے آپ ہی اسی وقت ٹائپ بھی بن جائیگا۔ خشک بھی ہو جائیگا اور اپنی جگہ پر جا بھی بیٹھیگا۔ جب ایک یا دو پیراگراف[3] کمپوز ہو چکے تو ایک اور پیچ دبا دیجئے کمپوز کیا ہوا ٹائپ مشین سے نکل آئیگا۔ اسی طرح ایک صفحہ ختم ہو جانے پر کاغذ کے ایک موٹے تختے پر سارا مضمون ابھارا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے سیسے کے نیم دائروں پر وہ مضمون ابھارا جاتا ہے۔ اس پر سے جس قدر ضرورت ہو کاپیاں اتار لیجئے ایک گھنٹے میں باون ۵۲ ہزار تک کاپیاں چھاپی جا سکتی ہیں۔ جونہی طباعت کا کام ختم ہوا سارا ٹائپ مشین کے ذریعہ پھر گلا دیا جاتا ہے۔ اس نہایت مختصر بیان میں بھی دیر لگ رہی ہے "ٹائمز" کے چھاپہ خانہ میں ہم نے دیکھا کہ بجلی کی طرح تیزی سے سارا کام ہوتا ہے۔

"ٹائمز" کا مطبع ایک پورا محلے کا محلہ معلوم ہوتا ہے۔ کئی ہزار آدمی ملازم ہیں۔ ان ملازموں کی انجمنیں ہیں۔ کرکٹ۔ فٹ بال وغیرہ کھیل کھیلنے کی ٹیمیں ہیں۔ ناچنے گانے کی پارٹیاں ہیں۔ کارخانہ کے احاطہ میں ہی ان کا ڈائننگ ہال Dining Hall ہے۔ پروف ریڈروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے ایڈیٹر بیسیوں ہیں جنکے سپرد الگ الگ محکمے ہیں۔ مثلاً پارلیمنٹ۔ اقتصادیات۔ مالیات۔ فرانس۔ جرمنی روس۔ ہندوستان وغیرہ ممالک اور گھوڑ دوڑ۔ لٹریچر۔ نرخنامہ بازار وغیرہ وغیرہ۔ "ٹائمز" کا ایڈیٹر ان چیف[4] کبھی ایک لفظ بھی اپنے قلم سے نہیں لکھتا۔ اس کا کام ہر روز کچھ نائب ایڈیٹروں کو بلا کر یہ بتا دینا ہے

1. New found land 2. Composing 3. Paragraph
4. Editor-in-chief.

کہ فلاں فلاں مبحث یا مضمون پر Leadcrettes لکھے جائیں اور اس طرح لکھے جائیں۔ بس یہیں پر ایڈیٹر صاحب کے فرائض کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر یہ کام اس قدر اہم خیال کیا جاتا ہے کہ ٹائمز کے ایڈیٹر کی تنخواہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے برابر ہے اور پولٹیکل حلقوں میں بھی اس کی عزت اور وقار کسی سے کم نہیں۔ نائب ایڈیٹروں کے علاوہ بہت سے نامہ نگار ہیں جو پارلیمنٹ کی۔ شہر کی۔ بازار کی۔ انگلستان کی۔ یورپ کی اور کل دنیا کی خبریں مہیا کیا کرتے ہیں۔ خبریں اس قدر جلد شائع ہو جاتی ہیں کہ بسا اوقات انسان کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ ایک روز ایک بجے کے وقت میں سابق وزیر اعظم بونرلا کا جنازہ دیکھ کر آیا۔ ابھی شائید دو تین گھنٹے بھی نہیں گذرنے پائے ہونگے کہ شام کے اخباروں میں جنازے کا تفصیل وار حال اور تصاویر درج دیکھیں۔ جنازہ کی گاڑی۔ مرحوم پر چڑھائے ہوئے پھولوں اور ہاروں سے لدی ہوئی پانچ موٹر گاڑیاں۔ اِدھر اُدھر بونرلا کے (پیدل جاتے ہوئے) بیٹے۔ پیچھے پیچھے موٹر کاروں پر عزیز و اقربا دوست احباب۔ پولٹیکل لیڈر۔ سڑک کے دونوں طرف دس دس پندرہ پندرہ گز کے فاصلے پر کھڑے ہوئے پولیس کے سپاہی۔ اُن کے پیچھے ٹوپیاں اُتارے ہوئے پبلک کی بھیڑ۔ یہ نظارہ گویا پھر آنکھوں کے آگے سے گذر گیا۔ ویسٹ منسٹر گرجا کے قریب ولیعہد شہزادہ پرنس آف ویلز۔ سابق وزیر اعظم مسٹر اسکوتھ۔ مسٹر بالڈون اور اُن کے مخالف لیڈر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو جس طرح میں نے جنازہ کے پاس جاتے دیکھا تھا اسی طرح تصویر میں دیکھا +

نامہ نگاروں کے علاوہ ایک کثیر تعداد ایسے مضمون نگاروں کی بھی ہوتی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً لکھا کرتے ہیں۔ انگلستان میں بڑے بڑے پولیٹیشین۔ نامور مصنف۔ پادری۔ پروفیسر۔ تا ایل طالب علم تک سبھی لوگ اخباروں کے لئے لکھ کر روپیہ کماتے ہیں۔ "ٹائمز" جیسے اخبار عام مضمون نگاروں کو پچاس ساٹھ روپے فی کالم اور مستند استادانِ فن کو پانچ پانچ چھ چھ ہزار روپے فی کالم یعنے تقریباً تیس ہزار روپیہ فی صفحہ کے حساب سے پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اعداد پر یقین کیا جانا مشکل ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس ملک میں پورا پورا معاوضہ ملے بغیر ہرگز کوئی کچھ نہیں لکھتا۔ اگر آپ یہاں کسی سے مفت لکھنے کو کہیں تو وہ یہی خیال کریگا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں۔ مسٹر اسکوتھ۔ مسٹر لائڈ جارج۔ مسٹر ونسٹن چرچل وغیرہ بڑے آدمی اپنی اپنی اعلےٰ پوزیشن کے مطابق

---

۱؎ Free Lance Journalists

زیادہ سے زیادہ معاوضہ لیتے ہیں۔ اخبارات کے پاس روپیہ بھی اس قدر ہے کہ وہ بآسانی تمام ہزارہا روپیہ بطور معاوضہ پیش کرسکتے ہیں مثلاً Associated newspapers Ltd. کمپنی کا سرمایہ ڈھائی کروڑ روپیہ ہے۔ آمدنی اس قدر ہے کہ مندرجہ ذیل سالوں میں حصہ داروں کو اس طرح منافع تقسیم کیا گیا

| سال | منافع فیصدی |
| --- | --- |
| ۱۹۰۶ء | ۸ |
| ۱۹۰۷-۱۰ء | ۱۰ |
| ۱۹۱۱-۱۳ء | ۱۲ |
| ۱۹۱۴ء | ۱۷ |
| ۱۹۱۵ء | ۱۲ |
| ۱۹۱۶ء | ۱۲ |
| ۱۹۱۷ء | ۱۵ |
| ۱۹۱۸-۲۰ء | ۲۰ |

علاوہ ازیں ماہ مئی ۱۹۲۰ء میں تقریباً چالیس لاکھ روپے حصہ داروں میں یونہی تقسیم کردئے گئے

رام سروپ کوشل

---

## غزل

وہ آنکھ ہے یا انجمن ناز و ادا ہے
ہر گوشہ نمایش گہہ سامانِ قضا ہے

اب نبض میں کیا رکھا ہے اب سانس میں کیا ہے؟
دم بھر کے لئے اور یہ دنیا کی ہوا ہے

آئی جو طبیعت تو یہ کہتی ہوئی آئی
آنا میرا منجملہ سامان قضا ہے

غم پروریٔ ضبط محبت سے ہے ظاہر
دنیائے محبت ادب آموز فنا ہے

اس درد کے بیمار پہ اللہ کرے رحم
جسکے لئے دنیا میں دوا ہے نہ دعا ہے

آبر قدوائی

# مطالعۂ کُتب

چونکہ ہر شخص کی مزاجی کیفیت جداگانہ ہے۔ اس لئے انتخاب کتب بھی مذاق طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مذاق کی تربیت میں زیادہ تر اپنی فطری مزاجی حالت کا حصہ ہوتا ہے لیکن گردوپیش تعلیم تربیت اور خانگی حالات کے اثرات کا بھی بہت کچھ شمول ہوتا ہے۔ اول تو انسان کی زندگی ہی نہایت مختصر ہے۔ پھر اسکے دیگر افکار و اشغال اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن سے اتنی فرصت ملنا بھی دشوار ہے کہ انسان اپنی تفریح یا علویت نفس کے لئے مطالعہ کتب سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ جنکو اکتساب محاسن کی طرف سے فراغت نصیب ہے اور جو شائقین علم ہیں یا وہ جو اپنی زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر چکے ہیں وہی کچھ اپنا وقت اس میں صرف کر سکتے ہیں ورنہ اکثر لوگ باوجود علمی و ادبی شوق کے دنیا کے ہنگاموں اور ضرورتوں میں محو ہو کر ہمیشہ کے لئے اس سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ علمی شوق اور انتخاب کتب کا ذوق سلیم ابتدائے عمر ہی میں دلنشین و مستحکم ہو جاتا ہے کیونکہ اسی زمانہ میں تخیلات و جذبات کی پرورش ہوتی ہے اور پھر انہی کے تاثرات سے انسان کا مستقبل بنتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں عملی زندگی سے بے فکری اور آزادی میسّر ہوتی ہے۔ اس لئے تمام احساسات لطیفہ اور جذبات عالیہ پیدا ہونیکی دل میں صلاحیت ہوتی ہے اور دل و دماغ کی تازگی ہر اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اسلئے اس زمانہ میں انتخاب علوم میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ والدین و معلمین کے اوپر اسکی نگہداشت رکھنا پہلا فرض ہے۔

اپنے نفس کے آزادانہ تہذیب و تربیت کے لئے مشاہدہ فطرت۔ غور و فکر اور احساسات کے زندہ کرنے کی از حد ضرورت ہے۔ جس مصنف میں اتنی قدرت نہ ہو کہ پڑھنے والے کو اپنے انداز تحریر سے اپنے جذبات و اعتقادات میں اس قدر محو کر سکے کہ اسکو اپنی موجودہ حالت کی خبر نہ رہے اُس مُصنّف کی تصانیف کا پڑھنا قطعی لاحاصل اور تضیع اوقات ہے۔ مطالعہ کتب سے پہلے کتب بینی کا سلیقہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یوں چاہے انسان علمی معلومات و لغات کا عالم متبحر ہی کیوں نہ بن جائے لیکن بغیر اس سلیقہ کے وہ لطافت جذبات، نزاکت مشاہدہ، اور علویت خیالات سے

ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ اسکے احساسات و واردات قلبیہ میں کبھی نزہت و ندرت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا علم محض سطحی ہوتا ہے اور اسکا مطمح نظر نہایت پست۔ وہ ان لذات سے ہمیشہ بے نصیب رہتا ہے جو دریافت حقائق سے حاصل ہوتی ہیں۔ مطالعہ کتب کے وقت پہلی چیز جو ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اس سے ہمکو کیا روحانی و اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے اور اس سے ہمارے دل و دماغ کہانتک متاثر ہوتے ہیں جو کتاب یا تحریر ہمارے دل میں کسی شریف جذبہ یا تخیل کی تحریک پیدا نہ کرسکے اسکا تلف کردینا بہتر ہے اور جس نظم یا شعر سے دل میں انبساطی و وجدانی کیفیت طاری نہ ہو اسکو فراموش کردینا ہی مناسب ہے۔ تمام علوم کا مقصد یہی ہے کہ اُن سے ایسے احساسات پیدا ہوں جو خدا کی محبت اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور تمام مخلوقات کے ساتھ تعلق پیدا کرنے میں معاون ہو سکیں اور انسان میں خودداری اور عالی ہمتی پیدا کرسکیں جس علم سے ہمکو یہ بات حاصل نہ ہو کہ ہم اپنے برگشتہ ایام میں یا ضروریات زندگی کی دشواریوں میں۔ یا دنیاوی حادثات و سانحات میں ثابت قدم رہ سکیں۔ ہم میں صبر و شکر کی عادت پیدا ہو ہم میں صلاحیت و انسانیت کے جذبات کی نشو و نما ہو۔ اپنے ابنائے جنس کی محبت اور معرفت ایزدی حاصل ہو۔ تو ایسے علم کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ بہترین خیالات پیدا کرنیکی کوشش کرے اور انکو پاکیزہ اعمال و افعال سے آراستہ رکھے۔ اس سے بدتر اور ذلیل جرم دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا کہ انسان پاکیزہ خیالات کا تو اظہار کرے لیکن خود لغویات اور بیہودگیوں میں مبتلا رہے۔ علم حاصل کرنیکا مقصد یہی ہے کہ نفس میں پاکیزگی اور صفائی پیدا ہو۔ اور روحانی و اخلاقی ترقیاں مترتب ہوں ورنہ اس سے تو جاہل ہی رہنا بہتر ہے کیونکہ ایک نااہل کے پاس علم کا ہونا حد درجہ مضرت رساں اور خطرناک چیز ہے۔ ایک ہی شعبہ علم میں کمال حاصل کرنا یا مختلف علوم میں واقفیت پیدا کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جسکا تعلق زیادہ تر مختلف حالات و مناسبت طبیعت سے ہے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جہانتک ہوسکے انسان کو ہر ضروری علم میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہونا چاہیئے جو اسکی معاشرتی و اخلاقی زندگی میں دستور العمل ہوسکے اور اسکے تجربات و عقل و فراست کی تہذیب و کشادگی کا باعث ہو +

محمد عبدالحی صدیقی
بی۔ اے (علیگ)

---

# شامِ غم

گلشن میں صورتِ گلِ خنداں ہوئی اداس  رنگت میں دلکشی، نہ نزاکت، نہ بو، نہ باس
ظلمت کی چھا گئی ہیں گھٹائیں جو آس پاس  ہر مرغِ آشیاں میں ہے تصویرِ درد و یاس
تیرِ شعاعِ مہر جو ڈوبے لہو میں ہیں
زیرِ فلک نہ آئیں سب اس جستجو میں ہیں

پیدا ہے چرخِ پیر سے نیرنگیٔ سراب  ظاہر کہاں شفق میں ہے انجم کی آب و تاب
دریائے خوں میں ڈوب رہا ہے جو آفتاب  ظاہر مثالِ دیدۂ پُرخوں ہوئے حباب
مشکل کشائی کرتا ہے ناخن ہلال کا
کھلتا کسی طرح نہیں عقدہ ملال کا

گلشن میں جو ثمر ہے وہ سہما ہوا سا ہے  جنگل میں جو شجر ہے وہ سہما ہوا سا ہے
دریا میں جو گہر ہے وہ سہما ہوا سا ہے  عالم میں جو بشر ہے وہ سہما ہوا سا ہے
ہر چشمِ اشکبار میں حیرت بلا کی ہے
خوبی صدف کی شیشہ میں قدرت خدا کی ہے

خالِ جبین و زلفِ چلیپا سیاہ ہیں  اور مردمانِ دیدۂ بینا سیاہ ہیں
روزِ ازل سے ہم نے یہ مانا سیاہ ہیں  لیکن یہ کیا کہ کعبہ و سینا سیاہ ہیں
تقصیر اس میں کچھ نہیں اپنی نگاہ کی
اس تیرگیٔ بخت نے دنیا سیاہ کی

روتی ہے شمعِ بزم مگر اس میں جاں نہیں  پروانہ جاندار ہے پر خونفشاں نہیں
آشفتہ سر ہے گل مگر اس کی زباں نہیں  بلبل ہے نوحہ سنج مگر خوش بیاں نہیں
شیون کا طور میرے نرالا جہاں سے ہے
تاثیر میرے عشق میں طرزِ بیاں سے ہے

(محمود اسرائیلی)

وہ سبزہ زار، وہ چراگاہیں، جہاں ہم نے اکثر پر کیف شامیں گذاری ہیں اب میرے لئے کرب آفرین مناظر سے تبدیل ہو گئے ہیں۔ زندگی خود ایک بار معلوم ہوتی ہے۔ خدا تمہیں ہمیشہ شاداں و فرحاں، خوش و خرم رکھے، مگر میری تم سے التجا ہے کہ تم یہ بات فراموش کر دینا، بھول جانا کہ "طیوسوداٴیس" کے نام کا کوئی شخص بھی کبھی دنیا میں تھا!"

یہ خط قسطنطیا کو پہنچا دیا گیا جو اسے دیکھتے ہی تھوڑی دیر کے لئے بیگانۂ ہوش ہو گئی، لیکن دوسری صبح تو اس کے لئے اور بھی دردناک اور الم افزا تھی۔ وہ تمام خدشات جو قسطنطیا کے دل میں طیوسوداٴیس کے خط نے پیدا کر دئے تھے۔ مکمل ہو گئے۔ کیونکہ کئی آدمی یکے بعد دیگرے، نہایت پریشانی کی حالت میں طیوسوداٴیس کے متعلق دریافت کرنے آئے، جو نصف شب سے مفقود ہو گیا تھا۔ وہ اضمحلال و وارفتگی کی کیفیت جو طیوسوداٴیس پر طاری تھی، اسکے عزیزوں کو مخوف کئے دیرہی تھی، اور انہیں ہر اُس خرابی کا، جو وہ اپنے اوپر لا سکتا تھا، تیقن کے ساتھ اندیشہ تھا۔

قسطنطیا کے رنج و غم کی اب کوئی انتہا نہ تھی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی، وہ اچھی طرح واقف تھی۔ کہ طیوسوداٴیس پر تباہی لانے کی وجہ، اسکی خبر عقد کے سوا، اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس نے معاملۂ نکاح میں سکوت اختیار کرنے پر اپنے تئیں بد ترین مجرم دگنہگار ہستی تصور کیا اور اپنے باپ کے تجویز کردہ شوہر کو طیوسوداٴیس کا قاتل! اس گناہ کا کفارہ اس خون کا قصاص، جو کچھ وہ دے سکتی تھی، یہ تھا کہ اس نے اپنے قلب میں یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ اپنے باپ کے غیظ و غضب سے متصادم ہوئے گی اس کے سخت و سُست الفاظ کو برداشت کریگی، لیکن وہ اس نکاح سے قطعاً انکار کر دیگی! نہیں کریگی!! جسکے متعلق اسکا خیال تھا کہ اس سے زیادہ مجرمانہ اور آلودۂ گناہ نسبت، شائد ہی اس وقت تک کوئی ہوئی ہو۔ لیکن اسکا اپنے باپ کی ناراضگی کا خطرہ بیکار تھا کیونکہ اسکے باپ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ "ایسے طیوسوداٴیس سے قطعی نجات ملی" اسکے انکار نکاح کو زیادہ اہمیت نہ دی!

اب قسطنطیا کے لئے اسکے سوا کوئی شغل نہ تھا کہ وہ شبانہ روز یاد الٰہی میں منہمک رہے اور ریاضت و عبادت کے لئے ہمہ تن وقف ہو جائے۔ دن رات میں شائد ہی اسکا کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہو گا جو اپنے لئے طلب عفو اور طیوسوداٴیس کے بخشایش کی دعاؤں سے معمور نہ گذرتا ہو۔ جس کا نتیجۂ صریح یہ تھا کہ قلیل عرصہ ہی میں اسکے شدت و اضطراب میں تخفیف اور اُسکی پریشانی میں ایک

افسردہ اطمینان پیدا ہوگیا۔ رفتہ رفتہ وہ استغراق و محویت کے اس نقطہ پر پہنچ گئی، جو دنیوی اور خانگی زندگی کے لئے غیر موزوں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی باقیماندہ زندگی کو کسی خانقاہ کے گوشۂ خمول میں بسر کرنیکا تہیہ کر لیا۔ اسکے باپ نے بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ اس سے اسکے اخراجات میں تخفیف ہوگی قسطنطنیا کے اس عزم کی مخالفت نہ کی۔ چنانچہ بیسویں سال جبکہ اس کا آفتاب حسن و شباب عین نصف النہار پر تھا، وہ اُسے پاس کے گاؤں کی ایک مختصر سی خانقاہ میں پہنچا آیا۔

اس خانقاہ میں ایک راہب اپنے تقدس ونزاہت اور زہد و ریاضت کے باعث بہت مشہور تھا اور جیسا کہ روم کے کلیساؤں میں عام قاعدہ ہے کہ وہ لوگ جو کسی دلی مصیبت اور قلبی اذیت میں گرفتار ہوں، اپنی طمانیت قلب اور معافی گناہ کے لئے کسی راہب کے سامنے اعتراف معاصی کریں۔ لہذا اس حسین و جدید "کنیز مسیح" کے لئے بھی یہی لازمی تھا۔ چنانچہ حسن اتفاق سے قسطنطنیا کو اسی مشہور و مقدس راہب کے سامنے اقرار کرنا تھا۔

اب ہمیں طیوسودائیس کا کچھ حال تحریر کرنا چاہیئے، جو اسی صبح جبکہ اسکی تفتیش ہو رہی تھی، اسی خانقاہ میں جہاں اب قسطنطنیا ہے، وارد ہوا، اور عہد کر لیا کہ وہ اب مدت العمر راہبانہ زندگی بسر کریگا اور قسطنطنیا کو اپنے دل سے بھلا دیگا، جسکے لئے وہ سمجھتا تھا کہ اسی روز جبکہ وہ وہاں سے فرار ہوا، اسکا نکاح ہوگیا ہوگا باوجود نوعمر و نوجوان ہونے کے اپنی فطری قابلیت ولیاقت اور علوم دینیہ میں ماہر کامل ہونے کی وجہ سے وہ رہبانیت کے عہدہ پر سرفراز کر دیا گیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے اپنی فرشتہ سیرتی اور ملائک صفاتی سے متعلقین خانقاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ گاؤں میں بھی اپنے درویشانہ اقوال و اعمال کے باعث بہت ہی مشہور و محبوب تھا۔ یہی وہ مقدس راہب تھا جس کے سامنے قسطنطنیا کو اقبال نواہی کرنا تھا۔ ہر دلعزیز و نیک نہاد طیوسودائیس نے اب اپنا نام بدل کر فرانسس رکھ لیا تھا اور مذہبی خصائل، دراز ریش اور محلوق الراس ہونے کے باعث وہ اس قدر بدل گیا تھا کہ کسی کا اسے پہچان سکنا تقریباً محال تھا۔

دوسری صبح "اطاق اعتراف" میں راہب فرانسس کے سامنے قسطنطنیا، ایک پیکر حسرت! ایک مجسمۂ غم بن کر دوزانو ہوئی اور اپنے ناقابل بیان حسیات روح اور تمامتر رازِ جذبات قلب کو، اسکے سامنے عریان و بے نقاب کر دیا۔ اپنی اس حد زندگی کے حالات بیان کرنیکے بعد، جو یکسر غیر آلودۂ معصیت تھی، وہ بآواز بلند بیقرار اور بے چین ہو کر رو ئی اور اس افسانۂ الم کو شروع کیا جس میں وہ (بدانست خود)

بدترین جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ "میرا طرز عمل" اس نے آخر میں کہا "مجھے خوف ہے کہ اسکے لئے باعث مرگ ہُوا، جسکا جرم اسکے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ مجھے چاہتا تھا، مجھ سے حد درجہ محبت کرتا تھا۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مجھے کتنا پیارا، کس قدر محبوب تھا اور کس درجہ دل کو مشبک کر دینے والی اسکی یاد میرے قلب میں ہے، جب سے کہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گیا"

وہ یہاں ٹھیری اور اپنی خونفشاں، رحم طلب آنکھیں مقدس راہب کے جانب اٹھائیں جو اس کے فسانہ غم سے اس قدر متاثر و مغموم تھا کہ بدقت تمام اپنی آواز کو قابو میں رکھ سکا جو بہت جلد ایک گریۂ دلخراش ایک نالۂ جانگداز میں بدل جانے والی تھی۔ راہب نے اشارۂ دست سے تسلسل بیان کی فرمائش کی قسطنطنیا نے تعمیل کرتے ہُوئے، ایک طغیان اشک، ایک سیلاب دمع۔ کے ساتھ اپنا کلیجا اسکے سامنے نکال کر رکھ دیا۔ راہب کے لئے اب ضبط گریہ دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ یہانتک کہ اسکی سبکیوں اور بدن کی کپکپی کی وجہ سے کرسی بھی حالت اہتزاز میں تھی۔ قسطنطنیا یہ سمجھ کر کہ مقدس آدمی اپنے فطری ترحم اور جبلی نیکدلی سے اسکی داستانِ گناہ سے اس قدر اثر پذیر ہُوا ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہُوئے کہ اس کا گناہ سخت کبیرہ ہے، حد درجہ مخوف ہُوئی اور انتہائے پشیمانی و ندامت کے ساتھ راہب کو "سوگند دوشیزگی" کی رسم کی یاددہانی کے واسطے جسے وہ آج ادا کرنے والی تھی آگے بڑھی۔ جس کے متعلق اس نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے بہتر اسکے معاصی کا کفارہ نہیں ہو سکتا اور یہ تنہا ایثار ہے جو وہ طیوسوڈائیس کی یاد میں کر سکتی ہے۔ راہب جس نے اپنی حالت ابتک بہت کچھ درست کر لی تھی، وہ نام سُن کر جس سے پکارے جانے سے وہ مدتوں سے محروم کر دیا گیا تھا اور یہ بیمثل لمحۂ وفا ایک ایسی ہستی سے حاصل کر کے جسکی محبت سے وہ مشکوک و بدگمان ہو کر اسے فراموش کر دینے کا عہد کر چکا تھا، پھر بیقرار ہو کر رو دیا۔ ان سے الم افزا حالات کے درمیان، جو کچھ وہ کر سکتا تھا، یہ تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اسکی دلجمعی کرے، اور اسے تسلی دے کہ اس کا گناہ جتنا وہ سمجھے ہُوئے ہے اتنا عظیم نہیں اور یہ کہ وہ اپنے تئیں حد سے زیادہ متالم نہ بنائے اختتام بیان کے بعد راہب نے اپنے حواس مجتمع کئے اور اسکو یقین مغفرت اور تیقن بخشایش دلاتے ہُوئے دوسرے دن بلایا کہ وہ کل اسکے عہد مقدس اور جدید زندگی کے طرز عمل کے متعلق ایک سودمند اور فائدہ بخش وعظ دیگا +

دوسری صبح راہب نے رسم تعہد کے بعد اپنے لطیف خیالات قلب کو، اپنی تائبہ جمیل

پر منعکس کر کے، اسکے دل سے تمام خوف اور مغالطات کو محو کر دیا۔" قواعد کلیسا" اس نے بعد میں کہا " گو ہمیں باہم ملنے کی اجازت نہیں دیتے۔ لیکن تم باور کرو کہ میں تمہیں نہ صرف اپنی دعاؤں میں یاد رکھونگا بلکہ ضروری ہدایات اور نصائح سے بھی بذریعۂ تحریر مطلع کرتا رہونگا۔ نہایت خوشی اور شادمانی۔ بے ہراسی اور خندہ پیشانی سے، اس شاہراہ پاک پر جو تم نے اختیار کی ہے گامزن رہو! اور بہت جلد تمہیں وہ آرام و اطمینان، سکون و آسایش حاصل ہوگی، جسکے دینے سے دنیا قاطبتہً عاری ہے"

بعد فراغ، راہبۂ کلیسا، قسطنطنیا کو لے گئی اور وہ حجرہ بتادیا جہاں قسطنطنیا کو بقیہ زندگی بسر کرنی تھی۔ یہ راہبہ اس تمام راز سے جو نو وارد اور راہب میں تھا آگاہ کر دی گئی تھی اور شام کو یہ خط اس نے قسطنطنیا کو لاکر دیا:

"اس حیات مبارک کا جس میں تم داخل ہوئی ہو، اولیں ثمر شیریں جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں یہ ہے۔ کہ طیوسودائیس جسکی موت تمہارے لئے ایک صدمہ جانگسل ہے، ابھی بقید حیات ہے، اور وہ راہب جسکے سامنے تم نے اظہار گناہ کیا، وہی کسی زمانہ میں طیوسودائیس تھا۔ جسکے لئے تم اسقدر مغموم و متالم ہو خدائے برتر نے ہماری تمنائیں کامیاب کر دیں، گو ہماری خواہش کے مطابق نہیں! لیکن یقین جانو کہ وہ محبت جو ہمیں ایک دوسرے سے تھی، بہ نسبت اپنی کامرانی کے، اپنی مایوسی میں زیادہ سامان انبساط رکھتی ہے اپنے طیوسودائیس کو تم اب بھی مردہ تصور کرو اور اپنے دل میں مطمئن رہو کہ وہ شخص جو تمہارے لئے اپنا سلسلۂ ادعیہ منقطع نہ کریگا اس کا نام فرانسس ہے"

قسطنطنیا نے دیکھا، سواد خط، مضمون تحریر، سے متفق ہے، اور پھر اس شخص کی آواز اسکی بکائے وافر، اسکی افراط زاری یاد کر کے جسکے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اسے کامل یقین ہوگیا "یہ کافی ہے" گریۂ مسرت کے بعد اس نے کہا " کہ طیوسودائیس ابھی زندہ ہے۔ میں اب اطمینان سے زندہ رہونگی اور سکون کے ساتھ مرونگی" ——— قسطنطنیا کو راہبانہ زندگی میں داخل ہوئے دس برس ہوئے تھے کہ گاؤں میں ایک خوفناک وبا پھیلی، جس نے گاؤں کی ایک معتدبہ آبادی کو شہر خموشاں میں سلادیا۔ مرنے والوں میں ایک طیوسودائیس بھی تھا۔ اس نے اپنے بستر علالت پر سے نہایت مؤثر الفاظ میں قسطنطنیا کو برکات بھیجیں جو خود بھی اس مہلک مرض میں گرفتار اور اس وقت بیہوش تھی۔ اسکے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو بالکل تندرست تھی لیکن

یہ وہ وقفۂ قلیل تھا، جو ہر مریض الموت کو صحت تمام کا حاصل ہوتا ہے تیمار دار راہبہ نے یہ دیکھ کر کہ تمام اطبا اسکی زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں، طیوسوو ائیس کی خبر مرگ کو خطرناک خیال نہ کر کے اسے مطلع کیا اور کہا کہ وہ دم واپسیں تک اسکے لئے دعائیں کرتا رہا تھا۔ قسطنطنیا نے یہ خبر شگفتگی و اطمینان سے سنی۔ "اور اب" وہ بولی "اگر غیر درست و بیبا کانہ نہ سمجھی جائے، تو میری درخواست ہے کہ مجھے طیوسووائیس کے نزدیک دفن کیا جائے" اس کے بعد اسکی روح پرواز کر گئی اور اسے اسکی خواہش و تمنا کے مطابق دفن کیا گیا۔ انکی قبریں اب بھی موجود ہیں اور ایک چھوٹے سے کتبہ پر بزبان لاطینی مرقوم ہے۔

"یہاں خواہر، قسطنطنیا اور پدر، فرانسس، آسودۂ خاک ہیں۔ زندگی میں وہ باہم مالوف تھے اور مرنے کے بعد بھی وہ متفرق نہ ہوئے!"

رفیعی اجمیری

---

# جذباتِ سیفیؔ

نہ قاصد کا یقیں آیا نہ خط پر اعتبار آیا
ادھر تم آئے پہلو میں، ادھر دل کو قرار آیا!

میں کیا جانوں فروغ حسن خود میں کسکو کہتے ہیں؟
کوئی آئینۂ دل پر ترا نقشہ اُتار آیا

کسی کے ہاتھ سے 'جام عدو' پی تو لیا میں نے
مگر خون تمنا آنکھ میں بن کر خمار آیا

قضا کی جستجو میں پھر رہی ہیں پتلیاں میری
نہ ابتک آنیوالا اے مرے پروردگار آیا!!

دیا تھا جس گھڑی دل وہ گھڑی اب یاد آتی ہے
مجھے اس بھولی بالی شکل پر کیوں اعتبار آیا؟

قفس میں اس خبر نے ہمنوا تڑپا دیا دل کو
بہار آئی چمن میں جھوم کر ابر بہار آیا

نہیں سیفیؔ پہ کچھ موقوف اس بزم محبت سے
جو آیا پائمال گردش لیل و نہار آیا

سیفیؔ سہواروی

---

# وی نس

دیکھو یہ ہے وہ حسن کی دیوی، جو دُنیا کی مُسرت تھی! اک زمانہ اسکی شوکت وسطوت، جلال وجبروت کا نمونہ تھا، اسکے حسن و زیبائی کا شیدائی تھا! وہ ایسی حسین، ایسی سندر تھی کہ ساری دنیا اسی کی طرف کھنچتی تھی! اسکے جسم میں پھول سے نازک بلوریں جسم میں لبوں کو لبھانے کی برقی قوت تھی، جسے چُوم کر انسانوں میں زندگی، زندگی کی حرارت، زندگی کا جوش جاگ اُٹھتا تھا! وہ پھول نچھاور کرنیوالے مستی میں ڈوبے سندر کے سینہ کی کلی تھی، دُنیا کی آرزوئیں اس کے جسم پر ملبوس کی طرح لپٹی ہُوئی تھیں، وہ دھانی اور پیازی رنگ کے جھاگوں کی طرح موہنی تھی! اس میں آگ کی سی تیزی، پانی کی سی روانی، شراب کی سی سرشاری تھی! اس کے سر کے لمبے لمبے بالوں میں بہار کے پھولوں کا رنگ تھا انکی مست بھینی خوشبوئیں ان میں بسی ہُوئی تھیں! گلاب کے پھول اسکے حسن کے اثر سے زیادہ گلابی ہوجاتے تھے، اور خلیجوں کی نیلی لہریں اسکے گورے گورے طوفانی سینہ کی نیلی رگوں کے پرتو سے زیادہ نیلی! دن اور رات اسکی راہ کے پامال پھول تھے! وہ ہماری ماں بھی تھی اور دیوی بھی، ہماری معشوق بھی تھی اور خدا بھی! جب ہم اس سے التجائیں کرتے تھے تو وہ ہماری طرف جھکتی تھی! ہمیں اپنے آغوش میں لیکر عزت ومسرت سے جھکا دیتی تھی! دل میں اسکا خیال آتے ہی تن بدن میں شباب کے طوفانی ولولے متلاطم ہوجاتے تھے، اور زبان پر اسکا نام آتے ہی یہ زمین ——— جواب سوگوار ہوگئی ہے، دلکش باغ بن جاتی تھی! اسکے جلال و جبروت کا یہ عالم تھا کہ سمندر کی بے چین سرکش موجوں پر اسکی حکومت تھی، اور ہوا کی اَن دیکھی لہریں اسکو جانتی تھیں!

ناظر دہلوی

---

**پیکِ نغمہ**۔ اس عنوان سے جو "افسانہ نما" گذشتہ نمبر میں شائع ہُوا تھا، بعض احباب نے اسکی "تشنگی" کی شکایت کی ہے، اور بجا کی ہے، وہ دراصل میرے ایک طویل انسانہ کا خلاصہ تھا جو مجھے جلدی میں ہمایوں کے ظرف کو مدنظر رکھکر کرنا پڑا! کچھ یہ خیال بھی اختصار کا محرک تھا کہ ہمایوں کے قیمتی صفحات کو کسی اخلاقی مضمون کی بجائے "افسانہ" سے اتنا زیادہ آلودہ دامن نہ کردں جتنا اسکا شعار نہیں! درشئے اصل حرام کو کسی اور طرح احباب کی خدمت میں پیش کردں! چنانچہ یہ طویل "نغمۂ عریاں" عنقریب اپنی تمام "رسوائیوں" کے ساتھ "اردو کتبخانہ لاہور" کی طرف سے نشر ہوگا۔

اختر شیرانی

# محفلِ ادب

ہندی میں مذہب اسلام پر پہلا رسالہ۔ تیسری صدی کے آخر میں منصورہ، سندھ کے پایہ تخت میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز حاکم تھا۔ کشمیر بالا اور کشمیر زیریں کے بیچ میں الرا کا راجہ تھا جو ہندوستان کے تمام راجاؤں میں بڑا تھا۔ اسکا نام مہرک اور اس کے باپ کا نام رایگ تھا۔ ۲۷۰ھ میں اس نے منصورہ کے حاکم کو لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیجد یجئے جو مجھے ہندی زبان میں شریعت اسلام آ کر سمجھا دے۔ منصورہ میں ایک عالم عراق کے باشندے تھے جو نہایت ہوشیار، سمجھدار اور شاعر تھے اور ہندوستان میں مدت تک رہ جانیکے باعث یہاں کی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان میں شعر تک کہتے تھے۔ عبداللہ حاکم منصورہ نے انکو بلوا کر راجہ کی خواہش سے مطلع کیا۔ انہوں نے ایک قصیدہ میں اسلام کے تمام ضروری مسائل کو لکھ کر نظم کر دیا اور اسکو راجہ کے پاس بھیجدیا۔ راجہ یہ قصیدہ سُن کر بہت خوش ہُوا اور عبداللہ کو لکھا کہ اس قصیدہ کے مصنف کو اسکے پاس بھیجدیا جائے چنانچہ وہ عراقی عالم گئے اور تین برس راجہ کی خدمت میں رہے۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا انہوں نے اسکے حالات بیان کئے اور کہا کہ میں نے اسکو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ دل اور زبان دونوں سے مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے وہ برملا اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتا۔ (معارف)

---

شاما! ۔ فضائے ابر کے نیچے، خلائے لطیف میں، کمال پرواز دکھانے والے حسین پرند! تو اس قدر بیچین کیوں ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اونچی منڈیروں پر بیٹھ کر جب اپنی ادائے معصوم دکھاتی ہے اور تیرا سینہ بار بار اُبھرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہار تیرے مجسمۂ ناز میں انگڑائی لے رہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تجھے اپنے حسن ملیح کی قسم، سچ بتا جب شام کو مینہ برس کر کھل جاتا ہے تو تیرے نغمے بھیگی ہوئی ہوا میں جو موسیقی پیدا کرتے ہیں وہ تو کہاں سیکھتی ہے؟ تیری شوخ پروازی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں کی روشنی میں کس تماشائے متحیر سے متاثر ہوتی ہے؟ اور تو تھک کر میری گود میں گر کیوں نہیں پڑتی؟

شاما! برسات کی بھوری جوگن!! آ میں تنہا ہوں، میرا دل جذبات موسم سے اڑا جا رہا ہے، میرے پاس بیٹھ، اور کوئی ایسا ملہار سُنا جو دل میں اُٹھی ہوئی گھٹاؤں کو پانی کر دے۔ اپنی مترنم ہستی کو میری اشکبار آنکھوں کے سامنے متلاطم نہ کر، میرے کانپتے ہوئے ہاتوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ اور میرے سیاہ کھلے ہوئے بالوں کی فضا میں کوئی ایسا نغمہ چھیڑ کہ میری شام تنہائی صبح برشگال کی دلچسپیوں سے ہم آغوش ہو جائے۔ میری منڈیروں پر بیٹھ کر مجھے بیقرار نہ کر، میں تنہا ہوں، میرے پاس آ، اور اس سے پہلے کہ شام اپنی ملاحتوں کو زیادہ تاریک کر دے،

میری شاما!! ———

مجھے اپنے نغموں سے مست و مبہوت ہو جانے دے!

(پیمانہ)

---

شاہدِ گُل۔ پھول نے نوید صبح کے سرمست الست جھونکوں میں تمکنت سے جھومتے جھومتے مسرت کے جوش میں اپنے محافظ کانٹوں سے کہا۔ مجھے میری پیدائش کی کہانی سُناؤ! کانٹے دم بخود تھے۔

پھول پھر عمر کے جوش میں بولا یہ نکہت یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے اور میں نے اس چلتی پھرتی دولت کو کس طرح حاصل کیا؟؟

کانٹوں نے سر تک نہ ہلایا۔

ایک فرخندہ خیال گُل صد برگ پھر کہنے لگا۔ یہ ان گنت موتی میری صدف میں کہاں سے آئے ہیں اور صبح کی پہلی کرنیں انہیں کہاں اور کیوں اُٹھا کر لئے جاتی ہیں؟؟؟

کانٹے ٹس سے مس نہ ہوئے۔

پھول جھنجھلا کر بولا۔ یہ میری آزاد دُنیا میں میری ڈالی پر کون چہچہاتا ہے اور اسکے بے بس کر دینے والے نغمے میں کیا راز پوشیدہ ہے؟

کوئی نوجوان نادان کانٹا بول اُٹھا۔

خزاں قریب ہے

(نیرنگ خیال)

---

# نئی کتابیں

**فن سراغرسانی**۔ یہ ضخیم کتاب جناب "رائے صاحب" لالہ پارس داس صاحب رئیس اعظم و آنریری مجسٹریٹ و خزانچی دہلی کی تالیف ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس فن پر نہایت جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اس میں سراغرسانی کے متعلق دنیا بھر کے معلومات درج ہیں جس کے مطالعے سے ہر شخص سراغرساں بن سکتا ہے۔ یہ کتاب سات مبسوط ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں بیسیوں مفید اور ضروری مضامین درج ہیں۔ مثلاً طریقہ تفتیش جرائم، نقب زنی، اقوام جرائم پیشہ، پراسرار جعلسازیوں کے انکشاف کی تدبیر، خفیہ خط و کتابت کے صدہا طریقے مخفی اصطلاحات و اشارات رومال کی زبان، ٹھگوں کی زبان وغیرہ الغرض ہزارہا ضروری نکات اور مفید مطالب سے لبریز ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی زبردست کتاب آجتک نہیں لکھی گئی۔ ہر باریک سے باریک مسئلہ کو اس وضاحت و سلامت سے بیان کیا ہے کہ پولیس کا معمولی پڑھا لکھا سپاہی بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے اسکا مطالعہ وکیلوں، بیرسٹروں کیلئے عموماً اور پولیس والوں، سراغرسانوں اور افسانہ نگاروں کیلئے خصوصاً نہایت ضروری ہے۔ ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات، کاغذ دیدہ زیب کتابت و طباعت نظرفریب، قیمت غیر مجلد ۱۰ر مجلد ۱۲ر خود مصنف سے یا اردو کتبخانہ ۸ بشیر بلڈنگ فلیمنگ روڈ لاہور سے طلب کیجئے۔

**نگارستان**۔ یہ جناب نیاز فتحپوری کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو آجتک ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ بڑی حد تک انہوں نے اپنا ایک ادبی رنگ "اختراع" کرلیا ہے جو ان مضامین میں بھی جھلکتا ہے۔ لیکن اکثر تراکیب کی غلط بندشیں اور مشکل و ادق الفاظ نظر آتے ہیں جو عام ناظرین کی سمجھ سے بالاھیں۔ مسائل علمیہ کی تو دوسری بات ہے لیکن نیاز صاحب بہتر ہوتا اگر افسانوں میں زبان کے گلے پر یوں کند چھری نہ پھیرتے۔

ملاحظہ ہو۔ انجذاب مضطر۔ مستتر حرنشیب۔ پردۂ عریاں۔ توڑ مروڑ کا مخاطبہ۔ سمندر کے "عمق" کا "گہرائی"، "مردہ بنا" سجو نغمہ۔ خانہ بدوش آوارگیاں۔ مرحل معاشرت۔ کس قدر ثقیل۔ بھدے اور "غیر مترنم" الفاظ اور ترکیبیں ہیں تاہم بعض مضامین کی دلچسپی میں کوئی کلام نہیں۔ بالخصوص زائر محبت۔ حمرا کا گلاب۔ کیوپڈ و سائیکی اچھی چیزیں ہیں۔

ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ قیمت ۶؍۔ پتہ۔ مینجر رسالہ نگار بھوپال۔

# فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۴ء

# جہاں نما

انگلستان میں ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ کچھ عرصے کیلئے یقینی طور پر فیصلہ ہوگیا۔ قدامت پسند دارالعوام میں حکومت کرتے ہیں ملک اُنکے ہاتھوں میں سلطنت اُنکے پنجے میں اور اس لئے ہماری قسمت بھی اُنکے قبضے میں ہے۔ قدامت پسند حکومت پسند ہیں اپنے ملک میں نچلے طبقوں پر اپنے اختیارات کو بحال رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے برطانیہ کی وسیع سلطنت میں بھی غیر قوموں پر اپنی حکومت اور حقوق اور زور و قوت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ بھی ہو انصاف یہ ہے کہ یہ لوگ صاف صاف کہنے والے اور جو کرنا چاہتے ہیں وہی کرنے والے ہیں۔ اڈوائر انہیں کی جماعت کا رُکن تھا اور ہے اب ان لوگوں کی فتح اور انہیں کا بول بالا ہے غالباً چند برس تک قوت کی کنجی انہیں کے ہاتھوں میں رہیگی۔ نئے وزیر ہند ہندوستان آنیکا ارادہ ظاہر کرتے ہیں تاکہ یہاں آکر خود حاکموں اور محکوموں کے باہمی تعلقات کو دیکھیں اور رائے قایم کریں۔ جہانتک ہماری عقل کام کرتی ہے قدامت پسند جدّت پسند تو ہونیوالے ہیں نہیں البتہ نرم گوئی کے چند فقرے سیکھ لیں تو عجب نہیں اور انکا اثر ہم پر ہمیشہ غیر مفید ہوتا ہے۔

بھائیو! ان لوگوں پر اعتماد کرنا چھوڑو اور اپنے خلوص و جوشِ عمل پر بھروسہ کرنا سیکھو لیکن یہ بھی لاحاصل ہے کہ صرف انہیں کو شریر طینت اور اپنے لوگوں کو نیک باطن کہنا اور سمجھنا شروع کردو۔ اُنکے نقص اُنکو مبارک تم اپنی غلطیوں اور کوتاہ بینیوں کو دیکھو۔ ہم سمجھتے ہیں کم ازکم کہتے ہیں کہ دراصل ہم متفق ہیں صرف انگریز لڑانے والے ہیں۔ اتفاق کی پائداری کو کسی نے آجتک دیکھا تو نہیں۔ پھر کہتے ہیں ہم سوراج کے قطعی قابل ہیں۔ صرف دوسرے ناقابل سمجھتے ہیں۔ قابلیت کے یہ ثبوت ابھی دنیا نے نہیں دیکھے۔ سب سے بڑھ کر یہ ابھی ہم اپنی اپنی ہانکتے ہیں ملک کی بہتری اور دوسروں کی خیر خواہی کا خیال فقروں تک محدود ہے اور انگریزوں کی چالاک قوم یہ سب کچھ جانتی ہے پھر کیونکر بنگال میں یہ احکام اور انگلستان میں یہ تقریریں نہ ہوں۔ ہم چاہتے ہیں بن ہاتھ ہلائے یا زیادہ سے زیادہ (جیساکہ مدیر ہمایوں چاہتا ہے) قلم کی جنبشوں سے سب کچھ ہو جائے اور یہ دُنیا میں آجتک نہ ہُوا ہے نہ ہوگا۔

دب

# نوعِ انسان کیلئے

نوعِ انسان کے لئے دیدۂ تر پیدا کر
جو کٹے راہ میں مولیٰ کی وہ سر پیدا کر
غیر کے غم میں جو دھڑکے وہی دل سینے میں رکھ
درد اوروں کا ہو جس میں وہ جگر پیدا کر
جو ہیں خاموش سمجھ لے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟
گھر سے بے گھر جو ہیں اُن کے لئے گھر پیدا کر
ہو تمنا تجھے رفعت کی تو سر اپنا جُھکا
خواہشِ زر ہو تو آنکھوں میں گُہر پیدا کر
چاندنی جس کی غم آبادِ جہاں میں پھیلے
فلکِ دل پہ وہ اُلفت کا قمر پیدا کر
جو کہے تیری زباں نقش دلوں پر ہو جائے
قول میں اپنے عمل سے وہ اثر پیدا کر
علم کی شاخ میں محنت سے کھلا عقل کا پھول
عقل کے پھول سے نیکی کا ثمر پیدا کر
آس رکھ یاس میں بھی جبر پہ کر صبر مدام
شبِ غفلت ہی سے ایمانِ سحر پیدا کر

د ا

# معروضات

۱۹۲۴ء کا یہ آخری نمبر آپکے ہاتھوں میں ہے، اس کے بعد یہ حال ماضی میں تبدیل ہو جائیگا، اور اگلا نمبر آپکو نئے سال سے روشناس کرائیگا، ہمایوں پر یہ برس کیسے بیتا؟ اس کے متعلق مختلف خیالات ہیں، بعض حضرات کی رائے ہے کہ ہمایوں نے گذشتہ گیارہ مہینے ایک اُپدیشک کے رُوپ میں گذارے حسن و عشق کے کیف آور افسانوں کی بجائے بیخودی سوز اخلاقی وعظوں اور نشہ شکن خشک ناصحانہ مضامین کی بھرمار رہی۔ یہ شکایت ہمارے نوجوانوں کو ہے۔

بعض احباب کو اس میں علمی مضامین کی کمی محسوس ہوتی ہے، وہ ہمایوں کو ایک معلم اخلاق کی بجائے ایک فلاسفر اور ایک سائنسدان کے لباس میں دیکھنے کے متمنی ہیں، اس خیال کے لوگ علمی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، غزل سراؤں کو یہ شکوہ ہے کہ ہمایوں کے صفحات میں داغ و جرأت کی نمایندگی کا کوئی انتظام نہیں۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو ہمایوں کی زبان کو مغلق بتاتے ہیں۔

کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمایوں کی فہرستِ مضامین میں طلبہ اور غیر معروف اہل قلم کے نام دیکھ دیکھ کر ہماری ضرورت سے زیادہ حوصلا افزائی کو ناپسند کرتے ہیں، پھر ان کے بالمقابل اُن اہل الرائے حضرات کی تعداد بھی سینکڑوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی جو اُپنی پہلی مشق" کے گرانمایہ عطیہ کی واپسی پر ہمیں کم بین اور کم سواد کا خطاب دیتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہمایوں کے ناظرین اس کے متعلق مختلف اور متضاد رائیں رکھتے ہیں۔ ہم سب کو خوش رکھنے کے دعویدار کبھی نہیں ہُوئے اور نہ ہو سکتے ہیں البتہ سب کو ناراض کر دینے کی بیباکی کو بھی بُرا سمجھتے ہیں۔

جو احباب یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمایوں کے صفحات میں صرف اخلاقی تعلیم ہی ہوتی ہے ہم اُن سے عرض کرینگے کہ بقول آپکے صرف یہی نہیں ہوتی، بلکہ مختلف قسم کے مضامین کے ساتھ یہ بھی ہوتی ہے باقی رہا اخلاقیات کے مسلمہ رہنماؤں کے خیالات کو "خشک ناصحانہ مضامین" کا خطاب، اسکے متعلق ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ع "سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست"

بہ فرضِ تسلیم خشک ناصحانہ مضامین، حسن و ہوس کے اُن سرکش دلولوں سے کہیں بہتر ہیں جو روحِ اخلاق کو تباہ کر دیتے ہیں ﴿

علمی مضامین کی کمی ضرور ہے لیکن نقدان نہیں، مگر ہمایوں کے ناظرین میں علوم و فنون کے اسپیشلسٹوں (اختصاصئین) کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ﴿

غزل سراؤں کا شکوہ بجا ہے لیکن افسوس ہے ہم آیندہ بھی انکے لئے دلچسپی کا کوئی سامان فراہم نہیں کر سکینگے داغ و جرأت اگر اس وقت زندہ نہیں کئے جا سکتے تو اُنکے عہد کے خفتہ ہنگاموں کو کس لئے بیدار کیا جائے؟

اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم صنفِ غزل ہی کے سرے سے مخالف ہیں۔ ہمایوں کے ہر نمبر میں کوئی نہ کوئی غزل شائع ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ ہم تو تغزل کو شاعری کی روح سمجھتے ہیں، حسرت موہانی، اقبال، یاس وغیرہ کی شاعری تغزل ہی کی رنگینیوں کے سبب چارسو نکہت آفریں ہے، لیکن اس تغزل کے پیکر میں جذبات عالیہ کے جلوے جھلک رہے ہیں۔ مرگئے، لُٹ گئے ہائے وائے کنگھی چوٹی، مسی، آرسی کے فرسودہ ہفوات کو تغزل نہیں کہہ سکتے، ہمایوں کی زبان کے متعلق یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ حجازی اُردو تو نہیں کہی جا سکتی البتہ اتنی عام فہم بھی نہیں ہے جتنی اسے ہونا چاہیئے، ہم نے خود بھی کوشش کی ہے اور ہمایوں کے اہل قلم کی خدمت میں بھی یہی عرض کرتے رہتے ہیں کہ ہمایوں میں مضامین لکھتے وقت زبان کی سلاست اور سادگی کو پُرشکوہ فصاحت و بلاغت پر مقدم رکھنا چاہیئے۔ اور ہماری خواہش ہے کہ اُردو "صراح و قراح" سے بے نیاز ہو کر بھارت ورش کی رسیلی بھاشا بنجائے۔ ہم آیندہ بھی ہمایوں کی زبان کو آسان سے آسان تر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں ﴿

طلبہ اور غیر معروف مضمون نگاروں کو ہم اس قصور میں کہ وہ کیوں طالب علم اور کیوں غیر مشہور ہیں مجرم نہیں گردانتے اگرچہ طالب علمی اور عدم شہرت ہمایوں میں مضمون لکھنے کی کوئی ضروری شرط بھی نہیں ہے۔ ہم جوہر قابل کو سطح نمود پر لانا چاہتے ہیں خواہ وہ اسکول کی فضا میں دستیاب ہو، یا کسی گمنام گوشے میں البتہ نومشقوں کی سب سے پہلی اچھوتی مشق کے عطیات کے لئے ہمایوں کو بھی دامن دراز ہونیکی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہمارے معروضات کو مناظرانہ سوال و جواب کی صورت میں دیکھ کر یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہم ہمایوں کو ہر پہلو سے مکمل اور اصلاح سے بالاتر سمجھتے ہیں،

"توبہ توبہ کہ خطاؤں سے مرکب ہے بشر"

ہم انسان ہیں تو سہو و نسیان سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟ سچ یہ ہے کہ ہمایوں کسی اعتبار سے بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا، اپنی خامیوں کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو لیکن اس یقین کو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ ہم میں خامیاں ہیں۔ اگرچہ خورده بینی کی جانب توجہ کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتے لیکن مفید مشوروں سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہوئے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمایوں میں دانستہ یا نادانستہ بعض اوقات ایسی تحریریں شایع ہوگئیں جو ہمارے خیال میں نہ ہونی چاہیئے تھیں، اسکے بعض نمبر کبھی کبھی ہمارے مجوزہ بلند معیار کے مطابق نہیں شایع ہوئے لیکن الحمدللہ کہ سال بھر کے اس "دور" نے بحیثیت مجموعی ہمایوں کی زندگی کے معنوی توازن کو قائم رکھا ہے۔ اس مرتبہ حیدرآباد (دکن) میں علامہ عمادی، درعثمانیہ یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں دکن کے مستند ادیبوں سے شرف نیاز حاصل ہونے پر ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ اُردو دُنیا کے قابل ترین علمی افراد ہمایوں کو اسوقت اردو کے ماہوار رسالوں میں "سب سے اچھا" تصور فرماتے ہیں، ہم تو انکی اس قدر افزائی سے اس تجربہ پر پہنچے ہیں کہ ہر باکمال ژرف نگہ ہوتا ہے، اور ہمارا کچھ نہ ہونا ہی ہمیں سب کچھ دیکھنے سے محروم رکھتا ہے، ہمایوں "سب سے اچھا" بن جائے کاش وہ ساعتِ سعید آئے لیکن ہم تو اسے بھی غنیمت سمجھتے ہیں کہ وہ اس بدحالی میں بھی سب سے برا نہیں خیال کیا جاتا۔

ہمارے اہلِ قلم اپنی بیکراں توجہات سے ہمیں نوازتے ہیں اور پھر اس شان سے کہ شکریہ کا ایک لفظ بھی سننے کے خواہشمند نہیں، ان چار سال میں ہمیں یاد نہیں کہ کسی اہل قلم کیلئے کبھی کوئی قصیدہ لکھنے کی ضرورت پڑی ہو حالانکہ ہمایوں علامہ عمادی کے قول کے مطابق "سب سے اچھا" اگر ہے تو دوسرے لفظوں میں اسکے یہی معنی ہیں کہ اسکے قلمی معاونین سب سے گرانمایہ ہیں۔

ہمیں فخر ہے اور بجا فخر ہے کہ ہمارے قابلقدر اہل قلم میں کئی ایسے عالیجاہ انشاء پرداز ہیں جنکے جانفروز مضامین صرف ہمایوں ہی کا حصہ ہیں اور کسی ادبی محفل میں وہ نظر نہیں پڑینگے اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنے دوسرے مضمون نگاروں کو کم بینی کی نظر سے دیکھتے ہیں، نہیں، بلکہ ہمایوں کا ہر ادیب مشہور ہو یا گمنام، طالب علم ہو یا پروفیسر نیا ہو یا پرانا اُسکی زریں نگاریاں ہمایوں کے لئے افتخار بخش ہیں۔

تاجور

# مُتحرّک تصاویر

ازمنہ ماضیہ کی وہ متمدن اقوام جنہوں نے کبھی اپنی سطوت اور پُرہیبت جبروت سے انسانی معاشرت میں نمایاں انقلاب پیدا کئے تھے ادبِ لطیف کی دیگر اصناف کی طرح فنِ ڈرامہ کے موجد ہونیکی بھی دعویدار ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ خالق اکبر برہما نے منی بھرت جی کو ویدوں سے اخذ کرکے بطور تحفہ پیش کیا تھا[1]۔ قدامت پرست چینیوں کا بھی یہی خیال ہے۔ اسی طرح قدیم یونانی بھی ڈرامہ کی ایجاد کو اپنے دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہندوؤں کی مذہبی کتب خصوصاً راماین اور مہا بھارت کے فسانوں میں بہت سے ایسے مکالمے موجود ہیں جن پر ڈرامہ کی اساس قائم کیجاسکتی ہے اور ڈرامہ کے مترادف سنسکرت لفظ ناٹک کا "روناٹ" یعنے ناچنے سے مشتق ہونا بھی اسکے قدیمی ہونیکی دلیل ہے۔ برعکس چینیوں کے پاس سوائے اس دعوے کے کہ انکی زبان میں چندایک ایسے قدیم ڈرامے ہیں جنہیں وہ خدائے لم یزل سے منسوب کرسکتے ہیں اور کوئی ثبوت نہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ڈرامہ کو بطور تمثیل پیش کرنے میں یونانی تمام اقوام عالم سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ یونانی تمثیلات عموماً مذہبی عبادت سے منسلک تھیں۔ ڈایونیسس، مجسم قوت جنسی اور روئیدگی و زرخیزی کے دیوتا کی پرستش کا ایٹیکا[2] میں منایا جانا یونانی ڈرامہ کا سنگ بنیاد کہا جاتا ہے۔ اس تمثیلی عبادت میں جو چند گیتوں اور سوال و جواب پر مشتمل تھی، مغنی اس دیوتا کی جوانمردی، اسکی قسمت، تکلیفات اور رزمیہ موت کا ذکر کرکے تماشائیوں اور اسکے پرستاروں کو محوِ حیرت بنا دیتے تھے۔ اس وقت تک ڈرامہ مشاغل تفریح میں شامل نہ ہوا تھا۔ ایکٹر جو ایسے پارٹ ادا کرتے تھے ایک لحظہ کے لئے بھی یہ بات اُنکے دل سے فراموش نہ ہوتی تھی کہ وہ مذہبی رسوم کی بجا آوری اور خدائے پرصفات کی عبادت میں مشغول ہیں چنانچہ اُنکا مطمح نظر مذہب کی نشر و اشاعت اور تلقین احکام الٰہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اہمیتِ اخلاقیات تعلیم جمہور۔ ترحم۔ قوم پرستی۔ خوفِ خدا۔ اور اسی قسم کی دیگر خیر و خوبیاں اُنکا موضوع بحث ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ضروریات زمانہ مجبور کرتی گئیں تو ڈرامہ مذہبی حیثیت سے نکل کر قومی اور سیاسی حالت میں آگیا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ ابتدا میں سنسکرت ناٹک

---

[1] دی انگلش ڈرامہ۔ اے۔ ایس ریپوپورٹ پی۔ ایچ ڈی۔

[2] ایک قدیم ترین یونانی شہر۔

نے اخلاق انسانی پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالا[1]۔ البتہ اس فن میں جو ترمیم ہندوؤں نے کی اور جو خوبیاں ڈرامہ اور سٹیج میں اُنہوں نے پیدا کیں آج یورپ بھی اُنکا معترف ہے[2]۔ ہندو اگرچہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ فنِ تمثیل اُنہوں نے یونانیوں سے سیکھا ہے لیکن جرمن محققین نے سالہا سال کی تحقیقات کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سنسکرت ناٹک میں یونانی ڈرامہ کی جھلک پائی جاتی ہے چنانچہ ایک محقق اس دعوے کے ثبوت میں ہندو ڈرامہ کا یونانی ڈرامہ کے ساتھ تعلق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مگر جب اس امر پر خیال کیا جائے کہ سکندر اعظم کے جرنل سلوکس نے عین ہندوستان کی سرحد پر ایک عظیم الشان یونانی سلطنت بنام بکٹیریا یا بختاریا قائم کی جو چار صدی تک نہایت زور و قوت کے ساتھ قائم اور سلاطینِ ہند کے ساتھ کبھی دست بگریباں اور کبھی دست بداماں رہی یہاں تک کہ سلوکس نکیٹر نے اپنی لڑکی بھی چندر گپت راجہ مگدھ کو دینے میں تامل نہ کیا تو یہ امر بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ امتداد زمانہ اور باہمی میل جول اور تبادلۂ خیالات کی وجہ سے ہندوؤں اور یونانیوں میں بہت گہرے تعلقات پیدا ہو گئے ہونگے۔ پس کیا عجب ہے کہ قدیم ہندوؤں کو خواہ سلوکس کی بیٹی کی وجہ سے دربار چندر گپت میں خواہ باہمی آمد و رفت کی وجہ سے خاص بکٹیریا میں یونانی ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اسکے علاوہ ایک اور قوی وجہ اس خیال کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہندوؤں میں ڈرامہ کا نشوونما اُس زمانہ میں ہوا جبکہ بدھ مذہب کے داعی اطراف و اکنافِ عالم میں پھیل گئے تھے اور اُنکی وجہ سے اقوام غیر سے ہندوؤں کے تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ ہندوؤں کے جذبات و خیالات پر مذہبی رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ اُنکا کوئی فعل۔ کوئی حرکت۔ کوئی علم اور کوئی فن ایسا نہیں جو مذہب سے خالی ہو۔ مگر ہندو ناٹک کے بہت سے اقسام ایسے بھی ہیں جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے بھی پایا جاتا ہے کہ فن کی اصلیت کسی اور ملک سے ہوگی[3]۔"

یونانی تمدن کے زوال کے ساتھ اُنکا مایۂ ناز ڈرامہ کا فن بھی دن بدن قعرِ مذلت میں ڈوبتا گیا اور سلطنت روما کے عروج نے اسکی رہی سہی حرمت بھی پیوند خاک کردی۔ اب ڈرامہ مذہبی عبادت اور نشر اخلاقیات سے علیحدہ ہوکر رومی محافلِ رقص و سرود میں نشوونما پا رہا تھا۔ یہانتک کہ وہ اخلاق و تعلیم کے بلند معیار سے گر کر تفریح جمہور کا سامان بنگیا۔ اہل روما نہ تو خود قدیم یونانیوں کی طرح ہنرمندانہ مزاج رکھتے تھے نہ اُن جیسے خصائل حمیدہ چنانچہ اُن کی تعیش پرست

---

۱؎ سنسکرت ناٹک کا بہترین نمونہ کالیداس کی سکنتلا تسلیم کی گئی ہے جسے ۱۷۸۹ء میں ڈبلیو جونز نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔

۲؎ ہندو ڈرامہ ولسن۔

۳؎ سرگذشت مرد خسیس۔

طبائع نے ڈرامہ کو بداخلاقی کے رنگ میں ڈبو کر ذلت کے نشیب میں ڈالدیا۔ ہمسایہ اقوام پر پے در پے فتوحات حاصل کرنے سے اُنکے دماغ بادہ نخوت سے چُور ہو چکے تھے اور اُنکے اخلاق کی پستی کا یہ حال تھا کہ تھیٹروں میں صرف مہ وش رقاصوں کا عریاں رقص اور معجز بیاں کمسن پری رُخوں کے دلگداز الفاظ اور آتشِ سیال کے چھلکتے ہُوئے پیمانے اُنکی شوخ طبیعتوں کو قابو میں رکھ سکتے تھے۔ آج چار دانگ عالم میں اُنکے عروج تمدن اور سطوت معاشرت کے گیت گائے جاتے ہیں لیکن ڈراموں میں زندہ انسانوں کو خونخوار درندوں کے آگے چھوڑ دینا اُنکی قبائے تہذیب پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جسے نہ اُنکی قدیم بربریت کا خوف مٹا سکتا ہے نہ موجودہ تہذیب کے آنسو ہی دھو سکتے ہیں اس وقت تک عیسائیت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا اور اُسکے پیرو رومن دیوتاؤں کے پرستاروں کی طرح ایسے ظالم اور خود پرست نہ تھے البتہ تہذیب مسیحی کے مبلغین کو اُنکے رگ و ریشے میں سمائی ہُوئی اُلفتِ رقص، نیم عریاں اور حور تمثال لڑکیوں کی نمائش حسن کے سحر کو باطل کرنے کے لئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُسکے شواہد صرف تاریخ قدیم کے اوراقِ پارینہ ہیں۔ رومن جوانمردوں کی از خود رفتہ طبائع پر اثر ڈالنے اور عیسائی مذہب کی سادگی و صداقت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کلیساؤں میں ڈرامہ کی بنیاد قائم کی گئی لیکن انجیل کے چند فقرات اُن مسحور دماغوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکے جو رومی لہو و لعب اور مشرقِ قدیم کی شراب حسن سے مخمور ہو چکے تھے۔ جب پیروان مسیح کو اپنی اس پہلی کوشش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو انہوں نے یونانیوں کی تتبع میں مسیح کی موت کا ڈرامہ کلیسا کے ابتدائی سٹیج پر کھیل کر منحرف لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنا چاہا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ عیسائیت اپنی اس سعی و کوشش سے بہت حد تک رومن خداؤں پر غالب آ گئی مگر رومی تہذیب و معاشرت پر غلبہ حاصل کرنے میں یکسر ناکام و نامراد رہی۔

مغرب میں یونانی ڈرامہ کا تو یہ حشر ہُوا اُدھر مشرق میں سنسکرت ناٹک بھی عروج پر پہنچ کر صرف رام لیلاؤں تک محدود رہ گیا۔ اب یونان کے مذہبی و روحانی ڈرامہ اور رومی پر جدت ڈرامہ کا ناٹک سے کوئی مقابلہ نہ تھا عیسائی[۵] ڈرامہ اپنے عالم طفولیت میں بھی ویسا ہی مقبول تھا جس طرح سنسکرت ناٹک زوال شباب کے بعد وہ مسیح علیہ السلام کی موت کے واقعات بیان کرتے تھے یہ اپنے بزرگواروں کے حالاتِ زندگی بتاتے تھے۔ مغربی ڈرامہ نے آج جو مقبولیت عامہ حاصل کر رکھی ہے وہ محتاج بیان نہیں مگر موجودہ رام لیلاؤں میں ناٹک کا رنگ ویسا ہی ہے جیسا آج سے کئی ہزار برس پیشتر تھا۔ موجودہ ہندوستانی ڈرامہ کی ابتدا واجد علی شاہ مرحوم و مغفور والئے اودھ

---

۵ مریکل پلیز۔ ڈاکٹر بیرز۔

کے عہد میں ہوئی جبکہ بادشاہ موصوف کے ایما سے میر امانت نے اندر سبھا لکھا اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ پہلی مرتبہ قیصر باغ کے تاریخی سٹیج پر کھیلا گیا۔ ڈرامہ کے اخیر میں مصنف نے تاریخ کہی ہے ؎

زر و سے وجد بول اُٹھے پریزاد

خلائق میں ہے دھوم اندر سبھا کی

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس عرصہ میں ہندوستانی سٹیج نے کیا ترقی کی؟ یہ سوال خود ایک مستقل بحث کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جسے میں کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں +

یہ ہے ڈرامہ کی نہایت مختصر ابتدائی تاریخ۔ قدیم ڈرامہ کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد یہ امر بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ڈرامہ کی ایجاد خواہ کسی ملک و ملت سے منسوب کیجائے لیکن یہ ضرور باور کرنا پڑیگا کہ صرف مذہب ہی ڈرامہ کا موجد ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک انجیل کے ڈرامے قدیم یونانی طرز پر کھیلے جاتے تھے لیکن یکا یک انگریزی قوم ایسی تمثیلات سے گھبرا کر کسی دوسری شئے کی تلاش میں محو ہوگئی اور ایک بار پھر اخلاقیات نے سٹیج پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اُس وقت سے لیکر آجتک تقریباً دو صدی سے زائد عرصہ میں جس طرح فن ڈرامہ رفتار زمانہ کے ساتھ اپنی نشوونما میں مصروف کار رہا اور جن حالات و مشکلات سے گذر کر وہ بامِ عروج پر جلوہ فگن ہُوا وہ کسی ذی ہوش سے مخفی نہیں۔ ڈرامہ کی صحیح قوت کا اندازہ متمدن اقوام کی تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ انگلستان۔ فرانس۔ روس۔ امریکہ اور جرمنی ڈرامہ نے معاشرت انسانی میں وہ تغیر و انقلاب پیدا کئے جو مصلحین اپنے فلک پرواز دماغ اور قائدین عظام اپنی شمشیر خارا شگاف سے بھی نہ کر سکے۔ سائنس کے عروج نے سٹیج کی حالت ہی بدل ڈالی یہانتک کہ بجلی کی طاقت سے پردوں کا اُٹھنا۔ گرنا۔ سینری کا پھرنا۔ آدمیوں اور محلات کا اُڑنا۔ ریلگاڑیوں کا چلنا سب کچھ محدود سٹیج پر دکھانا معمولی بات ہوگئی مگر خواہش ترقی کا میدان بڑا وسیع ہے جدت پسند دماغ اس سوچ میں پڑ گئے کہ کوئی ایسی چیز ایجاد کرنی چاہیئے جس سے میدانِ جنگ کے نظارے اور تہذیب قدیم کے تمام و کمال نمونے عامۃ الناس کے پیشِ نظر کر دیئے جائیں۔ بس یہ تھا ایک ننھا سا خیال متحرک تصاویر کی ایجاد کا +

سنہ ء میں ایک فوٹوگرافر نے ایک گھوڑ دوڑ کی تصویر محفوظ کرنیکی خاطر بہت سے کیمرے ایک سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر رکھکر یہ انتظام کیا کہ ایک ایک سکنڈ بعد ہر کیمرہ کا شٹر گر جائے اور گھوڑے کی چال فوٹوگرافی کے شیشے پر منعکس ہو جائے۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۸۷۷ء میں ایک شخص مے نے

---

[1] دی گروتھ آف انگلش ڈرامہ۔ آرنلڈ وائن ایم۔ اے +

بھی ایسی تصاویر بنانیکی کوشش کی مگر ناکام رہا حتیٰ کہ ایک انگریز مسٹر ڈبلیو فریز گرین نے تمام عمر کی جد وجہد کے بعد ہائیڈپارک کارنر میں ۱۵ نومبر ۱۸۸۹ء کو ایک ایسا کیمرہ تیار کر لیا جس سے متحرک تصاویر بن سکیں۔ یہی تھی وہ چیز جسکے لئے کئی آدمیوں نے اپنی جائدادیں اور عمریں وقف کر دینے کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ پھر ۱۸۹۵ء میں ایک اور انگریز مسٹر رابرٹ پال نے نہایت کامیابی سے "سفید چادر" پر متحرک تصاویر کا تماشہ دکھایا اور مارچ ۱۸۹۶ء کو دنیا کا پہلا تماشا اسی شخص کی وساطت سے لنڈن کے الہمبرا تھیٹر میں جمہور کے پیش خدمت کیا گیا[1]۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ متحرک تصاویر کی ایجاد کا سہرا انگریزوں ہی کے سر رہا مگر اسکو عملی صورت میں پیش کرنے کے لئے امریکہ کے مایۂ ناز علم طبیعات کے فاضل تھامس ایڈیسن نے جو دماغ سوزی کی وہ اصل موجد کی ہمت سے کم قابلِ ستائش نہیں۔ یہ اُسی کی جد وجہد اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے کہ متحرک تصاویر نے آج دنیا کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس فن میں جو ترقی امریکہ والوں نے کی وہ محتاج بیان نہیں اور انگریز جو اسکے موجد ہونیکے دعویدار ہیں اُنکے مقابلے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ ابتدا میں چھوٹی چھوٹی دو دو سو اور پانچ پانچ سو فٹ کی فلمیں تیار ہونے لگیں جن میں مذہبی ڈرامے بھرے جانے لگے۔ اس سے پبلک اُکتا گئی تو "بچے کا خواب" "ماں کی ممتا" اور "پادری کی لڑکی کا عشق" ایسے ایسے سوقیانہ خیالات کے ڈرامے فلم ہونے لگے۔ جب یہ چیز بھی مقبول نہ ہو سکی تو ترقی کی طرف ایک اور قدم بڑھا اور تاریخی واقعات اچھوتے اور بلند خیالات کے ڈرامے بہترین اجرتوں پر لکھوائے گئے اور نہایت قابل باہنر فن آدمی اور پُر بچہرہ لڑکیاں بڑی بڑی تنخواہوں پر بطور ایکٹر کام کرنے لگے۔ آج ۱۹۲۴ء میں یہ حالت ہے کہ متحرک تصاویر کے ڈراموں کی اُجرتیں منافع کی حصہ رسدی کے علاوہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار تک معمولی قیمت سمجھی جاتی ہے[2]۔ اور ایکٹروں کی تنخواہیں ایکسو بیس روپیہ ہفتہ وار سے لیکر چار ہزار روپیہ ہفتہ وار اور اس سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہاں روپے کی اسقدر افراط ہے کہ وہ معمولی نسانوں اور معمولی ایکٹروں کو اتنی گرانبہار قوم یونہی دیدیتے ہیں۔ نہیں۔ وہ بہترین چیز بہترین قیمت پر خریدتے ہیں اور پھر کماتے ہیں۔ ہندوستان کے ایکٹروں کا امریکہ و یوروپ کے ایکٹروں سے مقابلہ کرنا اُنکی توہین و تذلیل ہے۔ میرے نزدیک آجتک ہندوستان صحیح

---

[1] ایڈورڈ ڈوڈ کا خیال ہے کہ دنیا کا پہلا ڈرامہ ۱۸۹۵ء میں دو انگریزوں بلیکٹن اور سمتھ نے دکھایا تھا۔ یہ فلم ڈیڑھ منٹ میں ختم ہو گئی جس میں دکھایا گیا تھا کہ تنہا آدمی ایک روح کے کمرہ میں داخل ہو جانے سے کس طرح گھبرا رہے تھے۔ یہ دونوں نوجوان اب دنیا کی مشہور کمپنی وٹاگراف کے مالک ہیں چنانچہ متحرک تصاویر کی دنیا میں آج اس فن کی ۲۵ سالہ جوبلی منائی جا رہی ہے۔

[2] گراسٹ اینڈ ڈنلپ لٹریچر۔

معنوں میں کوئی ایکٹر پیدا نہیں کرسکا۔ مس لیلین گش جس کی تصویر اس دفعہ زینتِ مجلہ ہمایوں ہے کس قسم کا پارٹ ادا کرتی ہے وہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے ڈیوڈ وارک گریفتھ، شہرۂ آفاق ڈائرکٹر، کے تیار کردہ ڈرامے "وے ڈاؤن ایسٹ" اور "آرفنز آف دی سٹارم"[۱] دیکھے ہیں۔ ایسے پُرہنر کام کی اُجرت اگر اس مہ جبین بھولی بھالی کمسن لڑکی کو دس ہزار روپیہ ہفتہ وار ادا کی جائے تو کیا یہ قرینِ انصاف ہوگا۔ برعکس اسکے چند سال ہوئے مجھے ہندوستان کی ایک مشہور سینما کمپنی کا ایک ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں کسی ایکٹر نے دوسرے ایکٹر کو برچھے سے مار ڈالا۔ مگر مرنے والا پیچھے پھر کر دیکھتا ہے کہ آیا وہ چارپائی پر گریگا یا زمین پر۔ مطلب یہ تھا کہ کہیں چوٹ نہ آجائے ایسے ایکٹر کو اگر چار روپے ہفتہ وار بھی ادا کیئے جائیں تو میں اُسے بہت زیادہ اُجرت تصوّر کرونگا۔ آج چارلس ہچی سن متحرک تصاویر کے مشہور نوجوان ایکٹر کے کارنامے زبان زد خلائق ہیں۔ دنیا میں کون شخص ہے جو اُس کی تنخواہ لینے کا آرزومند نہیں مگر جو کام وہ کرتا ہے کوئی آدمی دس لاکھ روپیہ روزانہ مشاہرہ پر بھی کرنیکو تیار نہیں۔ ہچی سن کے سینکڑوں سنسنی خیز اور حوصلہ شکن کاموں میں اُسکا ایک ہوائی جہاز سے چلتی ٹرین کی کھڑکی میں کود جانا ایک ایسا کرتب ہے جو صرف زندگی کے سودے پر ہو سکتا ہے۔ ٹرین اپنی پوری رفتار میں جا رہی تھی کہ یہ جانباز ایکٹر ہوائی جہاز سے کھڑکی کے راستہ گاڑی میں داخل ہونے کے لئے کودا مگر اُس بدمعاش نے جو ٹرین کے اندر تھا کھڑکی کا دروازہ بند کردیا اور ہچی سن بڑے زور سے لڑکھڑاتا زمین پر آرہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکی پسلی کی بہت سی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور دونوں ٹانگوں کی نسیں کٹ گئیں۔ چالیس میل کی رفتار سے دو مخالف سمتوں کو جانیوالی گاڑیوں سے کود کر دوسری گاڑی میں داخل ہونا یا ایک سات منزلہ مکان سے اتنی ہی بلندی کے دوسرے مکان پر جسکا درمیانی فاصلہ اٹھارہ فٹ کے قریب ہو، چھلانگ مارنا شاید اس مضمون کے پڑھنے والے ایک فرضی فسانہ تصور کریں مگر یہ بالکل درست اور صحیح ہے اور ہچی سن فی الحقیقت ایسا کرتا ہے لیکن سب سے زیادہ خطرناک پارٹ جسکا وہ عموماً ہر ملاقاتی سے تذکرہ کرتا ہے وہ تھا جب اُسے مضبوط رسیوں سے جکڑ کر ایک گھوڑے کی دم سے باندھ دیا گیا۔ بے لگام گھوڑا اپنی پوری قوت سے اُسے پتھریلی زمین اور خاردار جھاڑیوں میں گھسیٹتا ہوا ریلوے لائن سے گذرنے لگا جس پر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک میل گاڑی کا ہیبتناک انجن فراٹے بھرتا آرہا تھا۔ جس وقت گھوڑا ہچی سن کو لئے اُس لائن سے گذرا تو انجن اور اس جوانمرد ایکٹر کا فاصلہ صرف تین فٹ کے قریب تھا۔ اگر گھوڑا ڈر کر

---

[۱] یہ دونوں ڈرامے لاہور میں دکھائے جا چکے ہیں۔

وہیں کھڑا ہو جاتا یا ایک سیکنڈ کا وقفہ ہی پڑ جاتا تو بتائیے شیر دل ہچی سن اس وقت کہاں ہوتا[1]۔ ایسے خوفناک زہرہ گداز کرتب کرنیوالے ایکٹروں کی تنخواہیں اتنی بیش بہا نہ ہوں تو کون اپنی جان جوکھوں میں ڈالے۔ مشہور ایکٹر ایڈی پولو چھ سال یونیورسل کمپنی میں کام کرتا رہا ہے۔ اس عرصہ میں آپکے ذوق کی خاطر کیمرہ کے سامنے[2] ایسے ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والے کرتبوں سے اپنے بدن کی ۳۸ ہڈیاں اور چودہ دانت توڑ ڈالے۔

مردوں کی طرح بعض مشہور عورتیں بھی ایسے ہی جانبازی کے پارٹ کرتی ہیں جن میں روتھ رولینڈ اور پرل وائیٹ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مس وائیٹ اگرچہ اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ وہ پیدائشی ڈرپوک ہے مگر پھر بھی خوف کو اُس نے اپنے دل پر حکومت نہیں کرنے دی۔ بہترین نیچرل پارٹ کرنے والے ایکٹروں میں ڈگلس فیر بینکس۔ رڈلف ویلنٹینو رچرڈ برتھلمس۔ رومن نویرو۔ آئور نوویلو۔ ارک وان سٹراہم۔ بُش مین۔ رچرڈ ڈکس۔ تھامس میہی گن وغیرہ وغیرہ ہیں اور مستورات میں میری پکفورڈ۔ نارما ٹالمیج۔ ایلس ٹیری۔ بیٹی بالفور۔ لیلین گش۔ میرین ڈیویز۔ گلوریا سوینسن اور لیلا لی مشہور ہیں۔ اظہار جذبات میں جو ید طولےٰ ان لوگوں کو حاصل ہے۔ آج کرہ ارض کے ہر حصہ سے وہ اپنے کام کی نسبت خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ڈگلس فیر بینکس وہ سیماب صفت تلوار کا دھنی ایکٹر جسکے تین ڈرامے " دی تھری سکیٹرز" " مارک آف زورو" اور " رابن ہڈ" اہل پنجاب کو تو بخوبی یاد ہونگے، ایسا غیر فانی ایکٹنگ کرتا ہے کہ الامان۔ نہ صرف امریکہ اسکے وطن مألوف بلکہ یورپ کے جھونپڑے اور شاہی ایوان اسکی توصیف سے گونج اُٹھے ہیں موخر الذکر ڈرامہ متفقہ یورپ کی صلیبی لڑائیوں سے متعلق ہے جو بیت المقدس کی خاطر عیسائیوں اور مسلمانوں میں ۱۰۹۶ء سے لیکر ۱۲۹۱ء تک ہوتی رہیں اور جن میں ہر بار عیسائیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ یہانتک کہ شام پر آخری حملہ کرنیوالا انگلستان کا مشہور بادشاہ رچرڈ سلطان صلاح الدین اعظم سے شکست کھا کر یروشلم کی طرف منہ کر کے رو دیا اور اپنے چہرے کے سامنے ڈھال رکھ کر کہا کہ جس شہر کو میں فتح کرنے آیا تھا اُسکی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کے لایق بھی نہیں ہوں[3]۔ اگرچہ اس کشت دخون کی ہولی کا جس کے واقعات ایک عیسائی مورخ نے خون ہی سے لکھے تھے اس ڈرامہ کے ساتھ بہت کم تعلق ہے مگر اس قسم کی مذہبی دیوانگی کی لڑائیوں میں شریک ہونے کے لئے جس طرح صنف لطیف سے مدد لی جاتی تھی اُسکا اعادہ بالتشریح کر دیا ہے۔ شاہ رچرڈ کا مشہور جنگجو

---

[1] امریکن میگزین۔

[2] یونیورسل دیکلی۔

[3] مشہور فرانسیسی مورخ مچاڈ کی تاریخ کردسیڈ صفحہ ۴۹۷۔

نواب ہنٹنگڈن، جو بعد میں مشہور قزاق "رابن ہڈ" کے نام سے مشہور ہُوا، اپنی منظور نظر سے رخصت ہوتے وقت بادشاہ سے کہتا ہے "جہاں پناہ۔ میں آدھے دل کے ساتھ اس مقدس جنگ میں شریک ہونے جا رہا ہوں اور نصف دل اس حور تمثال لڑکی کے پاس چھوڑے جاتا ہوں"، جس طریق پر ڈگلس فیربینکس نے اس ڈرامہ میں اپنا پارٹ ادا کیا ہے اُسکے متعلق نقادوں کا فیصلہ ہے کہ اس فنون سیاہگری کے ماہر انسان سے بہتر اس زمانہ میں کوئی ایکٹر موجود نہیں۔ اُسکی ہر بات میں کمال اور اُسکے ہر کام میں اعجاز ہے۔ اُسکے تبسم میں ایک سحر ہے کہ ہر دل مسحور کر لیتا ہے اور اپنی عدیم النظیر شخصیت سے عامتہ الناس کی طبیعتوں پر ایسا جادو کا سا اثر ڈالدیتا ہے کہ وہ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اُس کی شہرہ آفاق بیوی میری پکفورڈ جسے "محبوبۂ گیتی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہر قسم کا پارٹ ادا کرنے میں ایک خاص کمال رکھتی ہے۔ آٹھ سال بچے سے لیکر ستر سال کی بوڑھی عورت تک اور ایک مغرور شہزادی سے پھوس کے جھونپڑہ میں رہنے والی غریب زادی تک کا پارٹ ایسے حسن و خوبی سے ادا کرتی ہے کہ انسان عش عش کر اُٹھتا ہے۔ اپنے ایک عنایت نامہ میں جو میرے نام تحریر کیا تھا اپنے مشاہرہ کی نسبت لکھتی ہیں کہ ۱۹۱۶ء کے موسم بہار میں میری پکفورڈ کمپنی کا سنگ بنیاد رکھا گیا اس شرط پر کہ میں چالیس ہزار روپیہ ہفتہ وار تنخواہ اور پچاس فیصدی حصہ اصل منافع سے لینے کی حقدار ہونگی۔ اسکے ساتھ ایک یہ بھی شرط تھی کہ ڈرامہ کا انتخاب ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کی تعیناتی بھی میری خواہش کے مطابق ہوگی۔ آجتک دنیا کی کسی عورت کو کسی کام میں اتنی اُجرت نہیں دی گئی[1]۔

ان بے پناہ ایکٹروں کے حالاتِ زندگی الف لیلہ کے فسانوں اور پریوں کے قصوں سے کم تحیّر خیز نہیں لیکن جب دیکھا جائے کہ متحرک تصاویر کے بنانے والی کمپنیاں جو کام ان سے لیتی ہیں وہ واقعی انہیں ایسی بیش بہا رقوم کا مستحق قرار دیتا ہے۔ ایلس ٹیری وہ خوبصورت و حور جمال لڑکی جب رُڈلف ویلنٹینو کے ساتھ "فور ہارس مین"[2] میں پارٹ کر رہی تھی تو اُسکے ڈائرکٹر نے دورانِ تصویر کشی میں ایسی سختی سے کام لیا کہ کئی بار اُسکی آنکھوں سے کرب و بے چینی کی بدولت آنسو نکل پڑے اور اس بات کو پیش نظر رکھتے ہُوئے اچنبا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود ڈائرکٹر اس حور تمثال عورت کا اپنا خاوند تھا۔ نار ما ٹالمیج، اظہار جذبات کی ملکہ، جس کی تنخواہ کئی لاکھ روپیہ سالانہ ہے ایک ڈرامہ میں پارٹ کرنے لگی تو ڈائرکٹر نے دُور ہی سے چلا کر کہا "لے تمہارا کیا نام ہے ذرا انسانوں کی طرح چلنا سیکھو"

---

[1] ہم کسی آئندہ اشاعت میں اس بے نظیر ایکٹرس کے مکمل سوانح حیات اُسکی عکسی تصویر کے ساتھ ہدیہ قارئین ہمایوں کرینگے۔

[2] یہ بے مثل ڈرامہ لاہور میں دکھایا جا چکا ہے۔

بیسیوں ایکٹروں کے سامنے ایسے سخت سُست الفاظ اتنی مشہور و معروف ہستیوں کو کہہ جانا اور صبح سے لیکر تا شام ایکٹ کراتے کراتے انہیں مضمحل و بیمار بنا دینا شاید آپ محسوس کرینگے کہ وہ حلال کا روپیہ وصول کرتے ہیں۔ آرفنز آف دی سٹارم کے ڈرامہ میں ہر ایکٹر کو مع مس لیلین گش کے ہر پارٹ دس دفعہ سے لیکر تین سو دفعہ تک دوہرانا پڑا۔ قیاس کیجئے کہ ہر ایکٹ کو تین دفعہ کرنے سے انسان کا سر پھر جاتا ہے۔ پھر اتنے بڑے ڈرامہ میں جس کو چھ ماہ کے عرصہ میں تکمیل تک پہنچایا گیا ہو۔ لیکن یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ ہر ایکٹر اور ایکٹرس کو بہت دفعہ اپنی جان معرض خطر میں ڈالنی ہوتی ہے۔ موٹر گاڑیوں کا ٹکرانا۔ ریلوں کا پل سے دریا میں گرنا۔ گھنٹوں برف کی سلوں پر لیٹے رہنا ہوائی جہازوں سے کود جانا۔ جلتے مکانوں اور دھوئیں کے بادلوں میں دم گھٹتے تک پڑے رہنا۔ جہازوں کی بلندی سے سمندر میں چھلانگ مارنا ایسے حوصلہ سوز کام ہیں کہ اچھے اچھے دل گردے والے منہ پھیر لیتے ہیں۔ آرٹ ڈیوس ایک ایکٹر گھوڑے پر سوار ۸۲ فٹ اونچی کھڈ سے گذر رہا تھا کہ گھوڑے کا پاؤں پھسل[1] گیا اور دونوں لڑکنیاں کھاتے نیچے آرہے۔ جس وقت وہ پانی میں گرے تو ڈیوس نیچے اور گھوڑا اوپر تھا۔ غریب ایکٹر کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اور اُسکا تمام بدن چکنا چور ہو گیا۔ پانچ فوٹو گرافر جو اس خوفناک منظر کو فلم کر رہے تھے اُن میں سے دو تو اس ہیرہ شگاف واقع کو دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ بعض ایکٹر ایسے خطرناک مناظر کے فلم ہوتے وقت اپنی شکل کے بُت استعمال کر لیتے ہیں جنہیں متحرک تصاویر کی اصطلاح میں "ڈبلز" کہا جاتا ہے مگر ایسے آدمی جنہیں اپنے کام کی نسبت جان زیادہ عزیز ہو آپکو خال خال دکھائی دینگے ورنہ ہر شخص مرد اور عورت "اصلیت" پر فدا ہے اور کسی ایسی چیز کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا جو اُسکے کام کی عالمگیر شہرت میں رخنہ انداز ہو سکے۔

کمسن ایکٹروں میں بے بی پیگی۔ میریم بیٹسٹا۔ فلورنس اور جیکی کوگان مشہور ہیں۔ کیا یہ تعجب و استعجاب کا مقام نہیں کہ آخر الذکر نے نو سال کی عمر میں ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ سے زیادہ کما لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی سالانہ آمدنی صدر جمہوریہ امریکہ کی تنخواہ سے دس گنا زیادہ[2] ہے۔ یہ عدیم النظیر بچہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو امریکہ میں پیدا ہوا۔ اور دو برس کا تھا کہ چارلی چیپلن دنیا کے سب سے بڑے کامک (مذاقیہ) ایکٹر نے اُسے کسی تماشہ میں اپنے باپ کے ساتھ پارٹ کرتے دیکھ لیا۔ چارلی کی دُور اندیش نگاہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ ہونہار بچہ کسی وقت یگانہ روزگار ایکٹر ہو گا۔ چنانچہ تماشہ کے اختتام پر چارلی نے اُسکے والدین سے فوراً ایک اقرار نامہ بدیں مضمون

[1] گھوڑے کا بمعہ سوار پھسل جانا آرٹ ڈیوس کے پارٹ کا ایک حصہ تھا۔

[2] پکچر شو۔

لکھالیا کہ دو سال بعد جیکی اُسکے ساتھ متحرک تصاویر کے ڈراموں میں کام کریگا۔ چنانچہ پانچ سال کی عمر میں اُس نے اپنا پہلا ڈرامہ "دی کڈ" بنایا جس کو مکمل کرنے کے لئے ایک سال کی مدت درکار ہوئی۔ اسکے علاوہ "آلیور ٹوسٹ" "مائی بوائے" "ڈیڈی" "سرکس ڈیز" اور "لانگ لو دی کنگ" اُسکے مشہور ڈرامے ہیں۔ جن میں اول الذکر چار ڈرامے لاہور میں دکھائے جا چکے ہیں۔ آج متحرک تصاویر کی دنیا میں اُسکی قدر و منزلت کا یہ حال ہے کہ ڈگلس فیربینکس اور میری پکفورڈ نے چار ڈراموں کے لئے بیس لاکھ روپیہ نقد پیشگی اور ساٹھ فیصدی حصہ اصل منافع سے دینے کا وعدہ کیا لیکن جیکی نے اس رقم کو اپنی ہر دلعزیزی اور مقبولیت عامہ کے سامنے بہت کم خیال کرتے ہوئے اسکے لینے سے انکار کر دیا۔ آج سے صرف چند سال پیشتر اُسکی آمدنی کا یہ حال تھا کہ اُسکے والدین اُسکی اُنگلی پکڑے صرف بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر مختلف کمپنیوں کے دفاتر میں ملازمت کی خاطر لئے لئے پھرتے تھے اور کوئی توجہ نہ کرتا تھا۔ اسکے ساتھ اُن لوگوں کے ذوق تعلیم اور تربیت اولاد کا یہ حال ہے کہ باوجود جیکی لاکھوں روپے ہر سال کما رہا ہے مگر چند روز ہوئے اُسکے والدین نے اعلان کر دیا کہ جیکی کی تعلیم سب چیزوں پر مقدم ہے اور ہم ہر سال صرف دو[۵۰] ڈرامے تیار کر سکینگے کیونکہ ایسے دو ڈراموں کے بنانے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوتا ہے جتنا جیکی کی عمر کا ایک لڑکا سال بھر میں چھٹیاں مناتا ہے۔ اگر ہم نے محسوس کیا کہ یہ دو تصاویر بھی زیادہ ہیں تو اسوقت تک کہ جیکی اپنی تعلیم نہ مکمل کرے ہم صرف ایک ہی تصویر ہر سال ہدیہ ناظرین کرینگے۔

یہ ہے مختصر سی کہانی متحرک تصاویر کے ایکٹروں اور انکی تنخواہوں کی اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک ڈرامہ خریدنے اور اُسکے تیار کرنے پر کیا لاگت آتی ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر گریفتھ نے ایک ڈرامہ بعنوان "بن حور" خریدنے کے لئے گولڈ ون کمپنی کو ساٹھ لاکھ روپیہ نقد پیش کیا مگر انہوں نے اس قیمت پر ڈرامہ دینے سے انکار کر دیا[۵۱]۔ میں یہ باور کرنے کے لئے تیار ہوں کہ ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں مگر اس بات سے اُن ہوش رُبا قیمتوں کا ضرور اندازہ ہو سکتا ہے جو مختلف کمپنیوں والے فسانہ نگاروں کو ادا کر رہے ہیں۔ پھر یہ "دا دیلا کہ" اور "لاؤ" مگر اسکے ساتھ اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ کہانیوں کے انتخاب میں کس قدر سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ مجھے ڈگلس فیربینکس کی وساطت سے معلوم ہوا کہ گذشتہ سال بائیس ہزار اور بیس (۲۲۰۲۰) ڈراموں اور کہانیوں سے جو مختلف کمپنیوں کے دفاتر میں موصول ہوئیں صرف چار پلاٹ قبول کئے گئے[۵۲]۔ ڈرامہ

---

۵۱ گراسٹ اینڈ ڈنلپ میگس لٹریچر۔

۵۲ یہ کہانیاں غیر معروف اور مبتدی فسانہ نگاروں کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔ مشہور اہل قلم کے ڈرامے علیحدہ شمار کیجئے۔

بنانے کا یہ حال ہے کہ جب امریکہ کی تین بڑی کمپنیوں نے مل کر "وین نائیٹ ہڈ واز ان فلاور" بنایا تو صرف اُسکے فلم کرنے کا خرچ ایکسو ساٹھ دنوں میں اڑتالیس لاکھ پچاسی ہزار نو سو پینسٹھ روپے ہوا یعنی تیس ہزار پانچ سو سینتیس روپے یومیہ یا تین ہزار آٹھ سو سترہ روپے فی گھنٹہ صرف ہوئے۔ علاوہ ازیں دیگر اخراجات شامل کرنے سے کل رقم ساٹھ لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ ڈرامہ کی سینری بنانے پر ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار آٹھ سو پچاسی روپے خرچ ہوئے اور یہ تمام سامان اور بتیس عالیشان شاہی عمارتیں اٹھائیس ہزار آٹھ سو مربع فٹ زمین پر تعمیر کی گئی تھیں۔ تین ہزار سے زائد ایکٹر ملازم رکھے گئے اور انگلینڈ کے بادشاہ ہنری ہشتم کے محل ہمپٹن کورٹ کا ہو بہو ویسا ہی نقشہ تیار کیا گیا تاکہ ہر چیز قدیم تاریخ کا صحیح نمونہ پیش کر سکے۔ علاوہ ازیں نو لاکھ بیس ہزار روپیہ مالیت کے اصلی تصویر دار پردے استعمال کئے گئے اور اُس زمانے کے تین ہزار لباسوں کے بنانیکا خرچ چار لاکھ روپیہ سے زائد ہوا۔ صرف ایک ہی نظارہ میں تین ہزار ایکسو تیئس آدمی دکھائے گئے۔ ڈیول[1] لڑنے کے لئے بیس مشاق تلوار کے دھنی ایکٹر ملازم رکھے گئے تب کہیں جا کر یہ بیل منڈھے چڑھی۔

قدیم تاریخی واقعات کو اُنکے اصلی رنگ میں پیش کرنیکا خبط ہر مائک کمپنی کے دماغ میں سما چکا ہے "آرفنز آف دی سٹارم" کے ڈرامہ میں لوئیس سیزدہم شہنشاہ فرانس کے زمانہ کی عشرت پسندی۔ مہوش پرستی اور سنگساری کا اصلی رنگ میں چربہ اُتار دیا ہے۔ بادۂ گلگوں سے لبریز تالاب میں بادشاہ کی منظور نظر کا فراد امہ جبینوں کا عریاں ہوکر تیرنا اور اعیان دربار کا شراب ناب کے چھلکتے ہوئے جام بلوریں دختران گناہ کے پاؤں میں رکھکر پی جانا اُس زمانے کے اُمرا اور عمائد سلطنت کے احساس شہریت، اُنکی تعیش پرست زندگی اور وارفتگی طبائع کا اس قابل ستائش طریق پر نقشہ کھینچا ہے کہ بیساختہ آفرین کی صدا منہ سے نکل جاتی ہے۔ لیکن جب نادار مفلس اور فاقہ کش رعایا کے افراد کا، جو ان عشرتکدوں کے باہر ماہتاب کی ٹھنڈی چاندنی میں نان شبینہ کے لئے ہاتھ پھیلا رہے ہوں، اُن لوگوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے جنکے ہاتھ میں انکی قسمت اور زمام حکومت ہے تو قدرت خدا یاد آجاتی ہے۔ جن لوگوں کے روپے سے ایسی رنگ رلیاں منائی جا رہی ہوں اور رات بھر شبستان عیش میں معطر پھولوں کی پنکھڑیوں کی بارش میں مست شباب گلرخوں کا رقص دیکھ کر آتش شوق بجھائی جاتی ہو، اگر وہ ہر طرف سے مایوس ہوکر محض اپنی زندگی کی خاطر ایسی سلطنت کے برخلاف بغاوت و غدر نہ پھیلا دیں تو اور کیا چارہ ہوسکتا ہے

---

[1] زمانہ قدیم میں جب ایک معشوق کے دو عاشق ہو جاتے تھے تو وہ تلوار سے لڑ کر خود بخود فیصلہ کر لیتے تھے یا اگر دو آدمیوں میں کسی بات پر تکرار ہو جاتی تھی تو نوک شمشیر ہی اس گتھی کو سلجھا سکتی تھی اسے ڈیول کہتے تھے۔

انقلاب فرانس کی یہ داستانِ پارینہ نہ صرف اُس زمانہ کی بیہودگیوں اور تاریک زندگی کا پہلو دکھاتی ہے بلکہ مظلوم کی حمایت۔ احسان کا بدلا احسان۔ رشتہ داروں سے محبت۔ تلطف۔ مروت۔ وفا اور کئی ایک دیگر نیک و قابل تقلید مثالیں پیش کرتی ہے۔ جب شراب کے اس حوض کو، جس کا میں نے سطور مندرجہ بالا میں ذکر کیا ہے، امریکہ میں بنانے لگے تو سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا اس میں اصلی شراب ڈالی جائے یا شراب نما رنگ ڈال کر تصویر بنائی جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ رائج الوقت قانون کی رو سے امریکہ میں شراب کی ایسی ہی ممانعت ہے جیسی شریعت اسلام میں لیکن پھر بھی حکومت وقت سے خاص طور پر اجازت حاصل کرکے اُس ساٹھ ٹن وزنی تالاب کو دو لاکھ چالیس ہزار روپے کی ارغوانی شراب سے لبریز کر دیا گیا۔ اس ڈرامہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سب سے پہلے ۱۲ دسمبر ۱۸۷۵ء کو اسے یونین سکوئیر تھیئٹر میں پیش کیا گیا۔ اسکے بعد ایک ایکٹرس کیٹ کلیکسٹن نے صرف سات ہزار دفعہ اس میں پارٹ کیا اور اس وقت سے لیکر آجتک یہ ڈرامہ ایک لاکھ سے زائد مرتبہ امریکہ ہی کے سٹیج پر کھیلا جا چکا ہے۔ اس ڈرامہ کی تصویر بناتے وقت پُرانے زمانے کے پیرس کا نقشہ کھینچنے کے لئے تیس لاکھ فٹ لکڑی۔ تین ہزار ٹن سڑکوں میں لگانے کے لئے پتھر۔ وارنش اور رنگ کے نوے پیپے اور چار ہزار شیشے کھڑکیوں اور دروازوں میں لگانے کے لئے استعمال کئے گئے۔

نہ صرف مغربی سرمایہ دار ہی تاریخی تصاویر کو بحملہ حسن و خوبی مکمل کرنے اور پانی کی طرح روپیہ بہا کر اختتام تک پہنچانے میں سعی پیہم سے کام لیتے ہیں بلکہ اُنکے ملک کی آزاد و خود مختار حکومتیں اُنہیں ہر طرح کی امداد و سہولت بہم پہنچاتی ہیں۔ انگریز اس فن میں امریکہ والوں سے بہت پیچھے تھے لیکن اب شاہی امداد اُنکے پس پشت ہے اور وہ نہایت سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ شہزادہ ویلز اس کام میں اُنکے سرپرست ہیں۔ اسی طرح حکومت فرانس ایک گرانقدر تصویر کے بنانے میں امداد دے رہی ہے۔ چنانچہ وردن اور ہڈی کے خونریز معرکوں کے مناظر فلم کرنیکی خاطر فوجی سپاہیوں کی پانچ رجمنٹیں یا پندرہ ہزار آدمی تصویر بنانیوالوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ اس ڈرامہ میں سپاہی نپولین اعظم کے زمانہ کی وردیاں زیب تن کرینگے اور ٹریفالگر کی مشہور تاریخی لڑائی اور انگریزی جرنل نلسن کی موت کا پورا نقشہ دکھایا جائیگا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک کروڑ فرانک اس تصویر کے بنانے پر خرچ آئیگا۔

لیکن صرف روپیہ خرچ کرکے بہترین مصنفین سے ڈرامے خرید کر اور شہرہ آفاق ایکٹر ملازم رکھکر ہی "متحرک تصاویر"

---

سلہ غالباً سب سے زیادہ آدمی پیراماؤنٹ کمپنی کی تاریخی فلم "دی بھیوڈورا" ہی میں دکھائے گئے تھے جس میں ۲۵ ہزار آدمیوں نے کام کیا تھا۔ یہ فلم بھی لاہور میں دکھائی جا چکی ہے ع۔ ا سے بگ فرنچ فلم۔ پکچر شو۔

تیار نہیں ہو جاتیں بلکہ اُنکے لئے جن مزید مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہ قابل ذکر ہیں۔ امریکہ کے مشہور و معروف ڈائرکٹر سیسل بی ڈی مل نے جب قبطیوں کے قدیم تاریخی واقعات کو متحرک تصاویر کے ڈرامہ بعنوان "دی ٹن کومینڈمنٹس" میں فلم کرنیکا تہیہ کیا تو مصر کا ایک قدیم شہر بنانیکی خاطر مغربی امریکہ کا ایک نہایت ویران اور چٹیل ریتلا میدان انتخاب ہُوا چنانچہ چوبیس میل وسیع و عریض ریتلی زمین پر اُس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ اس دشوار گذار مقام پر جو انسانی آبادی سے دو سو میل کے فاصلہ پر تھا دو ہزار پانچ سو آدمی۔ تین ہزار سے زائد جانور جن میں نو سو گھوڑے۔ تیس اونٹ۔ دو سو خچر اور سینکڑوں بھیڑ بکریاں۔ گائیں بیل۔ مرغ۔ مرغابیاں۔ کتے وغیرہ وغیرہ پہنچانیکا بندوبست کرنا تھا اور ایسی جگہ جہاں گاڑی یا موٹر کوئی چیز بھی کام نہ دے سکتی تھی اور پانی کا کچھ بندوبست نہ ہو سکتا تھا دو ہفتہ تک ان تمام جانداروں کی زندگی و صحت برقرار رکھنے کے لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کیا انتظام ہُوئے ہونگے۔ تین سو پچاس نجار اور دیگر کاریگر تمام ایکٹروں اور جانوروں کی رہائش کے لئے کیمپ بنانے پر معمور کئے گئے اور اس مہتم بالشان کیمپ میں پانچسو پچاس رہائشی اور دو بڑے کھانے کے خیمے جن میں دو ہزار آدمی کھانا کھا سکیں اور ایک خیمہ ناچنے اور دیگر تفریحات کے لئے نصب کیا گیا۔ چار خیموں کا ایک علیحدہ ہسپتال بنایا گیا جن میں تیس بیمار، ایک ماہر فن طبیب مع چار مددگاروں کے رہ سکیں اور بارہ خیمے جانوروں کے لئے نصب کئے گئے۔ ایکٹروں کی آسائش کو مدنظر رکھتے ہوئے بجلی کی روشنی اور سلسلہ ٹیلیفون کا مکمل انتظام کیا گیا اور ایک بڑے کیمپ میں ۲۳ ہزار گیلن پانی کی مقدار محفوظ رکھی گئی۔ اُس زمانہ کے لباس بنانے کے لئے ۲۳ ہزار گز کپڑا استعمال ہُوا اور ساٹھ ہزار روپے کے صرف سے گھوڑوں کے زین زمانہ قدیم کی طرز پر تیار کرنے پڑے اور اس تمام ساز و سامان کو بیس بڑے پہیہ کی گاڑیوں میں لاد کر منزل مقصود تک پہنچایا گیا۔ فرعونِ ثانی کے نام کا مشہور شہر "ریمیسس" جسے قرونِ اولےٰ میں بنی اسرائیل نے حکماً بنایا تھا، سات سو پچاس فٹ چوڑا اور ایکسو نوے فٹ بلند تعمیر ہُوا جسکے دروازہ پر چار قدیم فراعنہ مصر کے ۳۵۔۳۵ فٹ اونچے بُت نصب کرکے اُسکی خوبصورتی کو چار چاند لگا دئے۔ جس وقت اس شہر کی تصویر بن گئی تو ہر چیز ناکارہ سمجھی گئی چنانچہ اُس جگہ کے قریب جوارلی ایک میونسپل کمیٹی کو فراعنہ مصر کے وہ بت تحفتہً پیش کئے گئے جنہوں نے میونسپلٹی کی حدود قائم کرنیکی غرض سے اُنہیں مختلف سمتوں میں نصب کر دیا +

برعکس اسکے ہندوستان میں جو حالت ہے وہ کسی سلیم الطبع شخص سے مخفی نہیں۔ دو مہینے ہُوئے

مجھے لاہور میں ہندوستان کی ایک مشہور سینما کمپنی کا ڈرامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں پردوں سے بنائی ہوئی شاہی محل کی دیواریں ہوا سے لرز رہی تھیں۔ اُن تمام نقائص اور فروگذاشتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جو متحرک تصاویر کے ڈرامہ۔ فوٹوگرافی اور فن ایکٹری سے متعلق تھیں مجھے یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا کہ ایک ایسے فسانہ میں جو راجہ بھوج کی زندگی سے متعلق ہو گھوڑوں پر انگریزی زین۔ ایکٹروں کے پاؤں میں ولایتی جرابوں کے اُوپر سلمہ ستارے کی گرگابیاں اور مشین سے کٹی ہوئی مجلد ضخیم کتب میزوں پر دھری تھیں۔ اگر کمپنی کے اصحاب بست وکشاد نے اُس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کیا ہوتا تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ مخمل و اطلس کے یہ زریں ملبوسات۔ ایکٹرسوں کے انگریزی فیشن کے بال اور پھول رکھنے والی پٹاریاں اُس زمانہ سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھیں۔ لیکن اس بات کو بھی جانے دیجئے۔ آجکل اسی کمپنی کا ایک ڈرامہ "نورجہاں" لاہور میں دکھایا جارہا ہے جسکے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بُرا ڈرامہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ جس طرح تاریخی واقعات کا منہ چڑایا ہے وہ اس قابل ہے کہ ملک کے ہر کونے سے اُس کے برخلاف نفرت وحقارت کی صدا بلند ہو۔ حیرت ہے کہ ڈرامہ بنانے والوں نے کس دیدہ دلیری اور لائق نفرین جرات سے ایسے عوام الناس کی خدمت میں پیش کرنیکا حوصلہ کیا ہے۔ آج اگر اسلامی پریس میں جان ہوتی تو اس ڈرامہ کے برخلاف اتنی زبردست صدائے احتجاج بلند کی جاتی کہ ہندوستان کے سکوت وجمود میں ایک تلاطم پیدا ہوجاتا اور آئندہ پنڈت تلسی دت شیدا اور اُنکے دیگر حواریوں کو کبھی جرات نہ ہوتی کہ وہ اسلامی تاریخ کو ایسے بدنما رنگ میں جمہور کے سامنے پیش کرتے۔ تاریخی طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ جہانگیر کا شیرافگن کو محض نورجہاں کی خاطر مروا دینا ہندوستان کے ایک انصاف پسند شہنشاہ پر نہایت ذلیل وشرمناک اتہام ہے۔[1] لیکن شیدا صاحب نے یہیں تک اکتفا نہیں کی بلکہ دیگر بیہودگیوں کے ساتھ اکبر کے سامنے ارباب نشاط کے ہمراہ نورجہاں کا ناچ بھی دکھادیا۔ شروع سے لیکر اختتام تک بیشمار تاریخی اغلاط۔ فن کی فروگذاشتیں ایکٹروں کی ہر بات میں تصنع۔ بناوٹ اور سب سے بڑھ کر شیدا صاحب کی غلط اُردو اتنی غلط اور سوقیانہ کہ تھیٹر ہال کی دُھندلی روشنی میں دفتروں کے منشی۔ کاروباری لوگ۔ مدارس کے طالبعلم غرضیکہ ہر طبقہ ہر پیشہ اور ہر مذہب وملت کے افراد اُنکی "تاریخی واقفیت اور ادبی استعداد" پر بلند قہقہے لگا رہے تھے۔ کاش وہ اسجگہ بنفس نفیس

---

[1] ملاحظہ ہو جناب بینی پرشاد صاحب ایم۔ اے پروفیسر تاریخ ہند الہ آباد یونیورسٹی کا وہ تاریخی مضمون جو اُنہوں نے انڈین ہسٹاریکل رکارڈس کمیشن کے چوتھے جلسے میں بمقام دہلی پڑھا۔

موجود ہوتے تو اس تمسخر و استہزا اور لاحول کے جگر دوز کلمات سے انہیں اپنی ہر دلعزیزی اور کامیابی کا راز معلوم ہو جاتا اس کے ساتھ دوسری طرف ذوقِ تحقیق و تدقیق کا یہ حال ہے کہ جب نئی دنیا کے دو لڑکوں نے امریکہ کے مشہور صدر ابراہیم لنکن کی سبق آموز زندگی کا ڈرامہ بنایا تو کانگرس لائبریری کی پچاس ہزار کتب اور رسالے جو ہیں واجب التعظیم پریزیڈنٹ کی زندگی کے متعلق تھیں ایک ایک کر کے پڑھ ڈالیں ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان بڑے بڑے ڈراموں میں جو فاحش غلطیاں یوروپ امریکہ والے کرتے ہیں وہ بھی قابلِ عفو و پذیرائی نہیں۔ مجھے ہمیشہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا طریقہ عبادت ابھی تک ان لوگوں نے نہیں سمجھا۔ اسکے متعلق میں نے کارل لیمل صدر یونیورسل کمپنی اور اڈلف زوکر صدر پیرامائونٹ کمپنی کو ایسے ڈراموں پر تنقیدی خطوط لکھے جو ان لوگوں نے نہایت پسند کئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اول الذکر نے اپنے متعدد نئے ڈراموں کی نسبت میری رائے طلب کی اور مشرق میں اپنی تصاویر کی کامیابی کے متعلق کئی خطوط لکھے

"اصلیت" پر وہ لوگ اس حد تک فدا ہو چکے ہیں کہ اسکے مقابلہ میں وہ اپنی جان کی کوئی قدر و وقعت نہیں سمجھتے۔ ارک دان سٹراہیم جسکا نام سطور مندرجہ بالا میں کسی جگہ ضمناً بیان ہو چکا ہے ایک ڈرامہ "گریڈ" تیار کرنے کی خاطر چند ایکٹروں کو ساتھ لیکر "وادیٔ موت" کی طرف چلدیا، اس نیت پر کہ اس تپتے ہوئے صحرا میں جہاں دھوپ کی شدت اور پانی کی قلت، گرم لو کے تھپیڑے اور بادِ صرصر کے جھونکے چند منٹوں میں ہر اک جاندار کا خون خشک کر دیتے ہیں دو آدمیوں کی کملائی ہوئی صورتوں کی تصویر بنا سکے۔ اس اعلان نے متحرک تصاویر کی دنیا میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ وادیٔ موت کے گرد و نواح کے باشندوں اور مختلف سیاحوں نے اُسے اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر کوئی دلیل۔ کوئی خوف اور موت کا کوئی زہرہ شگاف منظر اس کی استقامت قلب اور صمیمیتِ عزم پر غلبہ نہ حاصل کر سکا۔ اس استفسار پر کہ آخر بات کیا ہے۔ کیا ایسی تصویر بنانے کی خاطر اور کوئی موزوں مقام نہ تھا؟ تو اس بالغ نظر ڈائرکٹر نے اپنی مخصوص یک چشمہ عینک کو درست کر کے نہایت متانت سے جواب دیا "نہیں۔ میں کس طرح ایسے آرام دہ مقامات پر اُن نگاہوں کو کیمرہ میں محفوظ کر سکتا تھا جو آفتاب کی صبر شکیب دھوپ گرم بالو کی تپش اور تھوڑے سے پانی کی موجودگی میں میرے دل پر تیر برسا رہی تھیں آخر اس صبر آزمائی کے ساتھ میں نے "بناوٹ" کو "اصلیت" پر قربان کر دیا اور ایک ایسا منظر متحرک تصاویر کے شیدائیوں کی خاطر محفوظ کر لیا جسے دیکھ کر فولاد صفت دل پانی ہو کر آنکھوں کی راہ بہہ جائینگے"۔ لیلین گش آجکل رومتہ الکبرا

---

سلہ میری مراد آل اینڈ رے ریکٹ سے ہے۔

کی سطوت قدیم کے متعلق اٹلی میں ایک تصویر بنا رہی ہے جسے شائد آئندہ سال ہم ہندوستان میں دیکھ سکینگے۔
اس تصویر کی تیاری کے دوران میں اسکا ڈائرکٹر ہنری کنگ موسم سرما میں کمپنی کو ایک ایسے گاؤں میں لے گیا جو تین دفعہ کوہ آتش فشاں کی شعلہ ریزی سے برباد ہو چکا تھا۔ اس گاؤں میں وہ تین ہفتہ سے متواتر تصاویر بنا رہے تھے کہ ایک دن یکایک طلوع آفتاب سے کچھ دیر قبل اس آتش فشاں پہاڑ نے گرجنا شروع کیا اور آگ کے خوفناک شعلے اسکے دہانے سے نکل نکل کر آسمان کی طرف جانے لگے اور آتش رقیق کثیر مقدار میں تیز رفتاری کے ساتھ گاؤں کی طرف بہہ نکلی مگر اس قدرتی منظر کو فلم کرنیکے لئے انہوں نے اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹایا اور زندگی کے سودے پر تمام ایکٹر اپنا پارٹ ادا کرتے گئے جبکہ گاؤں والے اس تباہ کن آتشباری سے تمام مال و اسباب ہیں چھوڑ کر صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی عزیز جانوں کو بچا کر برق رفتاری سے گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ لیکن ایکٹروں کا یہ حال تھا کہ نہ تو اپنی جان کا خوف۔ نہ بھاگنے والوں کی سراسیمگی۔ نہ بچوں کا بلکنا نہ کمزور دلوں کی چیخ و پکار کوئی ایسی بات نہ تھی جو انہیں اپنے فرض کی بجا آوری سے روک دیتی اور یہ فقید المثال ڈرامہ یوں ادھورا رہ جاتا۔ لیکن کام چھوڑا بھی تو اس وقت کہ مسموم ہوائیں تمام ایکٹروں کو بیمار کر چکی تھیں اور آگ کی تپش سے ایک کیمرہ اس قدر گرم ہو گیا کہ پندرہ سو فٹ فلم جل کر راکھ ہو گئی اور فوٹو گرافر گرمی کی حدت سے غش کھا کر گر پڑا۔ اس تصویر موسومہ "دی وائٹ سسٹر" کے بنانے والوں کا دعوے ہے کہ اگر کوئی پتھر دل بھی اسے دیکھے تو وہ لیلین گش کی بیچارگی اور مصیبت پر فخر کے ساتھ چند آنسو بہا دیگا۔ شائد آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ ایسے ڈراموں کے اول اول دیکھنے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔
جیمز کروز کا مشہور ڈرامہ "دی کورڈ ویگن" جب پہلی مرتبہ گیارہ مارچ اتوار کی رات پلازا ہوٹل میں دکھایا گیا تو نیویارک سوسائٹی کے لیڈروں نے چالیس روپے فی کس اور تین سو روپے سے لیکر چار سو روپے بکسوں میں بیٹھ کر دیکھنے کی فیس ادا کی۔ ان رقوم سے شائد آپ انکی آمد و خرچ کا حساب لگا سکینگے۔

آپ مجھ سے سوال کر سکتے ہیں کہ آخر اتنا روپیہ صرف کر کے اور اتنی محنت شاقہ برداشت کرنے کے بعد ان سرمایہ داروں کا روپیہ کمانے کے علاوہ کچھ اور مقصد بھی ہے۔ اس بات سے مجھے بھی انکار نہیں کہ انکا مقصد اولیں تو روپیہ کمانا ہی ہے لیکن اسکے ساتھ تبلیغ مذہب۔ تعلیم اخلاق و عادات، تربیت اطفال، سوسائٹی کی اصلاح اور رسومات قبیح کا انسداد انکے مطامع نظر ہیں۔ آج یورپ و امریکہ اور آسٹریلیا کی متعدد تعلیمگاہوں اور متعدد جماعات نے سینما کے ذریعہ تعلیم دینی شروع کر دی ہے۔ لڑکے نپولین بوناپارٹ یا شاہجہان کے

حالات زندگی اوراق کتب سے رٹ رٹ کر یاد نہیں کرسکتے جس قدر جلد کہ ایک فلم دیکھنے سے تمام حالات لوح دل پر نقش ہوجاتے ہیں۔ کتنے قابل رشک ہیں میرے لئے ایک ننھی سی لڑکی کے الفاظ جو متحرک تصاویر کے ایک تھیٹر میں سیسل بی ڈی ل کی متذکرہ بالا تصویر "دی ٹن کومینڈمنٹس" اپنی ماں کے ہمراہ دیکھ رہی تھی کہ اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہنے لگی "امی۔ اگر میں اگلے توار گرجے جاؤں آپکو تو کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔ شفیق ماں کی آنکھوں میں ان تاثرات نے پانی بھر دیا وہ خوشی سے اُس کا منہ چوم کر کہنے لگی "نہیں جان مادر بخوشی جایا کرو"۔ کیا مسٹر ڈل ایس سے زیادہ اپنے کام کی داد کی توقع کرسکتا ہے؟ آج دنیا میں کوئی کام۔ خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ تجارتی ہو یا اخلاقی بغیر وسیع پراپیگنڈا سر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ گذشتہ عالمگیر جنگ کے ایام میں ترکوں[2]۔ اتحادیوں اور جرمنوں کے برخلاف محارب اقوام اپنی بساط موافق متحرک تصاویر کے ذریعہ اپنی "ہمدردی" اور "سچائی" کی نشر و اشاعت کرتی رہیں۔ آج جمہوری سلطنتوں میں صدر کے انتخاب کے لئے انہیں تصاویر سے کام لیا جاتا ہے اور کیا تعجب ہے کہ اگر دنیا اسی رفتار سے شاہراہ ترقی پر گامزن رہی تو ہندوستانی کونسلوں اور بلدیات کے امیدوار بھی اپنے حریفوں کے برخلاف انہیں تصاویر سے کام لے سکیں۔ چند سال ہوئے امریکہ میں ایک رائج الوقت قانون کی رُو سے باپ کو لڑکے کے مرجانے پر یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی اولاد کی امانت کو جس طرح چاہے استعمال کرے خواہ اُسکی بیوہ نانِ شبینہ کی محتاج ہوکر دربدر دریوزہ گری کرتی پھرے۔ ایسے قانون اور اُسکے تباہ کن نتائج سے متاثر ہوکر مشہور فسانہ نگار عورت کیہ ولائین ابیٹ سٹینلے نے ایک ایسا زبردست ناول لکھا کہ امریکہ کی قانون ساز مجلس کے اراکین کے برخلاف ایک شورش ایک جہاد برپا کر دیا۔ ادھر انجمن ارباب متحرک تصاویر نے صنفِ نازک کے اس حامی کی تصنیف لطیف کو فلم کر کے ملک بھر میں پھیلا دیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت سلطنتِ متحدہ کو تمنائے عمومی کے سامنے مجبوراً سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

میرے بہت سے احباب مجھ سے اکثر استفسار کرتے ہیں کہ ایکٹر لوگ جو اتنی "ناقابل تسلیم" تنخواہیں پاتے ہیں اس روپے کو کس مصرف میں لاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اخراجات کا حال بھی انکی آمدنی کی طرح داستان الف لیلہ سے کم دلچسپ نہیں۔ سب سے پہلے انکی ڈاک کا خرچ ملاحظہ فرمائیے۔ میری پکفورڈ اور ڈگلس فیربینکس دونوں میاں بیوی کو ایک ہفتہ میں صرف بیس سے بائیس ہزار خطوط کرۂ ارض کے ہر کونے سے موصول ہوتے ہیں

---

۱؎ دی لیڈیز ہوم جرنل۔

۲؎ ترکوں کے خلاف کئی ایک فلمیں ارمنوں کی جھوٹی داستانوں کے متعلق بنائی گئی تھیں جن میں "آکشن آف سولز" خاص طور پر مشہور ہوئی۔

اتنی بڑی ڈاک کو جو شاید دنیا میں کسی خوش نصیب جوڑے کو موصول نہیں ہوتی، خود تو وہ دیکھ نہیں سکتے۔ اسکے لئے اُنھوں نے تین چار سیکریٹری اور ایک ڈائرکٹر ملازم رکھا ہے۔ اس عملہ کی تنخواہ کو نظرانداز کرکے اگر اُن خطوط کے ٹکٹوں۔ کاغذ اور لفافہ کی قیمت دیکھی جائے تو کتنے ہزار ماہوار تک پہنچ جاتی ہے اسکے علاوہ اُنکی تصاویر کی مانگ کا یہ عالم ہے کہ بعض کمپنیوں نے ایکٹروں کی تصاویر شائع کرنیکے علیحدہ محکمے کھول رکھے ہیں خطوط کی بھرمار صرف میری پکفورڈ اور اُسکے خاوند تک ہی محدود نہیں بلکہ چارلی چیپلن۔ نارما ٹالمیج۔ رڈلف ویلنٹینو۔ تھامس میہگن اور لیلین گش کی تعداد خطوط بھی چار سند سوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اسکے علاوہ اُنکے خیراتی فنڈ بھی لاکھوں کی رقوم تک پہنچے جاتے ہیں۔ مذہبی کاموں اور فلاح عام کے امور میں شاید دیگر امراسے انکی امداد ہی سب سے زیادہ گرانقدر ہے۔ اسکے بعد اُنکا ذاتی خرچ الامان!! امریکہ کے محکمہ بحری کا بیان ہے کہ متحرک تصاویر کی ایک لاعبہ (ایکٹرس) جب چند دنوں کیلئے سیاحت یورپ کو نکلتی ہے تو اپنے ہمراہ پچیس شاندار لباس جنکی قیمت فی لباس آٹھ سو روپیہ سے لیکر دو ہزار روپیہ تک ہوتی ہے۔ دس درجن جرابوں اور چھ درجن دستانوں کے جوڑے اسکے علاوہ ہر لباس کے رنگ کے مطابق بوٹ اور سلیپر جن میں ہر ایک جوڑے کی قیمت اسی روپے سے زائد ہوتی ہے اور اکیس بیس سے لیکر چار سو روپیہ فی ٹوپی کی پچاس ٹوپیاں دیگر ساز و سامان کے علاوہ اُنکے ہمراہ ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ کوئی ایکٹرس اپنے لباسوں سے بھرے ہوئے ۶۸ ٹرنک ہمراہ لیگئی تھی۔ علاوہ ازیں اُنکی شاہی موٹر گاڑیوں بیش قیمت زیورات بمکانات۔ نج کے ملازمین۔ تفریحات۔ خوراک۔ مہمانداری وغیرہ وغیرہ کا خرچ اُنکی آمدنی کے مقابلہ میں چنداں کم نہیں ہوتا۔

عام لوگوں کا دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ انہیں کون کون سے ڈرامے دیکھنے چاہئیں۔ اسکے متعلق میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ البتہ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ میں کون کون سے ڈرامے دیکھونگا تو میری فہرست اُن ڈراموں کے علاوہ جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔ مندرجہ ذیل ہے (۱) دی تھیف آف بغداد (۲) اے وُومین آف پیرس (۳) ڈاؤن ٹو دی سی اِن شپ (۴) سکیرا ماؤچ (۵) روما (۶) امریکہ (۷) اے بولٹ آف فلینڈرس (۸) دی برتھ آف اے نیشن (۹) ہنٹنگ بگ گیم اِن افریقہ (۱۰) ڈورتھی ورنن آف ہیڈن ہال (۱۱) اِف ونٹر کمز (۱۲) والڈ آرنجز وغیرہ وغیرہ +

یہ ہے اُس ڈرامہ کے عہد شباب کی مختصر سرگذشت جسکا آغاز مذہبی عبادت سے ہوا اور نہیں معلوم کہ اس فن میں آئندہ کتنی ترقی ہوگی چند روز ہوئے دنیا کے مشہور مورخ ایچ جی ویلز نے ایک مضمون تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آج سے چند صدیاں بعد آنیوالی نسلیں موجودہ تمدن اور تہذیب حاضرہ کو اُنہیں نگاہوں سے دیکھینگی جن نظروں سے ہم ازمنہ ماضیہ کی علم طبیعات سے بے بہرہ اقوام کو دیکھتے ہیں۔ اس سچائی کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ معلوم قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق انسان ابھی کہاں تک قدرت کے رازہائے سربستہ کے انکشافات سے متمتع ہوتا چلا جائیگا۔

محمد ضیاء الدین شمسی

# افکارِ پریشاں

حُسن کی دُنیا میں اے دوست تجھے لاثانی کردوں گا
تجھ پر شستم تخیّل کی اعجاز بیانی کردوں گا

تیرے جلووں کا میں رنگ بھروں گا اپنے نغموں میں
دُنیا کو ان زرّیں نغموں سے نورانی کردوں گا

تیرا حسین مرقع کھینچوں گا میں دل کش نظموں میں
سب کے ساتھ تجھے بھی تصویرِ حیرانی کردوں گا

وہ روٹھیں کہ منیں کچھ بھی ہو اب تو یہی بس ٹھانی ہے
اُن کے گوش گذار میں دل کی رام کہانی کردوں گا

تا دمِ مرگ محبت کے ہنگامے مجھ سے نہ چھوٹینگے
صبح پیری کو بھی چراغِ شامِ جوانی کردوں گا

مجھ سے نہ پوچھو اپنی جفا کا حال نہیں شرماؤ گے
پانی پانی ہوجاؤ گے پانی پانی کردوں گا

دل کی بربادی پر دیدۂ تر طوفان اُٹھائینگے
اِس غم میں اِن چشموں کو اِک دن طوفانی کردوں گا

یاد مری باقی رہ جائے گی دنیائے محبت میں
عمرِ فانی کو میں نذرِ حسنِ فانی کردوں گا

میں نے مانا دل ہے ترا فولاد مگر یہ یاد رہے
اپنے گدازِ عشق سے میں فولاد کو پانی کردوں گا

میرے قومی نغمے بھارت کو جاپان بنائیں گے
ہندی تجھ کو ہندوستانی سے جاپانی کردوں گا

حبِّ وطن کے جلووں سے بھر دونگا تیرے سینے کو
روشن تیرے دل میں یہ شمعِ ایمانی کردوں گا

ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کی سنگت بن جائے گی
اس دیوی پر سب کے تعصب کی قربانی کردوں گا

تاجور

# ذمہ داری

ایک میگزیمٹ تارپیڈو میں اس قدر قوت مخفی ہے کہ وہ ایک بڑے سے بڑے جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے. لیکن اُسکی ان تمام مجموعی تباہ کن طاقتوں کا صحیح اندازہ کسی معمولی حرکت وجنبش سے نہیں کیا جاسکتا۔ بچے اسکے ساتھ بغیر کسی خوف کے برسوں کھیل سکتے ہیں، اُسے گیند کی طرح پھینک سکتے ہیں. اور معمولی سے معمولی دیواروں پر پٹک سکتے ہیں، البتہ اسکی انتہائی قوتوں کا اس وقت اظہار ہوسکتا ہے جبکہ یہ کسی ایسی توپ سے چلایا جائے، جس میں ایک ایک فٹ چوڑی فولاد کی چادریں لگی ہوں +

ہر شخص کچھ نہ کچھ اپنی بڑی طاقتوں سے ناواقف ہے اور اُس وقت تک بے خبر رہتا ہے جبتک کہ اُس پر کوئی خاص ذمہ داری عائد نہ ہو یا وہ کسی سخت موقع اور زندگی کی کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہو +

جنرل گرانٹ کی پوشیدہ طاقتوں کو کاشتکاری، نجّاری، اسٹور کیپنگ، میگزین دارا اور اسی طرح گاؤں کے دوسرے معمولی کام بیدار نہ کرسکے. مگر سول وار نے اسکی تمام خوابیدہ طاقتوں کو جگا کر اسکی شہرت میں چار چاند لگا دئے حقیقت میں اسکے اندر بجلی سے بھی زیادہ طاقتور قوتوں کا خزانہ موجود تھا، لیکن اُنکے اظہار کیلئے اسی سول وار کی ضرورت تھی، معمولی واقعات اور سطحی تجربات اسکی طاقتوں کو بیدار نہ کرسکتے تھے، اس لئے کہ معمولی واقعاتِ زندگی میں رہ کر وہ ہمیشہ اپنی قابلیتوں سے ناواقف رہتا، جس طرح کہ وہ خطرناک تارپیڈو اس وقت تک پھٹنے سے محفوظ رہتا ہے جبتک کہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے +

ابراہیم لنکن کی پوشیدہ طاقتوں کو کاشتکاری، نجّاری، پیمائش، حفاظتِ اشیا، قانون دانی، یہانتک کہ یونائیٹڈ اسٹیٹ کی کانگریس تک بیدار نہ کرسکی۔ اور اسکی وہ برق صفت طاقتیں یونہی بیکاری و تعطل میں پڑی رہیں، لیکن ایک قوم کو مشکلات ومصائب سے نکالنے کی ذمہ داری نے اسکی تمام قوی طاقتوں کو متحرک و بیدار کردیا کہ اس سے پہلے شاید ہی امریکہ جیسے براعظم میں کسی بڑے سے بڑے انسان میں ایسی عجیب وغریب طاقتوں کا اظہار ہُوا ہو +

اگرچہ ابراہیم لنکن تاریخی حیثیت سے ایک بہت بڑی شخصیت کا انسان ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو اسکی شخصیت کو نمایاں کرنے والی صرف سول وار ہوگی +

قوم کو مصیبت سے نکالنے کی ذمہ داری نے جسکے لئے ملک کو اسکی ذات پر کافی بھروسہ تھا اس کی محفوظ طاقتوں اور اُن پوشیدہ فتوحات کی صلاحیتوں کو مشتعل کر دیا جن کے امکان کا اُسے خواب میں بھی خیال نہ تھا۔

تاریخ کے بہت سے مشہور انسان اپنی طاقتوں کا اس وقت تک اظہار نہ کر سکے جب تک کہ انہوں نے سوائے استقلال و تدبر کے سب کچھ اپنے پاس سے نہ ضائع کر دیا ہو۔ انکی شہرت اسی وقت ہوئی ہے جب انہوں نے اِنتہائی افلاس و تنگدستی، مصیبت و بے سروسامانی میں مبتلا ہوکر اسکے خلاف جد و جہد کی ہے اور مصیبت سے نجات پانے کے لئے کوئی نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔

"انسان اپنی حقیقی طاقتوں کا سبق سختی و مصیبت کے مدرسے میں لیتا ہے"

وہ بڑے بڑے مضبوط اور طاقتور لوگ جنکی ذات پر تہذیب و تمدن بجا طور پر فخر کرسکتا ہے ہمیشہ اپنی آپ مدد کرنے کے عادی تھے، انکے قدم میدانِ عمل میں بڑھ کر پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اکثر انہیں روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے زمین کے ہر ہر انچ پر جنگ کرنی پڑی ہے۔

حقیقت میں ایسے ہی لوگ دُنیاوی مشکلات کو فتح کرنے والے اور اپنی سخت دشواریوں کے آقا ہیں جو باوجود موانعات کے ان پر غالب آکر اپنی طاقتوں کا نشو و نما کرتے ہیں۔

بہت سے تاجروں کو اپنی طاقتوں کا علم اس وقت ہوا ہے۔ جب وہ بدقسمتی یا کسی ناگہانی مصیبت سے بالکل مفلس ہو گئے ہیں اور ان کا سرمایۂ تجارت بالکل تباہ و برباد ہو گیا ہے، اس طرح بہت سے مرد اور عورتوں کی اعلیٰ قابلیتیں اس وقت ظاہر نہیں ہوئیں جبتک کہ وہ یہ خیال کرتے رہے کہ فلاں تجویز اور فلاں شئے ہماری مدد کریگی لیکن جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو گئے اور اُنکی تمام عزیز چیزیں ان سے لے لی گئیں تو وہ قابلیت کے انتہائی مدارج پر پہنچ گئے۔

ہماری اعلیٰ قابلیت اور انتہائی طاقتیں فطرت کی اس قدر عمیق ترین گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں، کہ بسا اوقات انکو بیدار کرنے کے لئے کسی سخت ضرورت اور ناگہانی مصیبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہمارے پیچھے کے تمام پل جل چکے ہیں اور تمام راستے مسدود ہیں اور اب ہمیں کسی قسم کی امداد نہیں مل سکتی، تو اُس وقت اپنی حفاظت کے لئے خود بخود ہماری حقیقی طاقتوں کا اظہار ہوگا۔ مگر جبتک ہمیں بیرونی امداد ملنے کی توقع رہیگی ہم اپنی خداداد طاقتوں سے بیخبر رہینگے۔

بہت سے نوجوان مرد اور عورتیں کسی عزیز کے مرجانے، تجارت کے تباہ ہوجانے، یا اسی قسم کے

مصائب میں مبتلا ہو جانے کے بعد اپنی حقیقی طاقتوں سے واقف ہوئی ہیں۔ جبکہ انہوں نے چارو ناچار اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے جدو جہد کی ہے +

طاقت کی نشوونما کے لئے ذمہ داری سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، جہاں ذمہ داری نہیں ہے وہاں ترقی کا دروازہ بھی بند ہے، وہ لوگ جو کسی ذمہ دارانہ حیثیت میں نہیں پڑنا چاہتے وہ کبھی اپنی حقیقی طاقتوں کی تہذیب و اصلاح نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی دوسروں کی ماتحتی میں گزاری ہے، شاذ و نادر ہی اپنی طاقتوں سے واقف ہوتے ہیں، اسکا اصلی سبب یہ ہے کہ انہیں غیر ذمہ دارانہ حیثیت میں رہ کر اپنی طاقتوں کی نمائش اور تہذیب و اصلاح کا موقع ہی نہیں ملتا اور نہ وہ میدان ترقی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ انکی تمام جدوجہد اور خیالات صرف اُنہیں لوگوں کے لئے وقف ہو جاتے ہیں جنکے وہ ماتحت ہوتے ہیں، اُنہوں نے تنہا اپنی ذات پر اعتماد کرکے آزادی کے ساتھ اپنی فلاح و بہبود کے متعلق اس لئے کبھی غور نہیں کیا کہ وہ اسکے لئے مجبور نہ تھے نہ انہوں نے کبھی اپنی طاقتوں کی نشوونما کی اور نہ اختراعی قوتوں کو اپنے صحیح معنی میں سمجھا، جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ انکی آزادانہ کام کرنے کی تمام صلاحیتیں، ذاتی اعتماد، دانشمندی اور تمام وہ جذبات جن سے دل میں ممکنات کے مدّ پیدا ہوتے ہیں فنا ہو گئے، کیونکہ اختراعی، اجتماعی، ضرورتوں کا مقابلہ کرنے اور کسی کام کو انجام تک پہنچانے کی تمام قابلیتیں انسان میں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب اس پر کوئی خاص ذمہ داری ہو اور وہ اس میں رہ کر برسوں عملی طور پر کام کرتا رہے +

دُنیا میں اس فلسفے سے زیادہ کوئی خطرناک فلسفہ نہیں کہ جس شخص میں جو قابلیت ہوگی وہ خود بخود ظاہر ہو جائیگی، حالانکہ طاقتوں کے اظہار کے لئے ایک بہت بڑی حد تک واقعات، ضروریات اور ایک بیدار ماحول کی ضرورت ہے +

ہمارے کارخانوں اور دفتروں میں محرری کا کام کرنے والوں میں بھی اس قدر طاقتیں پوشیدہ ہیں کہ اگر انہیں مواقع اور ذمہ داریاں میسر آجائیں تو وہ اس کام سے بہت زیادہ بڑے کام انجام دے سکتے ہیں +

وہ غریب کلرک جو میزوں کے پیچھے اپنی دوکانداری کے کاموں میں مشغول ہیں انہیں کیا خبر کہ انکے اندر ہنرمندی اور انتظامی قابلیت کی کیسی کیسی عجیب طاقتیں خوابیدہ ہیں +

یہ ضروری نہیں کہ وہ کامیاب اور باہمت لوگ جو صرف اپنی ذاتی کوشش سے میدانِ ترقی میں آگے نکل گئے ہیں بس اُنہیں پر ترقیاں ختم ہو گئی ہیں بلکہ بچھڑے ہُوئے لوگوں میں بھی مطابقت کی طاقت

موجود ہے ۔

یہ خیال غلط ہے کہ ہر بڑے آدمی میں ترقی کی تمام قوتیں موجود ہیں ، بسا اوقات قابلیت کے پردے میں کم ہمتی و بزدلی پوشیدہ ہوتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ بہت سے اعلیٰ قابلیت کے لوگ جو دوسری جگہ ملازم ہوتے ہیں اپنا ذاتی کام شروع کرنیکے خطرات سے ہچکچا کر اُس سے دست بردار ہو جاتے ہیں ، اگر انہیں لوگوں پر کوئی زبردست ذمہ داری عائد کر دیجائے ، اور اُنہیں کوئی نہ کوئی کام کرنے پر مجبور کر دیا جائے ، تو اس وقت انکی پوشیدہ طاقتوں کا اظہار ہو سکتا ہے ، اور انکی قابلیت ، دانشمندی ، تدبّر ، ذاتی اعتماد اور کسی کام کو انجام تک پہنچانیکی طاقتیں بیدار ہو سکتی ہیں ۔

میں ایک ایسے نوجوان کو جانتا ہوں جس نے ایک مختصر سی ترقی کے بعد صرف چھ مہینے میں ایسی حیرتناک ترقی کر لی جس کی نہ اسکے دوستوں کو اُمید تھی اور نہ اُنکے خیال میں تھا کہ یہ ایسی محیر العقول طاقتوں کا مالک ہے ، لیکن پیہم ذمہ داریوں اور مسلسل واقعات نے اُسے اسی ترقی کے لئے بنایا تھا ۔

شروع میں اسکو ایک بہت چھوٹے دم کا نہایت قلیل سرمایہ دیا گیا تھا مگر کام کی ذمہ داریوں نے اسکی پوشیدہ طاقتوں کو یہاں تک بیدار کیا کہ خود اسکو خواب میں بھی اسکی اُمید نہ تھی ۔

آج لاکھوں مرد اور عورتیں اپنی طاقتوں کی نمائش کیلئے کسی موقع کے منتظر ہیں اور جب کوئی ایسا موقعہ یا ذمہ داری اُن پر آجائیگی تو وہ بڑے سے بڑے موانعات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائینگے ۔

بعض کارخانہ داروں کو اپنے اُن منتظمین کی موت سے جو اپنی غیر معمولی انتظامی قابلیت سے پورے کارخانے کو منتظم حالت میں رکھتے تھے سخت نقصان اُٹھانا پڑا ہے اور اس قسم کے واقعات رُونما ہونے پر اُنہیں بُرے نتائج کے ساتھ ساتھ اس کا بھی یقین ہوتا ہے کہ اب اسکی جگہ پُر نہ ہو سکیگی لیکن جب وہ کسی شخص کی تلاش کرتے ہیں تو بسا اوقات وہ شخص جو اپنے پیشرو کے ماتحت کام کر چکا ہے اس جگہ کے لئے اس سے بھی زیادہ موزوں ثابت ہوتا ہے ۔

نوکروں پر ذمہ داری عائد کرنے سے کبھی خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے ، کیونکہ وہ ذمہ داریوں ہی کی وجہ سے اس قدر جلد اپنی قابلیت و اہلیت کا ثبوت دینگے کہ خود تمہیں اُن پر تعجب ہوگا ۔ بہت سے لوگ اپنے کارخانوں کے لئے ایسے آدمیوں کی تلاش کرتے ہیں جو انکے ضروری کاموں کو بخوبی انجام دے سکیں ، لیکن بعض وقت وہ عام لوگوں کی قابلیت کا اندازہ نہیں کر سکتے ، اور یہی خیال کیا کرتے ہیں کہ اسجگہ

پر وہ شخص رکھا جائے جو اس سے پہلے ان کاموں کو انجام دے چکا ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بغیر کام دئے ہوئے وہ کس طرح تجربہ حاصل کرسکتے ہیں ؛

ہمارے بڑے بڑے کارخانوں میں بیسیوں ایسے نوجوان موجود ہیں جو اگرچہ اس وقت دوسروں کے ماتحت ہیں لیکن وہ ان سے قابلیت اور کام کرنے کی صلاحیت میں کسی طرح بھی کم نہیں ہیں ؛

دُنیا میں کوئی عہدہ ایسا نہیں ہے جو اُس عہدے دار کے بعد ویسا ہی یا اس سے بہتر طریقہ پر پُر نہ ہوسکے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے پڑے ہوئے ہیں جو باوجود قابلیت کے ابتک شہرت کے اسٹیج پر نہیں آئے۔ اور نہ لوگ انکی خدا داد طاقتوں سے واقف ہیں ؛

کسی مشیر سلطنت کے علیحدہ ہوجانے پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ اب اسکی جگہ پُر نہ ہوسکیگی، مگر انکی اُمید کے خلاف کسی چھوٹے سے گاؤں اور نیچے طبقے سے کوئی ایسا شخص نکل آتا ہے جو اسکی جگہ کو پُر کرکے اس ضرورت کا خاتمہ کردیتا ہے ؛

کسی شخص کی محفوظ و خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرنیکے لئے صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ اُس پر کسی نہ کسی طرح کی ذمہ داری عائد کردیجائے، ہم میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کبھی آرام و آسائش میں رہ کر ترقی نہیں کرسکتے۔ انکے لئے ضروری ہے کہ وہ افلاس و تنگدستی کی مصیبت میں مبتلا ہوں ؛

اگر ہمارا جہاز روبن سن کروسو کی طرح تباہ ہوجائے اور ہمارے پاس کسی تنہا جزیرے میں سوائے ہاتھ، دماغ اور اپنی پوشیدہ طاقتوں کے اور کچھ نہ رہے، تو یقیناً اس وقت ہماری طاقتوں کا خود بخود اظہار ہوگا ؛

ایک جہاز کا کپتان اس وقت تک اپنے سپاہیوں کی دلیری و شجاعت نہیں جان سکتا۔ جبتک کہ طوفان یا جہاز تباہ ہوجانیکا حادثہ پیش نہ آئے ؛

ہمارے اندر ممکنات کی جو زبردست طاقتیں پوشیدہ ہیں ہم اُن سے اُس وقت تک ناواقف رہینگے جبتک کہ سخت ضروریات پیش نہ آئیں جو ایک معمولی آدمی کو ایک زبردست انسان بنادیتی ہیں ؛

ایک آگ بجھانے والے انجن پر کام کرنیوالا لڑکا کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ اُسکی فطرت میں کس قدر شجاعت و بہادری مضمر ہے اور وہ دُنیا میں اُن لوگوں سے کس قدر زیادہ ترقی کرسکتا ہے جو اس وقت بڑے بڑے مناصب پر مامور ہیں، مگر جب کسی عمارت میں آگ لگجاتی ہے تو یہی لڑکا جسکی

طرف لوگ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے اور جس نے کبھی اپنی قابلیت کا کوئی اظہار نہ کیا تھا چند لمحوں میں نہایت شجاعانہ طاقتوں کا اظہار کرکے لوگوں کو حیرت میں ڈالدیتا ہے۔ وہ فوراً جلتے ہُوئے مکان میں گھس جاتا ہے، جس میں دھواں بھرا ہوتا ہے اور اسکے ہاتھ اور تمام جسم جُھلستا ہوتا ہے مگر وہ ان موانعات کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ اور سینکڑوں آدمیوں کی جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں جانیں بچالیتا ہے، چنانچہ ایک جہاز کی تباہی کے موقعہ پر ایک غریب مسافر کشتیوں کے ذریعہ اُن لوگوں کی جانیں بچاکر جو اپنے حواس کھو چکے تھے اپنے وقت کا ایک بہادر ترین انسان بن گیا +

اسی طرح ایک اسپتال میں اتفاقیہ آگ لگ گئی اور حالت نہایت خطرناک ہوگئی، لیکن اس نے ایک کمزور اور بیمار لڑکی کی اُن تمام قوتوں کو بیدار کردیا جو ایسے ہی موقعوں کی منتظر ہوتی ہیں۔ اس نے نہایت بہادری کے ساتھ آگ کو قابو میں لاکر اسے فرو کردیا۔ طوفان اور آگ. تباہی و بربادی کے موقع پر جس قدر مشہور کام کئے گئے ہیں وہ انکے وقوع سے قبل اُن لوگوں کی نسبت ناممکن خیال کئے جاتے تھے جنہوں نے انہیں انجام دیا ہے +

بہت سے لوگ اپنی طاقتوں سے اُس وقت تک بیخبر رہتے ہیں، جبتک کہ ان پر کوئی مصیبت نہ آئے یا وہ کسی سخت ضرورت سے مجبور نہ ہوجائیں +

جب تک انسان، ضرورت، تفکرات اور کسی نقصان میں مبتلا نہ ہو وہ ہرگز یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ اسمیں کام کرنیکی کیسی عظیم الشان طاقتیں موجود ہیں +

ضرورتیں اس وقت تک مخفی طاقتوں کو ابھارنے کے لئے ناکافی ہیں جبتک کہ انسان ان کا مقابلہ کرنے کے لئے خود تیار نہ ہوجائے +

مجھے بہت سی ایسی مثالیں معلوم ہیں جبکہ مربیّوں کے مرجانے یا موروثی جائداد سے محروم ہوجانے کے بعد وہ ناز و نعم میں پلی ہُوئی لڑکیاں جنھوں نے اس مصیبت سے پہلے نہ کبھی کوئی کام کیا تھا، نہ کسی تجارت کا کوئی تجربہ تھا اور نہ وہ اپنی زندگی بسر کرنیکا کوئی طریقہ جانتی تھیں، مگر اس مصیبت کی بدولت وہ بہت جلد اپنی حقیقی طاقتوں سے واقف ہوگئیں اور اُن میں کام کرنیکی ایک زبردست صلاحیت پیدا ہوگئی۔ حالانکہ یہ طاقتیں اُن میں پہلے بھی موجود تھیں مگر ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان سے بالکل بے خبر تھیں +

وہ نوجوان جو کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے کسی ذمہ دارانہ عہدے پر مامور ہو جاتے ہیں وہ چھ مہینے کے بعد اس قدر بدل جاتے ہیں کہ پھر اُنہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے، اسکے ساتھ ہی اُن میں وہ تمام مردانہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کے حصول کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہوگا +

ذمہ داری ہی انسان کو انسان بناتی ہے، یہی ناگہانی مصیبت کے وقت ایک ناتجربہ کار عورت کو دُنیا وی کشمکش کا مقابلہ سکھاتی اور بتاتی ہے کہ وہ کس طرح اپنا کام شروع کرکے اپنے متعلقین کی متکفل ہو سکتی ہے +

بہت سے لوگ اپنی قابلیت پر بھروسہ نہیں کرتے اسکی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اُنہیں اپنی طاقتوں کا صحیح اندازہ کرنے کا کوئی موقع پیش نہیں آیا +

ہمیشہ ایک ہی اصول اور ایک ہی لائحہ عمل پر کام کرنے سے انسان کی دوسری نئی قابلتیں بیدار نہیں ہوتیں، یہ جاننے کیلئے کہ کون کون سی طاقتیں ہمارے اندر موجود ہیں سب سے پہلے اپنی دماغی قوتوں کی نشوونما اور انکی تہذیب واصلاح کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے +

میں ایسے بہت سے نوجوانوں کو جانتا ہوں جو بجز اپنے، تمام دوسرے لوگوں پر بھروسہ رکھتے ہیں، انکو یقین ہے کہ دوسرے لوگ جس کام کو چاہیں انجام تک پہنچا سکتے ہیں، مگر ہم قطعی نہیں کر سکتے، وہ کہا کرتے ہیں کہ خدا کے لئے یہ کام ہمارے سپرد نہ کرو، بلکہ اُسے فلاں شخص ہم سے بہتر انجام دے سکتا ہے، اُنکے اس کہنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ اُنہیں خود اپنی ذات پر بھروسہ نہیں +

طاقتوں کی نشوونما کے لئے صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ انسان کسی موقع کو اس اُمید پر ہاتھ سے نہ جانے دے کہ خیر اگر یہ نہیں تو دوسرے موقع سے ہم ضرور فائدہ اُٹھائینگے، بلکہ جو موقع اسے حاصل ہو اس سے بغیر کسی پس وپیش پورا فائدہ اُٹھائے +

اس کی کبھی پروا نہ کرنی چاہیئے کہ کام غیر دلچسپ ہے بلکہ ذمہ داری ہی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ اسی سے طاقت وقابلیت کی نشوونما ہوتی ہے +

اپنے کسی کام سے ہرگز نہ گھبراؤ بلکہ اُسے اِس طرح انجام دینے کی کوشش کرو کہ دوسرے لوگ یہ محسوس کریں کہ یہ جگہ پہلے سے بھی زیادہ قابل ہاتھوں میں ہے +

ایک مرتبہ میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ زندگی میں اس سے زیادہ میرے لئے کوئی

افسوسناک بات نہیں ہے کہ مجھے کوئی ذمہ داری کا عہدہ دیدیا جائے اور میں اسکی کشمکش میں مبتلا ہو جاؤں اسی خیال کی وجہ سے اسکی تمام مخفی قوتیں نشو و نما سے محروم رہ کر بیکار و معطل ہو گئیں ۔

اگرچہ اس نے بارہا اسکا مصمم ارادہ کیا کہ وہ اپنے اس اصول کو بدل دیگا اور اپنی طاقتوں کی نشو و نما کے لئے کسی آنے والے موقع کا انتظار نہ کریگا ۔ مگر ذمہ داری کی طرف سے بزدلی نے اسکی اس عادت کو اسقدر راسخ کر دیا تھا کہ وہ اپنے اس خیال میں کامیاب نہ ہو سکا ۔

بہت سے لوگ اپنی قوتوں کا اظہار اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ ذمہ داریوں سے گھبراتے ہیں اور اپنی زندگی دوسروں کی امداد پر بسر کرنا چاہتے ہیں ، جس سے مرتے دم تک انکی بڑی بڑی حیرتناک مکانی طاقتیں تہذیب و اصلاح سے محروم رہ جاتی ہیں ۔

یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے ساتھ آزادانہ زندگی بسر کرنے اور اسکا مصمم ارادہ کرلے کہ وہ دوسروں کی غلامی میں اپنی زندگی بسر نہ کریگا ۔

بہت سے لوگ کسی خاص پیشے کو ایک مبتدی کی حیثیت سے سیکھ کر اچھی تنخواہوں پر پہنچ جاتے ہیں اور اس وقت وہ اپنا کوئی ذاتی کام شروع کرنا چاہتے ہیں ، لیکن دوسروں کی بزدلانہ گفتگو اور اپنی ذات پر بے اعتمادی انہیں اس سے باز رکھتی ہے ، یہانتک کہ ایک ہی کام بار بار کرنے کی انہیں عادت اُن پر اسقدر غالب آجاتی ہے کہ پھر اسکا دور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی ناقابل اعتبار یقین کو کسی بڑے یقین پر ترجیح دیتے ہیں ، انکو مشکلات و خطرات میں پڑنے کا کبھی خیال تک نہیں آتا ، وہ بڑی ذمہ داریوں سے نفرت کرتے ہیں انکے نزدیک وہ پُر سکون ملازمت جس میں انکی تنخواہ ہر ہفتے انہیں ملجائے ذمہ داریوں اور تجارت سے بدرجہا افضل ہوتی ہے ۔

خواہ تم ذمہ داری کو رغبت و پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے ہو ۔ تاہم تم دُنیا میں ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکتے ہو اور قرض وغیرہ کے ادا کرنے کی اُس کشمکش سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہو ۔ جس میں دوسرے لوگ مبتلا ہیں ۔

ہر مرد و عورت جو دنیا میں قوتوں کے پوشیدہ برّ اعظم سے بغیر فائدہ اُٹھائے گزر رہا ہے ۔ وہ نہ صرف اپنی ہی ذات کے خلاف جرم کا ارتکاب کر رہا ہے بلکہ دُنیاوی تہذیب و تمدن کے خلاف بھی

ایک گناہ عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے *

تم جو کچھ کرو اُس میں اپنے پورے جوش سے کام لو اور کسی مشین کا کوئی چھوٹا پُرزا نہ بنو، اگر تم کسی دوسرے کا کام کرتے ہو تو اُس وقت بھی خیال رکھو کہ تمہارا کوئی کام تمہارے خیال و ضمیر کے خلاف نہ ہو *

(ترجمہ) (مولوی) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

---

# جذباتِ سیفی

پھر بہار آئی چمن میں اے جنوں لینا مجھے
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے اِک صحرا مجھے

میرے ہی خوں سے بھرا ساقی نے پیمانہ مرا
دیکھ کر دشمن کو دیکھا بھی تو کیا "دیکھا" مجھے؟

دل، کہ جس پر تھا مدارِ زیست۔ وہ جاتا رہا
اُف، بہت مہنگا پڑا یہ عشق کا سودا مجھے

میری صورت محفلِ دشمن کا ہے اِک آئینہ
دیکھتا ہے بزم میں "وہ انجمن آرا" مجھے

رحم، اے دیوانگیٔ عشق مجھ پر رحم کر!
کیا کہے گی میری حالت دیکھ کر دُنیا مجھے

یاد میری کیا تمہیں سچ مچ نہ آئے گی کبھی
غیر کے قدموں پہ سر رکھنا پڑے گا کیا مجھے؟

اب کہاں وہ ولولے سیفی لُٹا بیٹھا ہوں میں
دل پہ اِک بجلی گری تھی یاد ہے اِتنا مجھے!

سیفی سہواروی

---

یہ دیواروں۔ دروں کو پوجتا ہے
وہ اینٹوں۔ پتھروں کو پوجتا ہے

مناسب ہو تو اب پردہ اُٹھا دو
کہ جو ہے۔ دوسروں کو پوجتا ہے

عرفی شیرازی — مترجم آزاد انصاری

# خیالات و حالات کا تعلق

چند سال ہوئے ایک لڑکی جو میرے پڑوس میں رہتی تھی کہا کرتی تھی کہ میں اس لئے خوش رہتی ہوں کہ ہر ایک آدمی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ محسوس ہی نہیں کرسکتی تھی کہ کس طرح کوئی دکھی ہو سکتا ہے۔ ہر ایک شخص اسلئے اس سے محبت کرتا تھا کہ وہ خود ہر ایک سے پیار کرتی تھی۔ وہ باہر کھیتوں میں نکلجاتی اور مارے خوشی کے تالیاں بجاتی پھرتی تھی۔ گویا ہر ایک چرند پرند۔ پھول پودا اس سے یہ کہتا تھا کہ "خوش رہو"۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ ہم سب ایسا ہی محسوس نہ کریں۔ ہر شخص اور ہر چیز خدا کے کسی مقدس خیال کا اظہار ہے اور اگر ہم ہر ایک چیز کو بیگناہی اور سچائی کی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور انہیں انکی حقیقی صورت سے دیکھیں جسپر کہ خدا نے انہیں بنایا ہے۔ اور انکے اُن بدصورت نقوش کو نہ دیکھیں جو ہمارے ہی اپنے خیالات کا عکس ہیں تو یقیناً ہر ایک چیز ہمیں یہی کہتے ہوئے محسوس ہوگی کہ "خوش رہو۔ کامیاب و بامراد ہو"۔ اگر ہم اپنی قدرتی حالت پر ہوں تو ہمیں ایسا مطمئن و فرحاں و شاداں ہونا چاہیئے کہ زندگی ایک "ترانۂ پیہم" معلوم ہو۔ جب سب یہ بات معلوم کر لینگے اور ہر ایک چیز کو حقیقت کی نگاہوں سے دیکھنے لگینگے تو دنیا افلاس اور دکھوں سے آزاد ہو جائیگی۔

ایک حریص۔ کنجوس اور بخیل آدمی خدا کی تجویز کے سراسر ناموزوں ہے۔ خدا کی خدائی میں ایسے عجوبہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ایسے آدمی کے چہرے اور دلکش پھولوں لہلہاتے ہوئے کھیتوں۔ خوبصورت پرندوں اور جنگلوں کے درمیان کس قدر اختلاف ہے! الغرض لالچ۔ گناہ خود غرضی اور ایسی ایسی ناموافق و ناموزوں باتیں خدا کی حکومت میں کوئی جگہ نہیں رکھتیں۔ خدا کی بنائی ہوئی چیزوں سے انکا کوئی تعلق نہیں۔ دنیا میں سب برائیاں اور خرابیاں انسان کے اپنے ہی غلط خیالات و بری زندگی کے نتیجے ہیں۔

صرف پاکدل اشخاص خدا کو دیکھ سکتے ہیں۔ صرف وہی دل جو ہر قسم کی آلائیشوں سے پاک ہو حقیقتوں اور خوبیوں کو دیکھ سکتا ہے۔ ہر ایک برا اور غلط خیال۔ ہر ایک برا کام ہماری آنکھوں کے آگے ایک پردہ سا کر دیتا ہے جو ہمیں چیزوں کی حقیقت کو ملاحظہ کرنے سے روکتا ہے۔ ہمیں راستی و پاکیزہ زندگی سے ان پردوں کو دور کرنا چاہیئے تاکہ ہم دنیا و مخلوقات دونوں کو انکی اصلیت پر دیکھ سکیں۔ خود غرضی۔ دغابازی دوسروں کو دھوکا دیکر خود ناجائز فائدہ اٹھانا۔ اوروں کی راہ میں روڑے اٹکانا۔ یا دوسروں کی ترقی میں

خارج ہونا یہ سب ایسے ہی پردے ہیں جنکو دور کرنا اشد ضروری ہے۔ ورنہ حقیقت پر پہنچنا ممکن نہیں۔
ہم میں سے بہتیرے محض جسمانی آرام و آسائش و مالی فوائد کے لئے ایسے پردوں کی تعداد اپنی آنکھوں کے سامنے بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہانتک کہ ہماری نظر روحانی باتوں کو دیکھنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ ہمیں اشیاء کا محض دنیوی پہلو ہی دکھائی دیتا ہے۔

دنیا میں کوئی شخص بھی کسی چیز کو بجز اپنے ہی کاموں۔ اپنے ہی خیالات و خواہشات کے شیشے میں سے دیکھنے کے نہیں دیکھ سکتا۔ جس رنگ کے شیشے میں سے ہم دیکھینگے۔ تمام چیزیں اسی رنگ کی نظر آئینگی۔ ہمارا ہر ایک کام۔ ہر ایک خیال۔ ہر ایک آرزو ہماری آنکھوں کے سامنے گویا ایک رنگدار شیشے کی مانند ہے اور ہمیں ہر ایک چیز پر انہیں میں سے نظر کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہمارے کام اچھے۔ ہمارے خیالات پاک و صاف اور ہمارے ارادے نیک ہیں تو یہ صاف و شفاف شیشوں کی مانند ہو جائینگے اور ہمیں ہر ایک چیز اپنے اصلی رنگ و حقیقت پر نظر آئیگی ورنہ ہمیں بدصورت ٹوٹی ہوئی اور ڈراؤنی شکلیں سب چیزوں کی نظر آئینگی۔

کیا کبھی آپ نے اندازہ کیا ہے کہ آپنے اپنی بدمزاجی و ترش روئی سے کتنے گاہکوں کو دوکان سے دور بھگایا ہے۔ یاد رکھو! ہر ایک شخص تاریکی سے نکلکر روشنی میں اور سخت سردی سے نکل کر جان بخش دھوپ میں آنا چاہتا ہے۔ ہر ایک شخص سایہ و تاریکی سے دور بھاگتا ہے اور لڑنے جھگڑنے سے بچنا چاہتا ہے۔

ہر ایک چیز کے روشن پہلو پر نظر کرنے کی عادت بنا لینا اور اس پر عمل کرنا یہ ایک ایسی بات ہے جس سے دنیا کے اندر ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ صرف ایک سال کے لئے تو اس پر عمل کر دیکھو۔ صرف اتنے ہی سے تمہاری زندگی بھر میں انقلاب پیدا ہو جائیگا۔ اب اگر لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں اور دور ہی رہتے ہیں تو پھر وہ خود بخود تمہاری طرف کھینچے چلے آئینگے۔ سورج کی کرن کا سائے سے مقابلہ کر دیکھو۔ ہر چیز و ہر جانور اپنی زندگی کے لئے اسی کرن کا محتاج ہے۔ لیکن تاریکی حیات و امید کے سراسر خلاف ہے۔ زندہ دل آدمیوں کے اندر بڑی کشش ہوتی ہے۔ ہم انکے پاس نئی طاقت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ انکی وجہ سے فطرت انسانی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہمیں انکی طرف ایسی ہی کشش ہوتی ہے جیسا کہ سورج مکھی کے پھول کو سورج کی طرف۔ برخلاف اسکے افسردہ دل و مایوس طبع آدمیوں سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ خوش و خرم دل ایک بیش بہا نعمت ہے اور شگفتہ مزاجی ایک

بے بہار برکت ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اسے خود ہی بناتے ہیں اور خود ہی اپنے حالات کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہم میں سے بعض خود ساختہ تہ خانوں میں رہتے ہیں اور پھر خود ہی تاریکی کی شکایت کرتے ہیں۔ ایک مایوس شخص جو ہر ایک چیز کے تاریک پہلو ہی پر نظر کرتا ہے۔ جسے اندھیرے۔ ناامیدی اور دکھ درد کے بغیر دنیا میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جو یہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا دن بدن نیچے ہی جا رہی ہے۔ وہ اس باامید شخص کے مقابلے میں جو ہر ایک چیز کے روشن رخ کو دیکھتا ہے اور جو چیزوں کی حقیقت پر نظر ڈال سکتا ہے کچھ ہستی نہیں رکھتا۔ پہلا شخص جہاں لوگوں کو دکھ۔ درد و بیماری وغیرہ سے سخت مصیبت زدہ حالت میں دیکھتا ہے۔ دوسرا انہیں انسان کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ انسان کو ایک وحشی جانور کی حیثیت سے ترقی دیکر موجودہ تہذیب کے درجے تک پہنچانے والے یہی باامید شخص ہی ہوئے ہیں یہی ہمدرد دل رکھنے والی ہستیاں جو لوگوں کو پرسکون۔ باآرام و پرامید بناتی ہیں دنیا میں مصیبتوں کو کم کرتی ہیں نہ کہ ایسے آدمی جو ہر وقت لوگوں کو عقبےٰ پر نظر لگائے رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور موجودہ زندگی میں ہنسنا بھی گناہ سمجھتے ہیں ۔

جو جو خاصیتیں اور عادتیں ہم اپنے اندر پیدا کرینگے وہی آخر کار ہمارے خیالات پر قابو حاصل کرلینگی بلکہ ہمارے خط و خال سے بھی نمایاں ہونگی اور ہماری زندگی کو چلانے والی ہونگی، دنیا وہی کچھ ہے جس کا عکس ہمارے اندر سے پڑتا ہے، دنیا ہمارے اپنے ہی خیالات اور آرزوؤں کا عکس واپس کرتی ہے۔ اگر ہم پشیمان و غمگین ہیں تو یہ بھی ناامیدی ہی کا منظر دکھائیگی لیکن اگر ہم اسے اطمینانِ قلب و خندہ پیشانی سے دیکھینگے تو یہ بھی ایسی ہی تصویر پیش کریگی ۔

ایک آدمی جہاں جائے خوش رہتا ہے۔ ہر ایک چیز سے خوشی و اطمینان کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر ایک شخص اسے مہربان و بردبار معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک آدمی اسے خوش و خرم دکھائی دیتا ہے۔ اور اسکی مدد کرنیکے لئے رضامند نظر آتا ہے۔ برخلاف اسکے دوسرا آدمی ہر وقت فکر و غم میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ ہر ایک شخص اور چیز پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ وہ خوش ہونیکے لئے کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔ دنیا اسے ایک ڈراونا اور دلخراش منظر پیش کرتی ہے۔ گویا وہ وہی کچھ پاتا ہے جسکی اسے امید ہے۔ تمام دنیا ایک گونجنے والے گنبد کی مانند ہے۔ جو ہماری اپنی ہی شکائتوں یا تعریفوں کو گونج کے واپس کرتی ہے۔ یہ ایک آئینے کی مانند ہے جو ویسا ہی چہرہ منعکس کرتا ہے جیسا اسکے سامنے پیش کیا جائے ۔

گوتم دیو

(اسلامیہ کالج لاہور)

# کتابوں کا کیڑا

:ا:

آج سے بیس سال پہلے مئی کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ سورج تمام دن خوب چمکتا رہا تھا۔ اور غالباً اسی واقعہ کی وجہ سے جسے میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس روز کی روشنی اور دھوپ کا احساس اسوقت تک میرے دل میں موجود ہے۔ جو سفید بادل میری کھڑکی کے سامنے کے حصۂ آسمان پر محوِ خرام تھے ابتک مجھے نظر آتے ہیں۔ اور میں اب بھی وہی تھکن سی محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اُس روز لندن کے درمیان گوشۂ تنہائی میں کام کرتے وقت تنگ کر رہی تھی ؎

عین غروبِ آفتاب کے وقت میں گھر سے نکلا۔ ہوا میں ایک خلافِ معمول لطافت تھی۔ تازہ روشن کئے ہوئے چراغوں کی قطاریں نیم تاریک آسمان کے نیچے ایک سنہری چمک پیدا کر رہی تھیں۔ فقط تفریح اور ہواخوری کے مقصد سے میں کوئی آدھ گھنٹہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ حتیٰ کہ اُس مقام پر پہنچا جہاں پورٹلینڈ بازار، میرلیبون روڈ سے جا ملتا ہے۔ راستے میں گرجا گھر کے زیرِ سایہ کتابوں کی ایک پُرانی دُکان تھی جسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ کتابوں کی قطاروں پر چمکتے ہوئے گیس لمپ نے مجھے دوکان کی طرف کھینچا۔ جہاں پہنچ کر میں نے کتابوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک ہاتھ سے میں ورق گردانی کرتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے حسبِ عادت جیب ٹٹول رہا تھا کہ کس قدر رقم موجود ہے۔ آخر کار ایک خاص کتاب میرے دل پر غالب آگئی۔ اور میں نے دُکان کے اندر جا کر اُسکی قیمت ادا کر دی ؎

دوکان پر کھڑے ہوئے میں بے خیالی سے ایک اور شخص کو بھی اپنے قریب پا رہا تھا۔ جو میری طرح کتابوں کو دیکھنے میں مشغول تھا۔ اور جب میں کتاب خرید کر دوکان سے نکلا تو وہ شخص ایک خاص دلچسپی ظاہر کرنے والے نیم تبسم کے ساتھ میری طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کچھ کہنے کو ہے۔ میں آہستہ سے آگے چلدیا۔ تو وہ شخص بھی اُسی طرف چل پڑا۔ گرجا گھر کے عین سامنے اس نے دو چار لمبے لمبے قدم اُٹھائے۔ اور میرے پہلو کے برابر آ کر بولا "معاف کرنا۔ آپکو غلطی نہ ہو۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا تھا کہ جو کتاب آپ نے ابھی خریدی ہے کیا اُسکے سرورق پر لکھا ہوا نام بھی دیکھا ہے؟"

اُس کی آواز کی مؤدبانہ لرزش نے قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ کچھ مانگنا چاہتا ہے۔ مگر بظاہر وہ کوئی عام گداگر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اُسکی عمر میں نے تقریباً ساٹھ برس قیاس کی۔ اُس کے لمبے باریک بال اور پریشان ڈاڑھی نیم سفید تھی۔ چہرے پر گوشت اور خون دونوں ندارد۔ آنکھیں بھی مُرجھائی ہُوئی تھیں۔ لباس نہایت خراب و خستہ تھا۔ مگر فیشن ایک فلاکت زدہ جنٹلمین کا سا تھا۔ اور واقعی اُسکا طرزِ کلام بھی بتارہا تھا کہ وہ ابتداءً کس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جن الفاظ سے اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ اُن سے اس قدر ذہانت نیک طبعی۔ اور ہمدردی انگیز شرمیلاپن ٹپکتا تھا کہ مجھے نہایت دوستانہ طریقے سے جواب دینے کے سوا چارہ نہ رہا میں نے سرورق پر نام نہیں دیکھا تھا۔ مگر میں نے اُسی وقت کتاب کو کھولا اور گیس لمپ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ الفاظ نہایت خوشخط لکھے ہُوئے تھے۔

"ڈبلیو۔ آر۔ کرسٹوفرسن۔ ۱۸۴۹ء"

اُس شخص نے دبی ہُوئی آواز سے کہا "یہ میرا نام ہے"

میں نے کہا "اچھا؟ تو کیا یہ کتاب آپکی تھی؟"

وہ شخص ذرا لرزتی ہُوئی آواز سے ہنس کر بولا "ہاں یہ میری ہی تھی۔ کیا آپنے کرسٹوفرسن لائبریری کے نیلام کے متعلق کبھی نہیں سُنا؟ ———" اور معاً اپنے سر کو اُنگلی سے ٹھنگور کر بولا "یقیناً آپ اُسوقت بہت خُردسال ہونگے۔ یہ واقعہ ۱۸۶۰ء کا ہے ——— مجھے دوکانوں پر اپنے نام والی کتابیں دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ آپکے آنے سے ذرا پہلے میں اس کتاب پر اپنا نام دیکھ چکا تھا۔ اور جب آپکو اسی کتاب پر نظر ڈالتے دیکھا۔ تو میں اس بات کی تاک میں کھڑا رہا کہ کیا آپ اسکو خریدتے ہیں یا نہیں؟ ——— گستاخی۔ اور قبل از وقت بے تکلفی معاف ——— کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ کتابوں کے عاشق .......... ؟"

اس ادھورے سوال کو اُسکی آنکھوں نے پورا کیا۔ اور جب میں نے اُسکا مطلب سمجھ جانے اور اُس سے متفق ہونیکا اظہار کیا تو اُس نے پھر ہلکی سی آواز میں ایک نیم قہقہہ لگایا۔ اور میرے چہرے پر مستفسرانہ نظر ڈالتے ہُوئے سوال کیا "کیا آپ بھی کوئی اچھی خاصی لائبریری رکھتے ہیں؟"

میں نے کہا "اجی نہیں۔ فقط دو تین سو کتابیں ہونگی۔ اور یہ بھی ایک ایسے شخص کے لئے جسکا ذاتی مکان نہ ہو۔ حد سے زیادہ ہیں۔ اس پر وہ نہایت خوش مزاجی سے مسکرایا۔ اور سر جھکا کر دھیمی سی آواز میں بولا۔ میری فہرست میں تعداد کتب ۱۸۲۴۷ تھی۔

میری حیرت اور دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر کچھ زیادہ سیدھے سوالوں کی جسارت نہ کرتے ہُوئے میں نے پوچھا "جسوقت کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ کیا اُس وقت بھی آپ لنڈن میں رہتے تھے؟"

اُس نے نرمی سے جواب دیا "اگر آپ پانچ ایک منٹ دے سکیں تو میں ابھی آپکو اپنا گھر دکھا دوں ——— اپنے گھر سے میری مراد اُس گھر سے ہے (ذرا ہنس کر) جو کبھی میرا تھا!"

میں رضامند ہو کر ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے تھوڑی ہی دُور اُس سڑک پر لے گیا جو ریجنٹ پارک کے گرداگرد جاتی ہے۔ اور آخر کار ایک عالیشان بلند صحن والے مکان کے سامنے ٹھیر کر آہستہ سے کہا "یہاں میں ہاکرتا تھا ——— دروازے کے دائیں طرف وہ کھڑکی دیکھ ——— یہی میری لائبریری تھی ——— آہ!"

اس پر اُس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "تو آپکو قسمت نے سخت دھوکا دیا!"

کہنے لگا "بس میری اپنی بیوقوفی کا نتیجہ ——— میرے پاس میری ضروریات کیلئے خدا کا دیا کافی تھا۔ مگر میرا خیال تھا کہ مجھے اس سے بھی زیادہ چاہیئے ——— میں اپنے آپ کو تجارت کی طرف گھسیٹ لے گیا ——— میں! آہ میں! جو ایسی چیزوں کے متعلق کچھ بھی واقفیت نہ رکھتا تھا! ——— اور بس میری تیرہ بختی کے دن آگئے! ——— ہائے بدنصیبی!"

وہاں سے ہم اُلٹے قدم واپس ہُوئے۔ اور ٹہلتے ہُوئے خاموشی کی حالت میں گرجا گھر کے قریب آ پہنچے۔ اور یہاں جب ہم اس طرح رُکے جیسا کہ ہم علیحدہ ہونے کو ہوں۔ تو کرسٹوفرسن نے ہلکے سے تبسّم کے ساتھ مجھ سے دریافت کیا "شاید آپ نے میری کچھ اور کتابیں بھی خریدی ہونگی؟"

میں نے کہا "مجھے یاد نہیں کہ آج سے پہلے کبھی آپ کا نام دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہو" اور پھر یکایک بلا ارادہ میرے مُنہ سے نکلا "اگر آپ یہ کتاب لینا چاہیں تو بخوشی لے سکتے ہیں" یہ سُن کر وہ ذرا جھجکا۔ اظہارِ بے نیازی کے الفاظ ہونٹوں میں دبالئے اور نہائیت شکر گذاری سے میرا تحفہ قبول کر لیا۔ جب اُس نے کتاب ہاتھ میں لی تو فرطِ خوشی سے اُسکے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔

ساتھ ہی ایسے انداز سے جیسے کوئی قابلِ شرم بات بتاتا ہے۔ بولا "اب تک بھی میرے پاس کچھ کتابیں ہیں۔ لیکن شاذونادر ہی اُن میں اضافہ کرنیکا موقعہ ملتا ہے۔ ۔ ۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں آپکا آدھا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا"

یہاں ہم نے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی راہ لی۔

## ۲

اُن دنوں میں نے شہر کیمڈن میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ شاید کوئی پندرہ دن کے بعد ایک روز پچھلے پہر کا وقت تھا کہ میں دو گھنٹے کی سیر کے بعد واپسی پر ہائی سٹریٹ میں کتابوں کی ایک دوکان پر ٹھیرا۔ ایک شخص میرے قریب آیا۔ میں نے اُس پر نظر کی تو پہچان لیا کہ وہی کرسٹوفرسن ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اس تپاک سے ملے جیسا کہ پُرانے دوست ملتے ہیں +

فلاکت زدہ جنٹلمین نے جو دن کی روشنی میں پہلے سے زیادہ خستہ حال نظر آرہا تھا۔ کہا "میں آپکو پچھلے دنوں کئی بار دیکھتا رہا ہوں۔ مگر میں نے آپکو بُلانا ——— مناسب خیال نہ کیا۔ میں رہتا بھی یہیں قریب ہی ہوں"

اپنے الفاظ کے مطلب پر غور نہ کرتے ہُوئے میں نے بھی یہی کچھ کہا اور ساتھ ہی دریافت کیا "کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟"

"اکیلا؟ نہیں حضرت۔ بیوی بھی ہے"

اب اُسکی آواز میں ایک عجیب قسم کی گھبراہٹ تھی۔ اُسکی نگاہیں نیچے جُھک گئیں۔ اور اُسکے سر نے بھی بے چینی ظاہر کرنے والی ایک جنبش کی +

ہم نے کتابوں کے متعلق باتیں شروع کر دیں اور اکٹھے واپس مُڑ کر گفتگو کو جاری رکھا۔ کرسٹوفرسن تربیت یافتہ ہونے کے علاوہ نہایت ذہین اور صاحب علم بھی تھا۔ جب اُس نے اپنے مخصوص شرمیلے پن کے ساتھ گفتگو میں علمیت کا ثبوت دینا شروع کیا۔ تو میں نے تحریر و تصنیف کے متعلق سوال کیا جس پر اُس نے جواب دیا "نہیں جناب میں نے کچھ لکھا کبھی نہیں۔ میں تو کتابوں کا کیڑا ہی ہوں" یہ کہکر وہ ہنسا اور اجازت لیکر چلدیا +

بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ ہمیں پھر ملنے کا اتفاق ہُوا۔ میرے گھر کے قریب ہی ایک گلی کے سرے پر وہ میرے سامنے آیا۔ اس دفعہ مجھے اُسکے چہرے پر بڑا تغیر نظر آیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر اُداسی نے سیاہی پھیلا رکھی تھی۔ مصافحے کے وقت اُسکا ہاتھ بھی ذرا اچلچلاسا محسوس ہُوا۔ اور ملاقات کی خوشی کا اظہار بھی اُس نے مدھم طور پر کیا +

میری سراپا سوال نگاہوں کا جواب اُس نے یہ دیا کہ "بھئی میں باہر جارہا ہوں ـــ لندن سے ہجرت

ہونے والی ہے"

"مگر کوئی خیر کا کام ہے؟"

"مجھے بھی یہی خطرہ ــ ہے ــ لیکن پھر بھی ــــــ خوش ہوں۔ میری بیوی کی پچھلے دنوں سے ذرا طبیعت اچھی نہیں۔ اور اُسکے لئے دیہات کی کھلی ہوا کی ضرورت ہے ــ ہاں میں خوش ہوں کہ ہم نے باہر جانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ بہت خوش ہوں ــــ واقعی بہت خوش ہوں"

ان الفاظ پر وہ مصنوعی طور پر زور دے رہا تھا۔ اُسکی آنکھیں ادھر اُدھر گردش کررہی تھیں۔ اور ہاتھ بل کھارہے تھے۔ میں ابھی انتخاب مقام کے متعلق سوال کرنے ہی کو تھا کہ اُس نے یکایک کہا۔ "میرا گھر یہاں پاس ہی ہے۔ کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپکو اپنی کتابیں دکھاؤں؟"

میں نے خوشی سے اُسکی دعوت قبول کی۔ اور کوئی دومنٹ میں ہم ایک عمدہ گلی میں پہنچے جسکے اکثر گھروں کے دروازوں پر سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ہم ایک دروازے پر رُکے۔ مگر میرا ساتھی ذرا کچھ اس طرح جھجکا۔ جیسا کہ مجھے دعوت دینے پر پچھتا رہا ہو +

ذرا سہم کر بولا "افسوس کہ میرا گھر آپکے شان کے لایق نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس اتنی جگہ بھی نہیں کہ آپکو کتابیں بطریق احسن دکھاسکوں"

میں نے اسکا اعتراض ٹال دیا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ کرسٹوفرسن مجھے نہایت ادب سے تنگ سیڑھیوں پر چڑھاتا ہوا دوسری منزل پر لے گیا اور سامنے کا دروازہ کھولدیا۔ میں دہلیز پر حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرہ نہایت ہی چھوٹا تھا۔ اور کسی طرح بھی خانگی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں تھا۔ جیسا کہ وہ استعمال کررہے تھے۔ کمرے کی بلا مبالغہ تقریباً ایک تہائی کتابوں سے پٹی پڑی تھی دو دیواروں کے آگے فرش سے لیکر چھت تک کتابوں کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ فرنیچر صرف ایک گول میز اور تین کرسیوں پر مشتمل تھا اور البتہ اس سے زیادہ کی جگہ ہی نہ تھی۔ کھڑکی بند تھی۔ اور اُس پر دھوپ پڑرہی تھی۔ ہوا نہایت کثیف ہورہی تھی۔ واقعی میں نے جلدوں اور چھاپے کی سیاہی کی بُو سے اس قدر تکلیف پہلے کبھی نہیں اُٹھائی تھی +

میں نے کہا "آپ تو کہتے تھے کہ فقط چند کتابیں باقی رہ گئی ہیں۔ مگر یہاں تو میری کتابوں سے بھی پانچ گنی موجود ہیں"

ذرا بے چینی کے ساتھ بولا "ہاں - مجھے پوری تعداد یاد نہیں رہتی - آپ دیکھتے ہیں نا - میں ان کو باترتیب نہیں رکھ سکتا —— کچھ اور بھی ہیں —— دوسرے کمرے میں "

مجھے ساتھ لیکر اُس نے ایک اور دروازہ کھولا - اور ایک چھوٹی سی خوابگاہ دکھائی - اگرچہ اس میں کتابوں کی اتنی بھرمار نہیں تھی - پھر بھی ایک دیوار کو کتابوں نے پوری طرح سے چھپا رکھا تھا - کتابوں کی بُو سے بھری ہُوئی ہوا میں ہر شب دو شخصوں کے سونے کا خیال کرکے میرے دل میں کراہت اور نفرت سی پیدا ہو رہی تھی +

ہم نشستگاہ کی طرف واپس آئے - کرسٹوفرسن کتابیں چُن چُن کر مجھے دکھاتا جاتا تھا - نیز شکستہ آوازمیں اور کبھی کبھی آہ سرد بھرتے ہُوئے - اپنی سوانح عمری پر بھی روشنی ڈالتا جاتا تھا - مجھے معلوم ہُوا کہ آٹھ سال سے وہ اس مکان میں سکونت پذیر تھا - اُس نے دو شادیاں کی تھیں - پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکی ہُوئی جو بچپن ہی میں مرگئی تھی - اور آخرکار ایک خوش آئند مُسکراہٹ کے ساتھ اُس نے یہ راز بھی کھولا کہ دوسری بیوی اُسکی لڑکی کی اُستانی تھی + اس عجیب گھرانے کے مزید حالات معلوم کرنے کی اُمید پر میں نے اُسکی باتوں کو زیادہ گہری دلچسپی سے سُننا شروع کیا +

میں نے کہا "دیہات میں تو یقیناً آپکو کتابوں کے لئے طاقچوں والا کمرہ مل سکیگا؟"

اُسکا چہرہ فوراً اُتر گیا - اور اُس نے میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا - میں ابھی کچھ اور کہنے کو تھا کہ گھر کے اندر کی ایک آواز نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچا - سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آہٹ معلوم ہُوئی اور کانوں کو ایک مانوس، بلند سُنائی دی +

کرسٹوفرسن چونک کر بولا "اہا! کوئی میری کتابیں اُٹھوانے میں مدد کرنے والا آرہا ہے! آیئے مسٹر پومفریٹ - اندر تشریف لایئے!!"

—————— :: ۲ :: ——————

دروازہ کھُلا - اور ایک بلند قامت، دُبلا سا آدمی ظاہر ہُوا - جسکے پریشان بال - نیلوفری آنکھیں باہر کو نکلے ہُوئے جبڑے اور فراخ مُنہ مجموعی طور پر ایک ایسی تصویر بنا رہے تھے - جس سے سنجیدگی کم اور زبردست مگر خوش آئند مردانگی زیادہ ظاہر ہوتی تھی + اُسکی آواز کا مانوس معلوم ہونا بھی کچھ عجب نہ تھا اگرچہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقعہ عموماً بڑی مدتوں کے بعد ہُوا کرتا تھا لیکن مسٹر پومفریٹ

اور ہیں ایک دوسرے کے قدیم شناسائی تھی ۔

مجھے دیکھ کر بولا۔"خوب! مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ بھی مسٹر کرسٹوفرسن کو جانتے ہیں ۔"

میں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپکو انکا واقف پاکر مجھے بھی تعجب ہے ۔

بوڑھے عاشقِ کُتب نے ہم پر ایک حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اور پھر نو وارد سے مصافحہ کیا۔ جو اُسے کسی قدر عامیانہ مگر متوّد بانہ طریقے سے ہلا ۔

پومفریٹ یارکشائر ہی لہجے میں بولتا تھا۔ اور اُسکی تراش خراش بھی ویسی ہی تھی جیسی کہ یارکشائر والوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ صرف یہی اطلاع کرنے آیا تھا کہ مسٹر کرسٹوفرسن کی لائبریری کے نقلِ مکان کا پورا پورا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ فقط دن مقرر کرنا باقی ہے ۔

کرسٹوفرسن بولا۔"جلدی کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسٹر پومفریٹ۔ آپ جس قدر تکلیف کر رہے ہیں میں اسکے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں — تاریخ روانگی ہم ایک دو دن کے اندر اندر مقرر کر لینگے — ہاں۔ ایک یا دو دن کے اندر اندر ۔"

ایک خوش مزاجانہ جنبشِ سر کے ساتھ پومفریٹ رخصت ہونے کے لئے اُٹھا ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے چار ہوئیں۔ اور ہم اکٹھے اُس گھر سے باہر نکلے گلی میں آتے ہی میں نے کُھلی ہوا میں ایک گہرا سانس کھینچا۔ دم گھُٹنے والے کمرے سے نکل کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا کسی سبزہ زار میں پہنچ گیا ہوں میرے ساتھی نے بھی صریحاً ایسا ہی محسوس کیا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر کندھے پھیلا کر بولا۔"آہا آج دن بہت اچھا ہے۔ آج تو کسی باغ کی سیر کرنیکو جی چاہتا ہے ۔"

اس پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ وہاں سے نزدیک ترین سبزہ زار ریجنٹ پارک ہی میں ذرا گلگشت کریں۔ پومفریٹ کو تو جانا ہی اُسی طرف تھا۔ اور میں کرسٹوفرسن کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے ساتھ ہو لیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ جس مکان میں کرسٹوفرسن رہتا ہے۔ اُسکی مالکہ پومفریٹ کی چچی ہے۔ اس بات کی بھی تصدیق ہُوئی کہ کرسٹوفرسن کی خوشحالی اور پھر بربادی کی کہانی لفظ بہ لفظ دُرست تھی تباہی اس قدر مکمل ہُوئی تھی کہ چالیس برس کی عمر میں اُسے کلرکی یا اسی قسم کی نوکری ہی سے گذارہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد اُس نے دوسری شادی کر لی ۔

پومفریٹ نے مجھ سے پوچھا۔"کیا آپ مسز کرسٹوفرسن کو بھی جانتے ہیں ؟"

اس نے کہا "نہیں۔ اگرچہ میری خواہش ہے۔ مگر کیوں۔ کوئی خاص بات ہے؟"

"کیونکہ وہ عورت ہی اس قسم کی ہے اُسکو جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے۔ اور بس ــــ وہ ایک شریف خاتون ہے۔ کرسٹوفرسن کے شریف ہونے سے بھی البتہ کسی کو انکار نہیں۔ اور اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو میرا خیال ہے میں نے کبھی کا اُس کا سر پھوڑ دیا ہوتا ــــ میں انکو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اُنکے ساتھ ایک ہی گھر میں کئی سال رہ چکا ہوں۔ یہ عورت، کیا کہوں، سر کی چوٹی تک شریف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ جیسی زندگی وہ بسر کر رہی ہے اُسکا خاوند کس طرح ٹھنڈے دل سے دیکھ رہا ہے۔ قسم ہے۔ اگر مجھے ایسی عورت کو آرام میں رکھنے کے لئے کوئی اَور ذریعہ نہ ملتا تو یقیناً میں چور اور ٹھگ بننے سے بھی گریز نہ کرتا۔"

"تو کیا وہ اپنی روزی خود کماتی ہے؟"

"ہاں۔ اور ساتھ خاوند کے لئے بھی ــــ پڑھانے کا کام نہیں ــــ کُھری روڈ پر ایک دوکان ہے اس میں کام کرتی ہے۔ جگہ اچھی ہے۔ کوئی تیس شلنگ ہفتہ وار پیدا کر لیتی ہے۔ اور یہی اُنکی کل آمدنی ہے۔ مگر کرسٹوفرسن اس میں سے بھی کتابیں خریدا کرتا ہے۔"

"تو کیا اس شادی کے بعد اُس نے کوئی کام نہیں کیا؟"

غالباً پہلے چند سال تک وہ کچھ کرتا رہا۔ مگر بیمار پڑ گیا۔ اور بس خاتمہ بالخیر ــــ اُس وقت سے ابتک وہ بیکاری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ جہاں کتابیں فروخت ہوتی ہوں جھٹ وہاں پہنچتا ہے۔ اور باقی وقت سیکنڈ ہینڈ کتب خانوں کی بُو سونگھنے میں گذار دیتا ہے ــــ اُسکی بیوی؟ نہیں وہ اسکے متعلق شکایت کا ایک حرف بھی مُنہ سے نہیں نکالتی۔ اُس سے کبھی ملونا۔ تب تم پر سب کچھ روشن ہو جائیگا۔"

میں نے کہا" اچھا۔ مگر اب کیا بات ہوئی ہے جو وہ شہر کو چھوڑ کر باہر جا رہے ہیں؟"

"ہاں سنو۔ میں ابھی خود بخود یہی بیان کرنیکو تھا۔ مسز کرسٹوفرسن کے رشتہ دار اچھی حالت میں ہیں۔ اُن میں سے اکثر بفضلِ خدا موٹے آدمی ہیں مگر جہانتک مجھے معلوم ہوتا ہے خود غرض۔ کیونکہ اس وقت تک اُن میں سے کسی نے بھی بچاری کی امداد کو ہاتھ نہیں ہلایا۔ اُن میں سے ایک مسز کیٹنگ ہے جو کسی شہری امیر کی بیوہ ہے۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ نارفوک کے علاقے میں اس عورت کے مکانات ہیں مگر وہاں رہتی کبھی نہیں البتہ کبھی کبھی اُسکا بیٹا وہاں مچھلیاں پکڑنے اور شکار کھیلنے کے لئے جا نکلتا ہے۔ باہر جانے کے متعلق مسز کرسٹوفرسن نے میری چچی کو تو اتنا بتایا ہے۔ کہ مسز کیٹنگ نے اُسے اور اُسکے خاوند کو اپنے مکان میں

رہنے کی اجازت دی ہے۔ کرایہ بھی معاف اور خوراک وغیرہ بھی مفت۔ فقط اس شرط پر کہ گھر کا سارا انتظام مسز کرسٹوفرسن کے ذمے ہوگا۔ اور وہ آئے گئے مہمان کے لئے گھر کو تیار رکھیگی "

"میرا خیال ہے کرسٹوفرسن تو یہیں شہر میں رہنے کو ترجیح دیتا ہوگا؟"

"البتہ۔ بھلا وہ کتابوں کی دو کانوں کے بغیر کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر بھی بیوی کی خاطر سے وہ اس پر بھی راضی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ اُسکی بیوی بھی اب کام سے رہ گئی ہے۔ میری چچی کہتی ہیں کہ بچاری اب نہایت کمزور اور درماندہ ہوگئی ہے۔ اگرچہ شکایت تو اُسکے مُنہ میں ہے ہی نہیں لیکن وقتاً فوقتاً دیہات کا نام لیتی ہے۔ جہاں وہ پہلے رہا کرتی تھی۔ میں نے ایک ہفتہ ہُوا اُسے دیکھا تھا۔ عین اُسی روز مسز کیٹنگ کی طرف سے اُنہیں دعوت موصول ہُوئی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں اُسے پہچان نہ سکا۔ اس قسم کا فوری تغیر کبھی کسی کے چہرے پر دیکھنے میں نہیں آیا۔ اُسکا چہرہ ایسا بشاش ہوگیا جیسا کہ ایک سترہ سالہ لڑکی کا۔ اور اُسکی مُسکراہٹ ــــ کاش اُس وقت تم نے خود دیکھی ہوتی!"

میں نے پوچھا" اپنے خاوند سے تو وہ بہت کم عمر ہوگی؟"

"وہ کوئی بیس برس چھوٹی ہے۔ اس وقت میرا خیال ہے۔ چالیس برس کی ہوگی"

میں نے تھوڑی دیر کے تفکر کے بعد پوچھا" بہرحال اُنکی زناشوئی کی زندگی ناخوش تو نہیں گذری؟"

پومفریٹ نے بے اختیار ہوکر کہا" ناخوش؟ ۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آج تک اُنکے درمیان ذرا بھی رنجش کی گفتگو نہیں ہُوئی۔ اگر کرسٹوفرسن کی طرز زندگی میں بھی انقلاب آجائے تو پھر اس جوڑے کو دُنیا کی کسی چیز کی ضرورت نہ رہ جائے۔ وہ ہر وقت کتابوں ہی پر گر پڑا ہے"

میں نے بات کاٹ کر کہا" اور یہ بھی کہتے ہو کہ اُسکی کتابیں بھی بیوی کے تیس شلنگوں ہی میں سے خریدی جاتی ہیں"

"نہیں نہیں۔ شروع میں تو اُسکی پُرانی لائبریری میں سے کچھ کتابیں بچ رہی تھیں۔ اور جن ایام میں وہ خود برسر روزگار رہتا۔ بہت کچھ اُس وقت خریدیں۔ میں نے اُسی کی زبانی سُنا ہے کہ بعض اوقات کتابوں کے لئے رقم بچانے کی خاطر اُس نے چھ پنس روزانہ پر بھی گذارہ کیا ہے۔ واقعی یہ شخص ایک بڈھا اُلو ہے۔ مگر اسکے باوجود وہ ایک شریف آدمی ہے۔ اور خواہ مخواہ دل میں سما جاتا ہے۔ اُسکے باہر چلے جانے پر ہمیں افسوس ضرور ہوگا" اگر مجھ سے پوچھو تو میں چاہتا تھا کہ بہت جلد کرسٹوفرسن کے باہر چلے جانے کی خبر سُنوں۔ جو باتیں

میں نے ابھی سُنی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ مجھے یہ خیال بہت اچھا معلوم ہوتا تھا کہ بچاری آخر مشقت کی زندگی سے رہائی پائے۔ اور بہار کے خوشگوار ایام میں اپنے مالوف دیہات میں رہ کر لطف اُٹھائے ٭

ساتھ ہی کرسٹوفرسن کی طرف سے رشک کا احساس بھی ہوتا تھا۔ جس کے لئے ضخیم کتابوں میں نگاہیں گاڑ رکھنے سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں تھا۔ اور یقیناً اپنی پُرانی آمد و رفت کی جگہوں سے علیحدہ ہو جانے پر اُسکو سخت تکلیف کا سامنا کرنا لازمی نظر آتا تھا۔ میں نے ایک دو دن کے اندر اُسکو ملنے کا ارادہ کرلیا۔ اور اتوار کے دن کو ترجیح دی۔ کیونکہ اس روز اُس کی بیوی سے ملنے کا اتفاق بھی ممکن تھا ٭

—— :۴: ——

اتوار کے پچھلے پہر میں اُنکے ہاں جانے کو تیار بیٹھا تھا کہ پومفریٹ آ پہنچا۔ اُسکی نگاہوں میں ذرا دُرشتی سی تھی۔ اور کمرے میں داخل ہوتے وقت اُس نے خلاف وضع خواہ مخواہ دہلیز کو پاؤں سے ٹھکرا کر اندر قدم رکھا۔ اُسکی آمد بھی بالکل ناگہانی تھی۔ اگرچہ میں نے اُسے اپنا پتہ بتایا ہُوا تھا۔ مگر مجھے یہ امید نہ تھی کہ وہ کبھی مجھے ملنے آئیگا ٭

آتے ہی غصہ بھری بلند آواز سے بولا "کبھی اس قسم کی بات بھی سُنی ہے؟ سارا کھیل ختم ——— جانا وانا بند ——— اور اُسکا باعث صرف وہی کتابیں!"

بڑبڑاتے ہُوئے اُس نے جو کچھ ابھی اپنی چچی کے گھر سُنا تھا۔ مجھے سُنایا۔ ایک روز پیشتر مسز کیٹنگ چند رشتہ داروں سمیت کرسٹوفرسن کے گھر اچانک آنکلی تھی۔ یہ لیڈی اُس دن سے پہلے کبھی اُنکے ہاں نہیں آئی تھی۔ اور اُس روز یقیناً وہ اُسی مجوزہ نقلِ مکان کے متعلق ہی کچھ بات چیت کرنے آئی ہوگی۔ اُن کی گفتگو کا آخری حصہ پومفریٹ کی چچی نے سُن لیا تھا کیونکہ مسز کیٹنگ سیڑھیوں سے اُترتے وقت زور زور سے کہہ رہی تھی "ناممکن۔ بالکل ناممکن۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی یہ تصوّر نہیں کرسکتی ——— بھلا میں کب اپنے گھر کو اُن اٹی ہُوئی کتابوں سے بھرنے دیتی ہوں ——— نہایت مضر صحت ——— میں نے اس قدر عجیب بات عمر بھر کبھی نہیں دیکھی تھی" یہی کہتی ہُوئی وہ اُتری اور گاڑی پر بیٹھ کر چلی گئی۔ مالکۂ مکان نے اب اوپر چڑھنے کا موقعہ دیکھ کر لیکن کرسٹوفرسن کے کمرے میں کمل خاموشی پاکر دروازہ کھٹکھٹایا

اوپر جانے پر میاں بیوی کو پہلو بہ پہلو بیٹھے ہُوئے اور اُداسی سے مُسکراتے ہُوئے دیکھا۔ دریافت کرنے پر اُنہوں نے سارا معاملہ بیان کیا۔ کہ مسز کیٹنگ صرف اس لئے آئی تھی کہ مسز کرسٹوفرسن نے ایک خط میں اپنے خاوند کی کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ اور اُنکے لئے اجازت طلب کی تھی۔ اب وہ لائبریری کو دیکھنے کے لئے آئی تھی جسکا نتیجہ یہ ہُوا جو بیان کیا جاچکا ہے۔ اب اُنکے لئے دو راستے تھے یا کتابوں کو قربان کریں ورنہ مسز کیٹنگ کی موعودہ مہربانی سے محروم رہیں"۔

میں نے پوچھا "تو کیا کرسٹوفرسن نے صاف انکار کر دیا؟"

"میرا خیال ہے خود اُسکی بیوی نے محسوس کیا ہوگا کہ کرسٹوفرسن کتابوں کی جدائی برداشت نہ کرسکیگا بہرحال نتیجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے دیہاتی گھر کو جانے دیا ہے مگر کتابوں کو نہیں چھوڑا۔ یہ ہے اُنکا فیصلہ"۔

اسی اثناء میں مَیں خیالات میں محو ہو گیا۔ میں کرسٹوفرسن کے دل کی حالت کو محسوس کر رہا تھا۔ اور ساتھ ہی اگرچہ میں مسز کیٹنگ کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُسکی عنایات اس قسم کی ہیں۔ جن میں بہت کچھ بوجھ اور گرانی ہے ....... بہرکیف کیا مسز کرسٹوفرسن ناخوش ہوگی؟ کیا وہ ایثار کی زندگی بسر کرنے والی عورت نہیں ہے؟ ——— جو خود تکلیف برداشت کرتی ہے مگر ایسا کام نہیں ہُونے دیتی جس سے اُسکے خاوند کو تکلیف ہو؟

مگر یہ نقطۂ خیال پومفریٹ کو غصہ دلاتا تھا۔ وہ کبھی کرسٹوفرسن کو اور کبھی مسز کیٹنگ کو ملامت کرتا۔ یہ معاملہ اُسکے نزدیک پرلے درجے کی خجالت تھی۔ آخرکار میں بھی کچھ نہ کچھ اُسکی رائے کی طرف مائل ہو گیا۔

## :: ۵ ::

دو تین دن کے بعد جذبۂ رازجوئی پھر مجھے کرسٹوفرسن کے گھر کی طرف کھینچ لے گیا۔ گلی میں چلتے ہُوئے میں نے اُنکی کھڑکی کی طرف نظر کی تو بوڑھے مجنون الکتب کا چہرہ نظر آیا۔ بظاہر وہ یونہی کھڑکی کے قریب کھڑا ہُوا تھا۔ اور شاید کچھ اُداس بھی تھا۔ اُس نے فوراً میری طرف اشارہ کیا اور ابھی مَیں دروازہ کے قریب ہی تھا کہ وہ جھٹ نیچے اُتر کر مجھے آملا۔ اور بولا "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

اُسکے چہرے پر تفکّر کے آثار تھے۔ کچھ دیر تو ہم چُپ چاپ اکٹھے چلے گئے۔ آخر میں نے یونہی بے پروائی سے پوچھا "آپ نے غالباً باہر جانے کا ارادہ بدل دیا ہے؟"

آپ نے مسٹر پومفریٹ ہی سے سُنا ہوگا نہ؟ ہاں ——— بالفعل ——— ہم جہاں ہیں ——— یہیں رہینگے"۔

یہ الفاظ اُس نے نہایت تشویش اور دل شکستگی کے عالم میں کہے۔ اور چلنے میں بھی اُسکے شانے گرے ہُوئے اور سر نیچے جھکا ہُوا تھا۔ بلکہ چل نہیں رہا تھا۔ اپنے آپ کو گھسیٹتا جا رہا تھا۔ اُسکی حالت کچھ ایسے شخص کی سی تھی جس سے کہ کوئی عجیب کمینہ پن کا فعل سرزد ہُوا ہو ؛

کہنے لگا "آپکو سچ بتاؤں۔ سب تکلیف اُنہی کتابوں ہی کی ہے (دورانِ گفتگو میں میری طرف کنکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ کانپ بھی رہا تھا) آپ دیکھتے ہیں کہ میرے واقعات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ (ذرا ہنس کر) بات یہ ہے کہ میری بیوی کی ایک رشتہ دار کی طرف سے ہمیں خاص شرائط پر ایک مکان کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے میری لائبریری ہی اُسکے لئے قابلِ اعتراض ٹھہری۔ نہایت قابلِ اعتراض ——— بس ہم نے آپس میں متفقہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں ہیں وہیں رہیں"۔

میں اس بات پر زور دیکر پوچھنے سے نہ رہ سکا کہ کیا مسز کرسٹوفرسن نے دیہات کی زندگی کی بھی پروا نہ کی ؟ مگر یہ الفاظ منہ سے نکالتے ہی مجھے پشیمانی ہُوئی۔ کیونکہ ان الفاظ نے میرے دوست کو صریحاً صدمہ پہنچایا۔ کہنے لگا "اُسکی تو عین خواہش تھی"۔ اور ساتھ ہی ایک عجیب دردانگیز نظر مجھ پر ڈالی۔ جیسا کہ مجھ سے صبر کی درخواست کر رہا ہو ؛

میں نے پوچھا "کتابوں کے لئے کوئی اور انتظام نہیں ہو سکتا تھا ؟ مثلاً کسی اور قریبی مکان میں ایک کمرہ اُنکے لئے لے لیا جاتا"۔

اس سوال کا مجسّم جواب کرسٹوفرسن کا چہرہ تھا۔ جس نے مجھے اُسکی بے زری پھر سے یاد دلادی۔ کہنے لگا "اب ہم اس پر مزید غور و فکر نہیں کرتے۔ بات کا فیصلہ ہو چکا ہے اور فیصلہ بھی بالکل مکمل"۔

اب ہم نے اس مضمون کو چھوڑ دیا۔ اور اگلے دوراہے پر پہنچ کر علیحدہ ہو گئے ؛

———— ۶ ————

اس روز کے بعد ابھی ہفتہ نہ ہُوا ہو گا۔ کہ مجھے پومفریٹ کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہُوا جس پر اتنا لکھا تھا "آخر ویسا ہُوا جیسا کہ اُمید تھی۔ مسز "ک" سخت بیمار ہے"۔ اور بس ؛

مسز "ک" سے یقیناً مسز کرسٹوفرسن مُراد تھی۔ میں یہ خبر پڑھ کر فکر میں پڑ گیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ اور میرے جذبات اور احساسات میں حرکت سی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُسی روز پچھلے پہر میں پھر اُس دلچسپ گلی کی طرف روانہ ہُوا ؛

کھڑکی پر کوئی نظر نہ آیا۔ ذرا سے توقف کے بعد میں نے پومفریٹ کی چچی کو بلانے کا ارادہ کیا۔ اور اُسی نے آکر دروازہ کھولا۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب میں نے اپنا نام بتایا اور مسز کرسٹوفرسن کے متعلق دریافت کیا تو وہ مجھے ایک نشستگاہ میں لے گئی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی:۔ ہاں مسز کرسٹوفرسن پرسوں سے بیمار ہے۔ مرض بیہوشی کے ایک لمبے دورے سے شروع ہوا۔ رات بخار کی وجہ سے بیخوابی میں گذری۔ اُسی وقت ڈاکٹر بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی اُسے کتابوں سے بھری ہوئی گندی ہوا والی خوابگاہ سے نکلوا کر ایک اور کمرے میں سُلوایا جو حُسنِ اتفاق سے اُس روز خالی پڑا تھا۔ اب تک وہ اُسی کمرے میں لیٹی ہوئی ہے۔ بیچاری بہت کمزور اور درماندہ ہو رہی ہے۔ آواز تک نہیں نکال سکتی۔ گاہے گاہے اپنے خاوند کو دیکھ کر مُسکرا دیتی ہے۔ جو رات دن اُسکے سرہانے بیٹھا رہتا ہے ـــــ وہ خود بھی بہت جلد صاحب فراش ہو جائیگا۔ اب وہ ایک بھوت کی طرح دکھائی دیتا ہے اور نیم مُردہ سا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا:۔ اس بیماری کا باعث کیا ہوگا؟"

اُس عورت نے میری طرف ایک اچنبھے کی نظر سے دیکھا اور سر ہلا کر آہستہ سے بولی" باعث چھپا ہوا تو تھوڑا ہی ہے۔"

میں نے پوچھا" شاید مایوسی کا ہی اثر ہو؟"

کہنے لگی۔ اس میں کیا شک ہے۔ عرصے سے بیچاری کی طاقت زائل ہوتی جا رہی تھی اس صدمے سے رہی سہی طاقت بھی باقی نہ رہی۔"

میں نے کہا:۔ آپکے بھتیجے کے ساتھ بھی یہی تذکرہ ہوتا رہا۔ اُنکا خیال ہے کہ مسٹر کرسٹوفرسن کو اُس ایثار کا کما حقہٗ احساس نہیں ہے۔ جس کے لئے اُس نے اپنی بیوی کو مجبور کر رکھا ہے۔"

بولی:۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر اب اُس نے محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ اب وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتا ـــــــ"

دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز ہوئی۔ اور ایک تیز اور کانپتی ہوئی آواز نے پومفریٹ کی چچی سے اوپر چلنے کی التجا کی۔

وہ پوچھنے لگی" کیا ہے؟"

"سٹوفرسن نے گھبرایا ہوا چہرہ میری طرف کیا۔ اور مجھے پہچان کر حیرت زدہ بھی ہوا۔ مگر میرے ساتھ

بات تک نہ کی اور یہ کہتا ہوا،" کہ اُسکی حالت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ براہ مہربانی جلدی آؤ"۔ مالکۂ مکان کو ساتھ لیکر فوراً اوپر چڑھ گیا ؛

میں اب جا بھی نہ سکتا تھا۔ کوئی دس منٹ تک میں اُسی کمرے میں گھڑی کی ہر آواز پر کان لگائے ہوئے بے چین بیٹھا رہا۔ اِتنے میں سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ ہوئی۔ اور مالکۂ مکان آپہنچی۔ کہنے لگی" کچھ بھی نہیں۔ اگر آرام سے پڑی رہی تو اُمید ہے آج اُسکو نیند بھی آجائے۔ یہ اُسکے پاس بیٹھا ہوا گھڑی گھڑی اُس سے حال پوچھتا رہتا ہے اور اس طرح اُسے دق کئے رکھتا ہے۔ میں نے اب اُسے اپنے کمرے میں چلے جانے کو کہدیا ہے۔ میرا خیال ہے اگر آپ اُسکے پاس چلے جائیں اور اُسے ذرا باتوں میں لگائیں تو اُسکے لئے مفید ثابت ہوگا ؛

میں فوراً دوسری منزل کی نشستگاہ میں پہنچا۔ اور دیکھا کہ کرسٹوفرسن ایک کُرسی پر سر آگے کو جھکائے اُداسی کا مجسمہ بنا بیٹھا ہے۔ جب میں قریب پہنچا تو وہ ذرا لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھا اور نہایت خجالت کے عالم میں اُس نے ذرا جھجک کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مگر آنکھیں اونچی نہ کرسکا ؛

میں نے دلجمعی اور حوصلہ افزائی کے چند لفظ کہے مگر اُنہوں نے اُس پر میری خواہش کے عین متضاد اثر پیدا کیا ؛

درد بھری آواز سے بولا:" بھئی کچھ نہ کہو۔ وہ بچاری قریب المرگ ہے —— بالکل قریب المرگ —— کوئی کچھ کہے۔ میں خوب سمجھتا ہوں ؛

"علاج کرنے والا کوئی اچھا ڈاکٹر ہے ؟"

"ہاں ڈاکٹر تو اچھا ہے۔ مگر علاج اب بعد از وقت ہے۔ بالکل بعد از وقت ہے ؛"

یہ کہکر اُس نے پھر اپنے آپ کو کُرسی پر گرا دیا۔ اور میں بھی قریب چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ ایک دو منٹ کے بعد یکایک دروازے پر کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ کرسٹوفرسن کُرسی پر سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اور نہایت تیزی سے کمرے کے باہر دروازے کی طرف جھپٹا۔ میں اس خوف سے کہ کہیں وہ دیوانہ نہ ہوگیا ہو۔ سیڑھیوں تک اُسکے پیچھے دوڑا۔ مگر اتنے میں وہ پھر پہلے کی طرح اُداسی اور پریشانی کی حالت میں اُوپر آگیا۔ اور کہنے لگا" چِٹھی رساں تھا —— میں ایک خط کے انتظار میں ہوں !!

اُسکی حالت دیکھ کر بات چیت ممکن نظر نہ آتی تھی۔ لہذا میں نے رخصت کی تمہید کے طور

پر ایک دو لفظ کہے۔ مگر کرسٹوفرسن نے مجھے اُٹھنے نہ دیا۔

ـــــــــ :: ۷ :: ـــــــــ

ایک زیر عتاب مجرم کی طرح اُس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ اور کہنے لگا۔ "بھائی میں کیا کہوں۔ جو کچھ میرے امکان میں تھا میں نے کیا۔ جونہی وہ بیمار پڑی اور میں نے دیکھا کہ یہ اُسی مایوسی کا صدمہ ہے تو میں فوراً مسز کیٹنگ کی طرف یہ اطلاع دینے کے لئے دوڑا کہ میں کتابیں فروخت کر دینے کو تیار ہوں۔ مگر وہ کہیں باہر گئی ہُوئی تھی۔ میں نے پھر اُس کی طرف ایک خط لکھا۔ اپنی بیوقوفی پر پشیمانی ظاہر کی۔ اور اسکی خدمت میں عفوِ قصور کی التجا کی۔ اور درخواست کی کہ وہ اپنی موعودہ عنایت سے پھر مشرف فرمائے۔ کافی وقت گذر گیا ہے مگر ابھی تک اُس نے جواب نہیں دیا۔"

اُسکے ہاتھ میں ایک کتبخانے کی فہرست کتب تھی۔ جو ابھی چٹھی رسان نے آکر دی تھی بالکل بیساختہ طور پر اُس نے اوپر لپیٹا ہُوا کاغذ پھاڑا۔ اور پہلے صفحے پر نظر بھی دوڑائی۔ مگر پھر یکایک جیساکہ ضمیر نے اُسکے دل میں چھری ماردی ہو۔ اُس نے فہرست کو زور سے پرے پھینک دیا۔ "موقعہ ہاتھ سے نکل چکا ہے!" کہکر اُس نے کتابوں کے انباروں کے درمیان چھٹے ہُوئے تنگ راستے پر تیزی سے دو چار قدم بھرے۔ "واقعی بچاری نے لندن میں رہنا قبول کیا۔ واقعی اُس نے وہی منظور کیا جو مجھے پسند تھا بھلا کب اُس نے کوئی بات میری مرضی کے خلاف کی ہے؟ میں نہایت ظالم تھا۔ میں نہایت کمینہ تھا جو اُسکو ایسی قربانی کرنے دی۔" اب وہ اپنے بازوؤں کو دیوانوں کی طرح ہلا رہا تھا۔ "کیا میں اُس بچاری کے نقصان کو نہیں سمجھتا تھا؟ کیا میں اُسکے چہرے پر باہر جانے کی اُمید کی خوشی نہیں دیکھتا تھا؟ میں اُسکی مرض کا سبب جانتا تھا۔ اور ٹھیک ٹھیک جانتا تھا۔ افسوس میں نے ایک خود غرض بُزدل کی طرح دیدہ و دانستہ اُس بچاری کو تکلیف میں پڑنے دیا۔ اور اُسے قریب المرگ کر کے مرنے پر مجبور کیا۔ مرنے پر۔۔۔۔"

میں نے کہا۔ "صبر کرو۔ ممکن ہے ابھی مسز کیٹنگ کی طرف سے جواب آجائے۔ اور تمہارے لئے کچھ بہتری کی خبر لائے۔"

"اب بالکل بعد از وقت ہوگا۔ میں نے بچاری کو مار ڈالا ہے۔ وہ مغرور عورت جواب نہیں دیگی۔ وہ بدمزاج اُمراء میں سے ہے۔ اور ہم نے اُسکے جذبۂ محسنی پر ضرب لگائی ہے۔ یہ قصور وہ کبھی معاف نہیں کریگی۔"

دم بھر کے لئے کرسٹوفرسن بیٹھ گیا۔ مگر پھر یکایک اس طرح اُٹھ کھڑا ہُوا گویا کہ اُسکے دل کو سخت روحانی صدمات سے تکلیف ہو رہی ہو +

"وہ بیچاری کی جان لبوں پر ہے" کتابوں کی طرف دیوانہ وار اشارہ کرکے "یہی چیزیں ہیں جنہوں نے اُسکی زندگی برباد کی ہے — میں نے انکے بدلے اُسکی جان بیچ دی ہے! آہ!"

آہ سرد بھر کر اُس نے ہاتھ بڑھایا اور پانچ چھ کتابیں کھسوٹ کر — قبل اس سے کہ مجھے اُس کا ارادہ معلوم ہوجاتا — کھڑکی کی طرف دوڑا اور جھٹ اُنہیں گلی میں پھینک دیا۔ اور اُنکے پیچھے ہی ایک اور گٹھا بھی روانہ کر دیا۔ میں نے زمین پر دھم کی آواز سُنی اور اُٹھ کر کرسٹوفرسن کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اُسے سمجھایا کہ خدارا ذرا اپنے آپ کو سنبھالو اور تحمل سے کام لو +

جھنجلا کر بولا "نہیں نہیں۔ آپ جانے دیں۔ میں انکی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ انہی نے تو میری پیاری بیوی کی زندگی تباہ کی ہے"

یہ الفاظ اُس نے سسکیاں بھرتے ہُوئے کہے۔ اور آخری جُملے کا منہ سے نکلنا تھا کہ آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اب مجھے اُسکو کتابیں پھینکنے سے باز رکھنا آسان ہو گیا۔ اُس نے میری طرف نہایت درد انگیز نظر سے دیکھا۔ اور رو کر کہنے لگا "آپ کو معلوم نہیں کہ وہ میرے لئے کیا کچھ کر رہی ہے۔ جب اُس نے میرے ساتھ شادی کی۔ میں اُس سے بیس سال بڑا اور نہایت خستہ حال تھا۔ مجھ سے اُسے مشقت اور فکر کے سوا کچھ وصول نہیں ہُوا۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔ میں سالہا سال اُسی کی کمائی پر گذارہ کرتا رہا ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ میری کتابوں کے لئے اُس نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اور فاقے کر کر کے رقم بچائی ہے — ہائے میری بیوقوفی۔ مجھے اس بُری عادت نے غلام بنا رکھا تھا۔ عین اُسی طرح جیسے شرابخواری اور قماربازی کی لت پڑ جاتی ہے۔ ہر روز میں اپنے آپکو ملامت کرتا تھا۔ اور اپنی خواہش کے دبانے کی قسم کھاتا تھا — مگر افسوس — میں خواہش کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا — میری بیوی نے مجھے کبھی ملامت نہ کی — کبھی نہیں — نہ لفظ سے نہ آنکھ سے — میں بیکاری کی زندگی بسر کرتا رہا۔ میں نے اُسکو دوکان کی مشقت سے بچانے کی کچھ کوشش نہ کی۔ آپ کو معلوم ہے؟ وہ دوکان پر کام کیا کرتی تھی۔ ایسی سمجھدار۔ قابل اور مہذب عورت اور ایسی محنت مشقت! خیال کیجئے۔ میں ہزار دفعہ اُس دوکان کے سامنے سے گذرتا اور ہاتھ میں کتابیں لٹکائے گھر آتا۔ میری

سنگدلی دیکھئے۔ وہ وہاں کام میں مشغول ہوتی اور میں سینے میں دل رکھتے ہوئے سامنے سے گذر جاتا ——
افسوس! صد افسوس!!

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں کھولنے کے لئے اُٹھا اور دیکھا کہ مالکۂ مکان حیرت زدہ چہرہ بنائے اور ہاتھوں میں کتابیں لئے کھڑی ہے +

میں نے آہستہ سے کہا: "کوئی بات نہیں۔ اتفاق سے گر پڑی تھیں۔ انہیں اندر نہ لائیے یہیں فرش پر رکھ دو +"

کرسٹوفرسن میرے پیچھے کھڑا تھا اور زبان کی بجائے نگاہوں کے ساتھ مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ کوئی بات نہیں۔ اور اطمینان دلا کر اُسے ذرا سکون کی حالت میں پہنچایا۔ خوش قسمتی سے میرے بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر بھی آگیا۔ اور قدرے افاقہ کی خوشخبری سُنائی۔ اُس روز مریضہ کی ذرا آنکھ بھی لگی تھی اور زیادہ نیند آنے کا امکان بھی نظر آتا تھا +

کرسٹوفرسن نے مجھے دوبارہ بہت جلد خبر لینے کی التجا کی۔ اور کہا کہ یہاں آپ کے سوا میری خبرگیری کرنے والا کوئی نہیں۔ میں نے دوسرے ہی دن آنے کا وعدہ کیا +

———— ۸ ————

دوسرے دن میں دن ڈھلتے ہی چل پڑا۔ کرسٹوفرسن یقیناً میرے انتظار میں تھا۔ زنجیر کھٹکھٹانے سے پہلے دروازہ کھولدیا گیا۔ اور کرسٹوفرسن نے ایسے بشاش چہرے کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا کہ میں حیران رہ گیا میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر بولا "خط آگیا ہے۔ مکان کی اجازت مل گئی ہے +"

"مگر مسز کرسٹوفرسن کا کیا حال ہے؟"

"خدا کا شکر ہے۔ اب حالت بہت اچھی ہوگئی ہے۔ کل جس وقت آپ تشریف لے گئے تھے۔ اُسوقت سے لیکر آج صبح تک اُسکو نیند آتی رہی ہے —— خط آج پہلی ڈاک میں آیا۔ میں نے اُسے بھی سُنایا —— مگر سچی سچی بات اُسے نہیں بتائی۔ اُس نے خیال کیا کہ کتابیں ساتھ لے جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ اُس وقت آپ اُسکی مُسکراہٹ دیکھتے —— مگر اُسکو خبر ہونے بغیر یہ سب فروخت کر دی جائینگی۔ اگر بعد میں اُس کو معلوم ہو بھی گیا تو کچھ پروا نہیں +

کرسٹوفرسن نچلی منزل کی بیٹھک میں داخل ہوا اور اپنے ایثار کے احساس سے اِدھر اُدھر خوشی خوشی

چلنے لگا۔ ایک کتب فروش کی طرف ساری کی ساری لائبریری خرید لینے کے لئے خط لکھدیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا چند ایک کتابیں بھی نہیں بچا رکھو گے؟" یقیناً کتابوں کی ایک دو الماریاں باقی رکھنا چنداں قابل اعتراض نہ تھا۔ اور ساتھ ہی وہ کتابوں کے بالکل بغیر کیونکر رہ سکتا تھا؟ پہلے تو اُس نے بڑے زور کے ساتھ کہا کہ ایک کتاب بھی باقی نہیں رکھی جائیگی۔ اور مرتے دم تک وہ کبھی کسی کتاب کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کریگا۔ مگر میں نے رائے دی "کہ مسز کرسٹوفرسن کا بھی خیال کرونا۔ کیا اُسکے لئے گاہے بگاہے کچھ مطالعہ باعثِ تفریح نہ ہوگا؟" یہ سُن کر وہ ذرا سوچ میں پڑگیا۔ ہم نے اس معاملے پر بحث کی اور آخرکار یہ قرار پایا کہ کتابوں کا بھی ایک صندوق باقی اسباب کے ساتھ نارفوک لے جانا چاہیئے۔ مسز کیٹنگ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور میں نے اُسے یقین دلایا کہ اتنی کتابوں کے لئے اُسکی اجازت ہی اجازت تصوّر کرنی چاہیئے ؞

اور ایسا ہی کیا گیا۔ نہایت خوش انتظامی کے کتابوں کے گٹھے بوریوں میں بھر کر نیچے بھیجے گئے اور گاڑی میں لاد کر روانہ کر دئے گئے۔ یہ سب کچھ اس خموشی کے ساتھ کیا گیا کہ مریضہ کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی ؞

آج کرسٹوفرسن کبھی کبھی اس طرح سے ہنستا کہ میں نے اُسے پہلے کبھی اس طرح ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ وہ کمرے کے اُس حصے پر نظر کرنے سے عمداً گریز کررہا تھا جہاں کہ کتابیں پڑی رہا کرتی تھیں۔ اور اثنائے کلام میں وہ کبھی کبھی سر جھکا کر کسی سوچ میں بھی پڑ جاتا تھا۔ بیوی کی صحت کی جو خوشی اسکو محسوس ہو رہی تھی۔ اُس میں ذرہ بھر شک نہیں البتہ جو نازک وقت اُس پر گذر چکا تھا۔ اُسکے باعث سے اُسکا چہرہ ذرا زیادہ معمّرانہ ہو گیا تھا۔ اور جب وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتا تو اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور اُسکا سر بوڑھوں کی طرح لرز جاتا ؞

لندن سے اُنکے چلے جانے سے پیشتر میں نے مسز کرسٹوفرسن کو دیکھا۔ ایک زرد رو۔ دُبلی پتلی سی عورت تھی۔ جو خوبصورت غالباً کبھی نہ رہ چکی ہوگی۔ لیکن اُسکا چہرہ (اگر چہروں میں اس اظہار کی قابلیت ہے تو) ایک دلیر اور وفادار روح ظاہر کرتا تھا۔ وہ نہ خوش تھی اور نہ غمگین۔ لیکن میں نے جو بار بار اُسکے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو مجھے اُس پر ایسی کامل شکرگذاری کی جھلک نظر آئی کہ گویا قسمت نے اُسکی سب دلی مرادیں پوری کر دی تھیں ؞

(جارج گسنگ) مترجمہ۔ محمد آسد خان۔ بی۔ اے۔ از ملتان

---

# جاٹ

(سید مقبول احمد الہ آبادی - بی۔ اے)

پنجاب اور شمالی ہندوستان میں بالفعل جاٹ فرقوں کی آبادی حسب ذیل ہے۔

| | مسلمان | ہندو و سکھ |
|---|---|---|
| بلوچستان و صوبہ سرحدی | ۱۴۰،۰۰۰ | — |
| پنجاب کشمیر و راجپوتانہ | ۲،۵۸۰،۲۶۷ | ۹،۷۹۲،۹۲۳ |
| سندھ بمبی وغیرہ | ۹۰،۷۱۳ | — |
| صوبہ متحدہ | ۳،۴۲،۴۰۰ | ۷۹۰،۸۷۸ |
| | ۳،۱۵۳،۳۸۰ | ۳،۵۸۳،۸۰۱ |
| جملہ | | ۱۳،۷۳۷،۱۸۱ |

جاٹ لوگ عموماً کاشتکار ہیں اور پنجاب اور شمالی ہندوستان میں انکے متعلق جو کچھ ضرب المثلیں ہیں وہ انکی ابلہیت - جوتہور - خودغرضی - لالچ - زیادہ خوراکی اور بے شعوری پر دال - یہ مجھکو معلوم نہیں کہ ہندوؤں نے اپنی طویل فہرست ذات میں جاٹوں کو کہاں جگہ دی ہے - وہ یقیناً برہمن اور چھتری کے برابر نہیں اور نہ چمار اور پالسی کے - بنئے اور جاٹ کا پیشہ غالباً ایک درجے کے لوگ ہونگے - جن میں سے ایک دوکاندار دوسرا کاشتکار اور تیسرا کاتب کا قومی پیشہ رکھنے والا ہے - مگر ہندوؤں میں پیشہ ہاتھ سے کام کرنے والا شخص ذلیل ذاتوں میں شمار کیا جاتا ہے - اور اس لئے کاشتکار کی بھی وہی حیثیت ہونا چاہیئے جو کپڑا بننے والے کپڑا سینے والے لکڑی کا کام کرنے والے - مٹی کا برتن بنانے والے اور چمڑے کا کام کرنے والے لوگوں میں تھا - مگر آخرالذکر پیشے کے لوگ جلاہے - درزی - بڑھئی - کمہار - چمار - نیچ ذات کے لوگ ہیں - تو کوئی وجہ نہیں کہ جاٹ کو ان سے بلند مرتبہ دیا جائے - لہذا جاٹ کا شمار بھی اہیر و گڈریوں کے ساتھ ہونا چاہیئے - جو کاشتکار اور گلے پالنے والے ہیں اور چھوٹی ذات کے لوگ کہلاتے ہیں - تو ہندوستان کے عام قاعدے کے مطابق شریف ذات والے وہی ہوئے جو اپنے ہاتھ سے کام نہ کرتے ہوں اور نیچ ذات کے لوگ جو اپنے ہاتھ سے کام کرنے والے - لیکن غریب جاٹ کی مٹی ہندوستان اور دھرم شاستر نے خراب کی ہے ورنہ یہ قوم دنیا کی ایک نہایت

عظیم الشان۔ تاریخی اور وسیع قوم ہے اور انکے ہم پلہ عرب۔ ترک۔ رومی اور یونانی ہیں۔ اگر جاٹ کو ہندو مذہب نے نہ ڈبویا ہوتا اور وہ سب کے سب مسلمان ہوتے تو اگرچہ انکی بعض خصوصیتوں کی وجہ سے جو اوپر بیان کیگئی ہیں وہ دوسری قوموں کے لئے خندہ زن ہوتے مگر کبھی اس درجہ پر نہ گھٹتے جس درجہ پر وہ اب ہیں +

جاٹ قوم کی قدامت | جاٹ کا سب سے پہلے ذکر ہیروڈٹس نے اپنی تاریخ میں گیٹی ( ) کی لفظ سے کیا ہے اور یہ گیٹی ہندوستان کے رہنے والے نہ تھے۔ انکا تعلق سیتھین اور ہن قوم سے تھا اور انکا اماجگاہ ہندوکش اور کوہ سلیمان کے درمیان کا خطہ تھا۔ حضرت مسیح سے چارسو برس کے بعد ان جاٹوں نے شمالی ہندوستان کو فتح کیا۔ کشن قوم سے گندھارا (قندھار) لیا۔ اور ایک سلطنت قائم کی اور انکے دو مشہور بادشاہ جنکا تاریخی پتا چلتا ہے توراس اور مہرگل تھے۔ مہرگل نے اپنے زمانے میں کشمیر بھی فتح کرلیا تھا مگر آخر کار مالوہ اور مگدہ کے ہندو بادشاہوں کے مقابلے میں مغلوب ہوکر اپنی سلطنت کو کھو بیٹھا۔ پھر جاٹ کی ایک شاخ یوروپ پہنچی۔ اور اس نے رومن سلطنت کو تباہ کیا اور اسپین اور جرمنی میں اپنی سلطنت قایم کی۔ یوروپ میں رومن ان جاٹوں کو گاتھ اور عرب (غات) کہتے ہیں +

آخر میں ایک ان جاٹوں پر اسپین میں عرب اور جرمنی میں شمالی المانی قوم غالب آئی۔ مہرگل توراس کے ہندوستان میں اور گاتھ قوم کے یوروپ میں کارنامے ہیں۔ ان سب پر موجودہ جاٹ کو فخر کرنا چاہیئے کہ انہیں کے اباواجداد تھے۔ مغربی ایشیا میں جاٹ غالباً خانمانہ حیثیت سے نہیں پھیلے۔ مگر ان کی قوم افغانستان۔ ایران۔ کردستان و عراق میں ایک ممتاز پایہ رکھتی تھی۔ مگر چونکہ ان ممالک میں ذات کی تقسیم نہ تھی وہ بہت جلد دوسری قوموں میں غایت اور گھل مل گئے۔ قدیم زمانے میں افغانستان کے لوگ پارتھن کہلاتے تھے اور اسی پارتھن کی موجودہ شکل پٹھان ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ پٹھانوں نے اپنے فتوحات کے زمانے میں افغانستان کے جاٹ پر غالب آئے اور دونوں سے مل کر موجودہ افغان یہی ہے +

جاٹ نے اپنی علیحدہ قومیت کو ہندوستان میں ذات کی وجہ سے قائم رکھی ہے۔ ورنہ جب ایک قوم تمدن اختیار کرلیتی ہے تو اس میں نسلی امتیاز مٹنا شروع ہوجاتا ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ وہ اپنے اس پاس کے لوگوں سے مل کر اپنی جداجنسیت کو بالکل بھلا دیتے ہیں ہندوستان میں بھی یہ صورت پیدا ہوتی مگر یہاں منوجی کا قانون ایسا سخت تھا۔ اس نے باوجود تمدن و زراعت کو انکی جنسیت کو بحال رکھا۔ افغانستان میں بھی انکی زندگی نہ تھی اور چونکہ وہاں منو کا قانون رائج نہ تھا وہ پارتھن

(پٹھان) قوم میں جذب ہو گئے۔ ایران میں بعض جگہ انکو خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کرنی پڑی اور وہاں وہ اپنی جاٹ کی حیثیت سے باقی ہیں۔ مگر جہاں زراعت وتجارت اختیار کی اور وہ جانبیت سے باہر ہو گئے۔ مگر باوجود اسکے بھی یہ نام عرصے تک ایران میں باقی رہا۔ یہی حال عراق میں ہوُا وہاں جاٹ "زط" کہلاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی زراعت اور تمدن نے انکی قومی حیثیت کو مٹا دیا۔ اور قیاس یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ بھی "زط" قوم سے تھے۔ انکا اصلی نام نعمان بن زوطی" تھا۔ زوطی کا لفظ زط سے بنا ہے۔ اور اس میں یائے نسبتی ہے بن کا لفظ یا تو زاید ہے یا غلطی اور ناسمجھی سے بڑھا دیا گیا ہے۔ اصل میں انکا نام "نعمان زوطی" بنا ہے۔

جاٹ کردستان میں | کردستان کی زیادہ آبادی عموماً خانہ بدوش ہے۔ اور یہاں جاٹ اپنی حیثیت سے باقی ہیں۔ جنوبی کردستان میں سرحد ایران پر ایک بڑا زبردست کردی قبیلہ ہے جو "جاف" کہلاتا ہے۔

راقم الحروف کا تعلق جاف قبیلہ کی پولیٹکل ڈپارٹمنٹ سے کچھ عرصے تک رہا ہے۔ ابتک ان جاف قبیلہ کے لوگوں کا حلیہ جاٹ لوگوں (خصوصاً پنجاب کے لوگوں سے جو صورت وشکل میں اچھے ہوتے ہیں) سے اس قدر ملتا ہے کہ جب پہلے پہل رؤسا، وبیگزادہ جادہ سے میرا تعارف ہوُا تو میں نے انکی یہ مشابہت دیکھ کر تعجب سے پوچھا کہ کیا وہ لوگ ہندوستان سے اکثر آباد ہوتے ہی اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہوئی کہ میری مرحوم بیوی کرند ایران کے جادہ قبیلہ کی تھیں۔ وہاں کی عورتیں عام کردوں کی وضع کے خلاف اونچا لنگا پہنتی ہیں۔ اُنکا حلیہ جاٹنیوں سے اس قدر مشابہ تھا کہ بصرہ میں مجھ سے میرٹھ کے تند جاٹ سپاہیوں نے حیرت سے پوچھا کہ میں جاٹ ہوں۔ میں نے کہا نہیں۔ تو کہا پھر یہ جاٹنی کہاں سے کر لی۔ میں نے کہا میرٹھ کے جاٹ کو بھی کبھی ایسے صاف رنگ کا دیکھا ہے۔ خیر۔

کردوں کا قومی ناچ | کردوں میں شادی کے موقع پر ایک ناچ ہوتا ہے جسکو انکی زبان میں "ہرپھرکا" کہتے ہیں جو غالباً یہ ٹھیٹھ ہندی جاٹی لفظ ہے (یعنی سر پھر کر آنا) تو یہ ناچ اس طرح ہوتا ہے کہ مرد عورتیں (جادہ قبیلہ بلکہ عموماً کردوں میں پردہ نہیں ہوتا) ہاتھ میں ہاتھ باندھ کر ایک حلقہ بناتے ہیں بیچ میں ایک شخص سارنگی یا بانسری بجاتا ہے اور اسکی آواز پر یہ حلقہ گردش کرتا ہوُا اپنے پیر کو زمین پر مارتا ہے۔ ہندوستان کے مُسلمان جاٹوں میں تو میں نے یہ ناچ نہیں دیکھا مگر ہندو جاٹوں میں بالکل اس طرح کا ناچ ہوتا ہے اور خصوصاً یہ شادی کے زمانے میں بیچ میں بجائے سارنگی بجانے والے کے چراغ ہوتا ہے۔ ایک جاٹ کی مثل بھی پنجابی میں ہے اردو ترجمہ یہ ہے۔ "آؤ میری لڑکی ہاتھ میں ہاتھ دیکر شادی کے دیا کے گرد ناچیں۔ اگر یہ شوہر مرا تو کچھ

پروا نہیں اور بھی ہیں۔"

جادہ قبیلہ کے اُردو الفاظ | اگرچہ یہ ناچ اب تمام کردوں کا قومی ناچ ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس ناچ کو سب سے پہلے جاٹوں نے کردستان میں رواج دیا ہے۔

جادہ والے بھی کرانجی زبان میں جو کردی کی جنوبی شاخ ہے گفتگو کرتے ہیں مگر اس میں بعض لفظ ایسے ہیں جو اور کردوں میں نہیں بلکہ وہ زیادہ تر ہندوستانی زبان سے ملتے ہیں۔ مثلاً

جادہ میں عورتوں کے نام میں نے "شاما" سُنا ہے۔ سمت کو بتانے کے لئے وہ "اورے" "پرے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگ کو اگری کہتے ہیں۔ جاجم کو جاجم۔ لفظ "ہے" (یعنی است فارسی کو) ہیا۔

اسی طرح اور بہت سے الفاظ ہیں جواب میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ لڑکی کو کنشکا جو کنیا سے زیادہ ملتا اور کردوں کی اصلاح میں لڑکی کے لئے کچک ہے (جو شاید ترکی لفظ قزی کا بگاڑ ہوا ہے) لڑکے کو کورہ جو ہمارے ہندوستان کا "کنور" ہے۔ مگر یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ جاٹ تو خود ہندوستانی قوم نہ تھی پھر یہ ہندوستانی جاٹ کے لفظوں کی مشابہت کیا معنی۔ اگر جاٹ کردستان میں آئے ہونگے تو افغانستان اور ایران سے مگر میرا خیال ہے کہ یہ قبیلہ جادہ کا ہندوستان سے آیا ہے۔ جب عربوں نے سندھ فتح کیا تو بہت سے جاٹ عراق کو منتقل کر دئے گئے تھے۔ اور یہ جاٹ عربوں سے علیحدہ بستی میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے قلعے بھی تعمیر کر لئے تھے۔ اور ان قلعوں کو وہ کوٹ کہتے تھے۔ اسی کوٹ سے عرب کا لفظ "کوت" نکلا ہے تم نے کوت العمارہ اور کوت الحسنی کا نام سُنا ہوگا۔ تو یہی پرانے جاٹوں کے قلعے تھے۔ خلفائے بنی عباس کے انحطاط کے وقت انہوں نے طاقت پکڑ لی۔ اور جب انہوں نے حکومت کو بہت تنگ کیا تو وہ عراق سے خانقین (ایک مقام ہے سرحد ایران اور جنوبی کردستان کا پہلا قصبہ ہے) کو منتقل کر دئے گئے اور اس وقت بھی جادہ کا آماجگاہ خانقین کے قریب ہے۔

جادہ قبیلہ کردستان میں بہت معزز قبیلہ سمجھا جاتا ہے اور اہل جادہ کو اس بات پر فخر ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوب انہیں کے قبیلے ہی سے تھا۔ جادہ اس قدر مغرور ہیں کہ وہ اپنی بیٹی کبھی کسی غیر قبیلے کو دیتے۔ اس وقت یہ دس ہزار سوار فراہم کر سکتے ہیں۔ ان کا موجودہ رئیس عثمان پاشا جادہ ہے۔ جو میرے سامنے پچاسی برس کا تھا۔ مگر اسی زمانے میں اس نے دوسری شادی کی تھی اور اس سے دو اولاد تھی۔ جادہ نے بغاوت کردستان میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ انہیں محمود پاشا کی بھابھی عادلہ خانم

جا وہ تھیں جنہوں نے بغاوت کردستان میں مجھ کو اور ہندوستانی سپاہیوں کو اپنی حفاظت میں لیا تھا اور میری طرف سے تمام کردوں کے خلاف سینہ سپر تھیں۔ یہ نہایت جوانمرد تعلیمیافتہ اور دلیر عورت ہے۔ میں جوانی میں بڑی حسین تھیں مگر بوڑھی ہیں۔ انگریزی حکومت نے انکو خان بہادر کا خطاب دیا ہے +

پس ایک جاٹ وہ تھے جن میں مہر گل نعمان اللہ۔ صلاح الدین اور عادلہ خانم ہوئے ہیں اور ایک ہندوستان کے جاٹ جنہوں نے ہندو مذہب کے ساتھ اپنا پورا دفتر پارینہ میں غرق کر دیا۔ اور اب ایک مسلمان جاٹ اپنے کو جاٹ کہلاتا ہوا شرماتا ہے۔ کیا یہ ہندو مذہب کی برکت ہے۔ یا ہندوستان کی آب و ہوا

---

# غزل

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
اُمید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے

تاکیدِ صبر ٹھیک۔ اگر تابِ صبر ہو
تعمیلِ حکم فرض مگر کوئی کیا کرے

ایکاش اضطرابِ محبت بنا رہے
ایکاش دردِ حقِ رفاقت ادا کرے

تکرارِ لن ترانیِ پیہم روا نہ رکھ
ایسا نہ ہو کہ شوق تماشا گلا کرے

کیا فائدہ۔ کہ شکوۂ جور و جفا کروں
کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے

اب میں ہوں اور نتائجِ غفلت کا انتظار
اب آپکی نگاہِ کرم جل دیا کرے

شاید تمہیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
تجھ سے دغا کرے تو خدا اسے دغا کرے

میں اور انحراف؟ مگر بد نصیب دل
میرا کہا کرے نہ تمہارا کہا کرے

چل دل سے اے شکایتِ بیدادِ دوست چل
کبتک کوئی کسی کی مروت کیا کرے

اب انتہائے یاس کا اُمیدوار ہوں
[illegible] بدیہی علاج کوئی فایدہ کرے

درویش کی پرکھ ہے تو درویش کی سنو
درویش کی صدا ہے کہ داتا بھلا کرے

آزاد! حکمِ خوفِ جزا امرِ حق سہی
تاہم تری بلا غمِ روزِ جزا کرے

آزاد انصاری

---

# بیوہ

پُر اثر ہے یہ طلسمِ آب و گِل
اِک پری وش نازنین ہے مضمحل

گردِ حسرت سے اٹے ہیں خط و خال
غمزدہ چہرے سے ظاہر ہے ملال

وہ کہاں اور عیش کی گھڑیاں کہاں
دیکھتی ہے حسرتوں سے آسماں

ہے لبِ حسرت پہ نالہ دلخراش
سامنے موجود ہے شوہر کی لاش

ہے قیامت یہ ستم، ایسا ستم
چشم پُرنم سے ہیں جاری اشکِ غم

یاس سے کیفیتِ غم ہے عیاں
قطرۂ ہر اشک ہے اک داستاں

دل سے لب تک یک بیک آتی ہے آہ
تیر بن کر دل میں چُبھ جاتی ہے آہ

مرنے والے سے ہے بدتر حالِ زار
سینے میں دم گھٹ رہا ہے بار بار

رنج سے، بیتاب اُس کی جان ہے
کیا کرے اس فکر میں حیران ہے

۲

تھی سپیدیٔ سحر جس کا کفن
نذرِ آتش ہے اُسی کا تن بدن

پھونکنے کو ہے چتا شوہر کی لاش
آگ میں ہے غم رُبا شوہر کی لاش

غور سے سُن عالمِ اُلفت کا راز
اے جوانِ دل رُبا اے پاکباز

رازِ الفت سے نہ تو بیگانہ ہو
شمع پر غش صورتِ پروانہ ہو

کوچۂ اُلفت میں ہے مرنے کا شوق
ہے ازل سے سوختہ جانی کا ذوق

ثاقب کانپوری

# محفلِ ادب

روز و شب آتی ہے ان کانوں میں اک شیریں صدا
کون اس پردے میں ہے کُھلتا نہیں یہ ماجرا
جس طرف بھی جاؤں، پاتا ہوں ہوا میں سوز و ساز
کرتی ہے میرا تعاقب اک صدائے دِلنواز
جو سکوتِ شب میں ہو جاتی ہے اِتنی دردناک
فرطِ غم سے ہونے لگتا ہے مرا دل چاک چاک
اِس صدا سے جھلملاتی ہے میری قندیلِ ہوش
جس کے لہجے میں تلاطم خیز لا محدود جوش
اس طرح آتی ہے یہ آواز مجھ تک بار بار
زلزلے میں جیسے گھبرا جائے کوئی شہسوار
ہر صدا سینے پہ میرے سنگِ غم رکھتی ہوئی
کانپتی آتی ہے اشکوں پر قدم رکھتی ہوئی
درد سا اک دِل میں اُٹھتا ہے نئے انداز کا
مجھ پہ گو کھلتا نہیں مفہوم اِس آواز کا
گفتگو کرتی ہے مجھ سے کوئی پابندِ حیا
اُس زباں میں جس زباں سے میں نہیں کچھ آشنا
پھر بھی بے مفہوم سمجھے رنگ ہو جاتا ہے زرد
دِل ہلا دیتا ہے لفظوں کا عُمق، لہجے کا درد
میری فطرت میں جگا دیتا ہے احساسِ نیاز
نرم جُملوں کا تناسب گرم فقروں کا گداز
گو صدائیں دینے والی سامنے آتی نہیں
پھر بھی میرے پاس سے ہٹ کر کہیں جاتی نہیں
وہ اک ایسی روح کی صورت جو بھولی ہو وطن
روز و شب رہتی ہے میرے فرق پہ سایہ فگن

قرب کے احساس سے بڑھتی ہے حیرانی مری
اکثر اس کی سانس چھو جاتی ہے پیشانی مری

(ستارہ)

---

خفتگانِ خوابِ اجل، پر مجھے رشک آتا ہے کہ کیسی گہری نیند سو رہے ہیں۔ ہم نے گو دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں مگر نیند کہاں؟ آنکھیں بند کر لینا اور ہے اور نیند میں سو جانا اور ہے۔

زیادہ تکان میں انسان کو نیند جلدی آ جاتی ہے۔ جب مجھے نیند نہیں آتی تو جلدی جلدی ٹہلنے لگتا ہوں کہ تھک کر پڑ رہوں۔ دل تڑپتے تڑپتے تھک جائے تو نیند جلدی آنی چاہیئے۔ گو یہ نیند خوابِ اجل ہی کی کیوں نہ ہو۔ اے دلِ بے قرار! تو بہت تڑپ چکا۔ اب سو جا۔ دُنیا اس لائق نہیں جس کے لئے

رات دن آہیں کھینچی جائیں ایک آہ سرد اور پھر خاتمہ۔ یہی ایک سہارا تیری قسمت میں ہے۔

(صلائے عام)

---

کسی شوخ کے لب پہ تبسم ہے کوئی اپنی جان کو کھوتا ہے کہیں ٹوٹ کے بجلی گرتی ہے کہیں پھوٹ کے بادل روتا ہے
ہر پھول سحر کو اٹھ اٹھ کر کہیں شبنم سے منہ دھوتا ہے کہیں سبز دوپٹہ منہ پر تانے سبزہ باغ میں سوتا ہے
کچھ تو ہی بتا اے دیدۂ تر برسات میں یہ کیا ہوتا ہے

کہیں اپنے اُلجھے بالوں میں پھر سُنبل شانہ کرتی ہے رسوائی کا اپنی نکہتِ گل الزام صبا پر دھرتی ہے
آمد ہے چمن میں ساقی کی، پیمانے نرگس بھرتی ہے بوسے لبِ ساغر کے لیکر کیا سوسن صاف مکرتی ہے
کچھ تو ہی بتا اے جوش نظر برسات میں یہ کیا ہوتا ہے

کس کے یہ جگر میں تیر چبھے کس کا یہ لہو ہے لالوں میں یہ سُرخ شرابیں کس کی خاطر کس نے بھری ہیں پیالوں میں
یہ سُرخ سفید اور کالے بادل لائے ہیں کیا رومالوں میں کس گل پہ نچھاور کرتے ہیں، یہ موتی بھر بھر تھالوں میں
کچھ تم ہی کہو اے لعل و گہر برسات میں یہ کیا ہوتا ہے

کیا زور ہیں ندی نالوں کے۔ کیا شور ہیں جنگل والوں کے یہ کیسے کنارِ آبِ رواں جمگھٹ ہیں چھاگل والوں کے
چھلکی وہ گگریا ہاتھوں میں۔ پھسلے وہ قدم جل والوں کے اُف کھل گئے عینِ مستی میں وہ شانے آنچل والوں کے
کچھ تو ہی بتا اے رنگِ سحر برسات میں یہ کیا ہوتا ہے

یہ ہلکی ہلکی بوندیں کیا موتی ہیں سُنہری بالوں میں کیا رنگِ شفق کی لالی ہے اُن گورے گورے گالوں میں
مستی ہے غضب کی آنکھوں میں فتنے ہیں بلا کے چالوں میں سنتے ہیں عطا بھی واعظ بن کر آئے ہیں ان متوالوں میں
کچھ تو ہی بتا اے ذوقِ نظر برسات میں یہ کیا ہوتا ہے

(نو بہار)

---

# نئی کتابیں

**راجہ مور** مصنفہ شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر مدارس قسمت ملتان۔ لالہ گلاب چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب انارکلی لاہور نے اسے شائع کیا ہے۔ اُردو زبان میں بچوں کیلئے جو لٹریچر اب تک شائع ہُوا ہے درحقیقت اس میں بچوں کے فطری میلان کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، یوں پڑھنے کو وہ استاد کے ڈر سے پڑھ ہی لیتے ہیں لیکن اُنکا علمی شوق تقریباً مُردہ ہوجاتا ہے، پھر اس لٹریچر میں بچوں کیلئے معلومات کا ذخیرہ اور انہیں ایک شہری بنانیکے سامان نہ ہونیکی برابر ہوتے ہیں۔ شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور بچوں کی فطرت کے عمیق مطالعہ کے بعد جو سلسلۂ تصانیف شروع کیا ہے وہ یقیناً اُردو میں اچھوتا اور بالکل نیا ہے۔ اُنکے قلم کی حیرت زا روانی نے دو ہی تین سال میں بچوں کیلئے دلچسپ تصانیف کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے " راجہ مور" بھی اُسی سلسلے کی ایک کتاب ہے۔ بھائی بہنوں کی بیان کی ہُوئی اوقات فرصت کی دلچسپ کہانیاں ہیں، زبان نہایت شیریں اور سلیس، پیرایۂ بیان حد درجہ مرغوب، کہنے کو تو پرندوں کی کہانیاں ہیں لیکن بچے اُنہیں پڑھ کر سائنس، ہیأت تاریخ، جغرافیہ، نوشت وخواند کے طریقے کچہری، ڈاکخانہ، بینک، اور موجودہ ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بیشمار معلومات کا ذخیرہ بلا ارادہ اپنے دماغوں میں جمع کر لینگے۔ یہی معلومات وہ اپنے مروجہ نصاب کے ذریعہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے ایک تو اس وجہ سے کہ مروجہ نصاب ہی معلومات سے تہی داماں ہے دوسرے اُس میں جو کچھ ذخیرہ ہے بھی وہ تعزیرات ہند کی طرح خشک اور غیر دلچسپ ہے شیخ صاحب موصوف بچوں کی پژمردہ طبیعت میں طریقۂ تعلیم کا پامال کیا ہُوا ذوقِ ظرافت پیدا کرنیکے ساعی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف مہذب ظرافت سے لبریز ہیں، انہیں پڑھ کر بچے خود بخود تعلیم کی طرف مائل ہو جائینگے، راجہ مور ۲۴۴ صفحات کی کتاب ہے۔ جس میں چار رنگین تصاویر کے علاوہ بہت سی سادہ تصویریں ہیں آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ ہے۔ لالہ گلاب چند کپور تاجر کتب انارکلی لاہور سے طلب کیجائے۔ قیمت بارہ آنہ

**ریاست** ـ ۲۸ صفحات پر شائع ہونیوالا ہفتہ وار اخبار زیر ادارت سردار دیوان سنگھ مفتون دہلی سے شائع ہوتا ہے، ہندوستانی ریاستوں کی اصلاح اور بیرونی حملوں سے انکی حفاظت اسکا نصب العین ہے ہر ہفتے دلچسپیوں کا البم بنکر نکلتا ہے، ہر نمبر میں والیان ریاست میں سے کسی مشہور راجہ یا نواب کی دیدہ زیب تصویر ہوتی ہے، اظہار رائے میں بیباک، قوم پرستانہ خیالات کا پرچارک ہے کاغذ، لکھائی چھپائی اردو کے بہترین رسالوں کا مقابلہ کرتی ہے، ہفتہ وار اخباروں میں اس سے بہتر سوائے بھارت میں شاید دوسرا کوئی اخبار نہیں۔ دفتر اخبار ریاست دہلی سے طلب کیجئے